سُنّت وبدعت اور رسم ورواج

مُفتی محمّد تقی عُثمانی

مواعظِ عثمانی

سُنّت و بدعت اور رسم و رواج

مُفتی مُحمّد تقی عُثمانی

(Quranic Studies Publishers)
Karachi, Pakistan.

عرضِ ناشر: الحمد للہ اگرچہ مکتبہ معارف القرآن کراچی نے "مواعظِ عثمانی" کی تصحیح وطباعت میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا ہے، لیکن کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد سازی میں سہواً غلطی ہو جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

باہتمام : خضر قاسمی

طبع جدید : ذوالحجہ ۱۴۴۳ھ - جولائی ۲۰۲۲ء

ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی

ترتیب و ڈیزائننگ : عمران خان

فون : (92-21) 35031565, 35123130

ای میل : info@mmqpk.com

ویب سائٹ : www.mmqpk.com

www.maktabamaarifulquran.com

آن لائن : fb/onlinesharia

ملنے کے پتے

- مکتبہ دار العلوم، کراچی
- دار الاشاعت، کراچی
- بیت القرآن، کراچی
- مکتبۃ القرآن، کراچی
- بیت الکتب، کراچی
- ادارۂ اسلامیات، کراچی / لاہور
- مکتبہ عمر فاروق، کراچی
- فخر الدین کانچ والا، کراچی
- مکتبہ اصلاح وتبلیغ، حیدر آباد
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان
- مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- مکتبہ بیت العلوم، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
- الفلاح پبلیشرز، لاہور
- اسلامی کتاب گھر، فیصل آباد
- مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد
- مکتبہ صفدریہ، راولپنڈی
- اسلامی کتاب گھر، راولپنڈی
- مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی
- مسٹر بکس، اسلام آباد
- دار السلام، اسلام آباد
- مکتبہ رشیدیہ، راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
- دار الاخلاص، پشاور
- مکتبہ احیاء العلوم، کرک
- مکتبہ عباسیہ، تیمر گرہ
- مکتبہ احرار، مردان
- قرآن مجید محل، مردان

پیشِ لفظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله وأصحابه أجمعين، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہٗ نے بندے کو دارالعلوم ۱۹۵۹ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد ہی سے جمعہ کی تقریر کرنے پر مقرر فرمادیا تھا، شروع میں اپنے لسبیلہ ہاؤس والے گھر کے قریب عزیزی مسجد میں کئی سال جمعہ کی تقریر کرتا رہا، پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کے بعد جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس میں سالہا سال جمعے کی تقریر کی نوبت آتی رہی۔ ۱۹۹۹ء میں میرے استاد گرامی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی جو جامع مسجد بیت المکرم میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور ان کی تعلیمات کا فیض دور تک پھیلا ہوا تھا، اس موقع پر مجھے جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس سے بیت المکرم منتقل کیا گیا اور وہاں ۱۹۹۹ء سے ۲۰۲۰ء تک جمعہ کی تقریر کا سلسلہ رہا۔

میرے شیخ مکرم حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی صاحب قدس اللہ سرہ کی

وفات کے بعد میرے استاذ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر میں نے لسبیلہ ہاؤس کی جامع مسجد نعمان میں اور پھر بیت المکرم میں اتوار کے دن عصر کے بعد ایک اصلاحی مجلس کا سلسلہ شروع کیا، اس وقت میری تقریریں محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور نہ میں انہیں اس قابل سمجھتا تھا کہ انہیں شائع کیا جائے، لیکن میرے انتہائی مشفق دوست حضرت پروفیسر شمیم احمد صاحب (جو اس وقت "معارف القرآن" کا انگریزی ترجمہ کر رہے تھے) نے میرے معاون مولانا عبداللہ میمن صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان تقریروں کو ریکارڈ کر کے قلمبند کر لیا کریں، چنانچہ انہی کی تحریک پر ان اصلاحی بیانات اور کسی قدر جمعے کے خطبوں پر مشتمل ایک طویل سلسلہ "اصلاحی خطبات" کے نام سے منظرِ عام پر آ گیا جس کی اب غالباً ۲۵ جلدیں ہو چکی ہیں۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ بفضلہٖ تعالیٰ ان کی اشاعت مفید ہوئی اور حضراتِ ائمہ وخطباء بھی اپنی تقاریر میں ان سے مدد لینے لگے اور عام مسلمانوں کو بھی عام فہم انداز میں دین کی بنیادی معلومات آسانی سے پہنچنے لگیں، اس کے علاوہ بندہ کو مختلف مواقع پر کراچی یا کسی اور شہر میں، بلکہ کسی اور ملک میں بھی اس طرح کی تقریروں کا موقع ملتا رہا اور متعدد احباب انہیں قلمبند کر کے شائع کرتے رہے اور کسی خاص موضوع کے بارے میں انہی تقاریر سے متعدد مجموعے بھی مرتب کر کے شائع کیے گئے۔

مجھے ایک فکر ہمیشہ دامن گیر رہی کہ اصلاحی بیانات میں بسا اوقات واقعات اور احادیث میں صحت کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا جتنا مستقل تالیفات میں ہوتا ہے، اس لیے میں نے اپنے احباب میں سے مولانا عنایت الرحمن صاحب کو اس پر

نامزد کیا کہ وہ میری تقاریر میں بیان کردہ احادیث یا سلف کے واقعات کی تحقیق وتخریج کریں اور جہاں غلطی ہوئی ہو، اس کی اصلاح کریں۔ میرے مشورے سے وہ یہ کام ماشاء اللہ قابلیت کے ساتھ کرتے رہے۔ مولانا عنایت الرحمن صاحب نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ''اصلاحی خطبات''، ''اصلاحی مجالس'' اور بیانات کے مختلف مجموعوں کو بھی عنوانات و مضامین کی ترتیب سے مرتب کیا اور جو تقاریر ''البلاغ'' میں یا کسی دوسرے رسالے میں شائع ہوئی تھیں یا کسی کتاب کا جز تھیں ان کا بھی استقصاء کر کے ایک نیا مجموعہ ''مواعظِ عثمانی'' کے نام سے مرتب کر دیا اور اس لحاظ سے یہ بندہ کی تقاریر، مواعظ اور بیانات کا سب سے زیادہ جامع مجموعہ ہوگیا ہے اور حسبِ استطاعت اس میں تخریج و تحقیق کا بھی اہتمام ہے جس سے اس کے درجۂ استناد میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزِ موصوف کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر اس بے عمل کے لیے ذخیرۂ آخرت بنادیں اور اس سے عام و خاص مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ آمین

دارالعلوم کراچی ۱۴
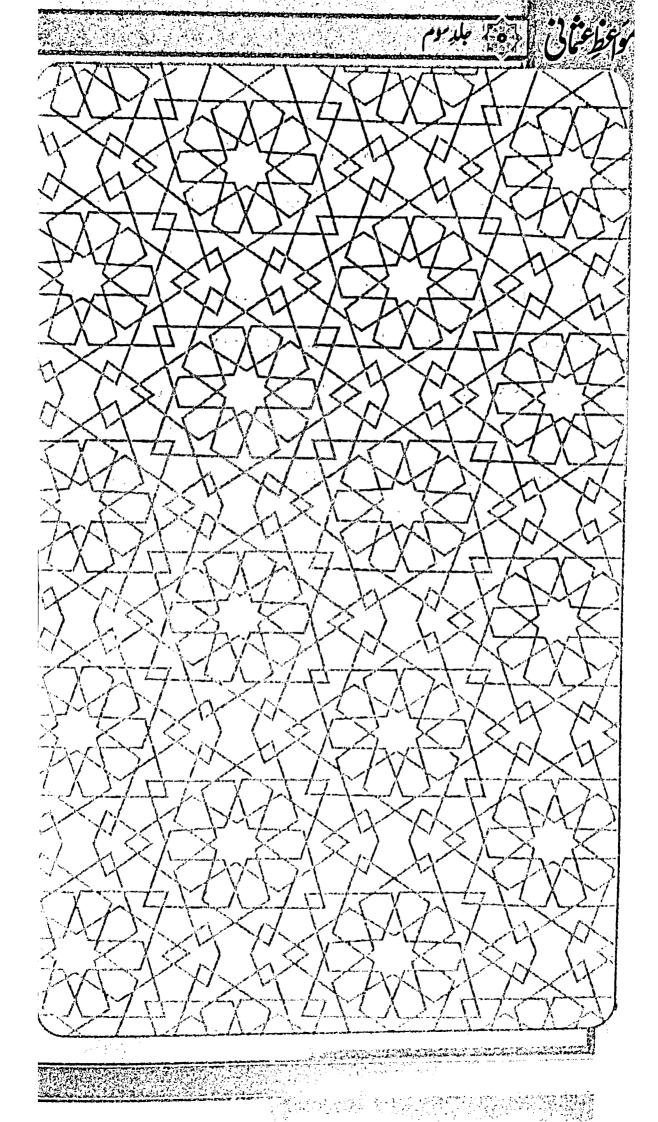
بندہ

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۵/محرم ۱۴۴۳ھ

عرض ناشر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

زیرِ نظر کتاب سلسلہ ''مواعظِ عثمانی'' جلدِ سوم ''سنّت و بدعت'' جو حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے خطبات، تقاریر اور مضامین کا تخریج شدہ جامع اور مستند موضوع وار مجموعہ ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو اللہ ربُّ العزت نے جو بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، ماہرِ معاشیاتِ اسلامی، مؤرخ، محقق، شاعر، ادیب اور مبلغ و داعیٔ اسلام ہیں۔ اسی دعوت وارشاد کا سلسلہ عرصۂ دراز سے ہفتہ واری مجلس کی صورت میں تاحال جاری ہے اور الحمد للہ اس سے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو فائدہ ہورہا ہے، جن میں غیر مسلم حضرات بھی شامل ہیں۔ اور اسی دعوت وارشاد کی برکت سے بہت سارے غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہیں اور آج ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم کے انہی بیانات ومواعظ سے علماء، طلباء اور خطباء کرام استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور حضرت والا دامت برکاتہم کے جملہ بیانات ومواعظ تحریراً اور تقریراً عوام الناس میں مقبول ہیں اور ہر طبقہ ان سے مستفید ہورہا ہے۔

فاضل مرتب نے اس مجموعہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
- اصلاحی خطبات
- اصلاحی مواعظ
- اصلاحی مجالس
- خطباتِ عثمانی
- خطبات دورۂ ہند
- درسِ شعب الایمان
- نشری تقریریں
- فرد کی اصلاح
- اصلاحِ معاشرہ
- تربیتی بیانات
- ذکر وفکر
- The Islamic months

اور اس کے علاوہ

- آسان ترجمہ قرآن
- اسلام اور ہماری زندگی
- انعام الباری
- تقریرِ ترمذی
- جہانِ دیدہ
- سفر در سفر
- دنیا مرے آگے
- اسلام اور جدید معاشی مسائل
- اسلام اور ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، نیز ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شائع شدہ اور صوتی صورت میں محفوظ شدہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے بعض بیانات و خطبات کو شامل کیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی ہدایت پر اس کی تصحیح اور تحقیق کا اہتمام ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے خطبات ومضامین کا جامع اور مستند ترین مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب، تحقیق وتخریج حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی ہدایت پر ان کی نگرانی میں مولانا عنایت الرحمن صاحب نے کی ہے۔ اس مجموعہ کی خصوصیات اور تحقیق وتخریج کا طریقۂ کار اس مجموعہ کی پہلی جلد ''ایمان وعقائد ونظریات (حصہ) اوّل'' کے شروع میں درج ہے، اس کی مراجعت ان شاء اللہ مفید رہے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اسے ادارہ کے جملہ احباب ومعاونین کے لئے ذخیرۂ آخرت بنادے۔ آمین یا رب العالمین۔

خضر قاسمی (ناظم ادارہ)
مکتبہ معارف القرآن کراچی

فہرستِ عنوانات

اجمالی فہرستِ عنوانات

تفصیلی فہرست

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے

(اصلاحی مجالس جلد ۲ ص ۱۹۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
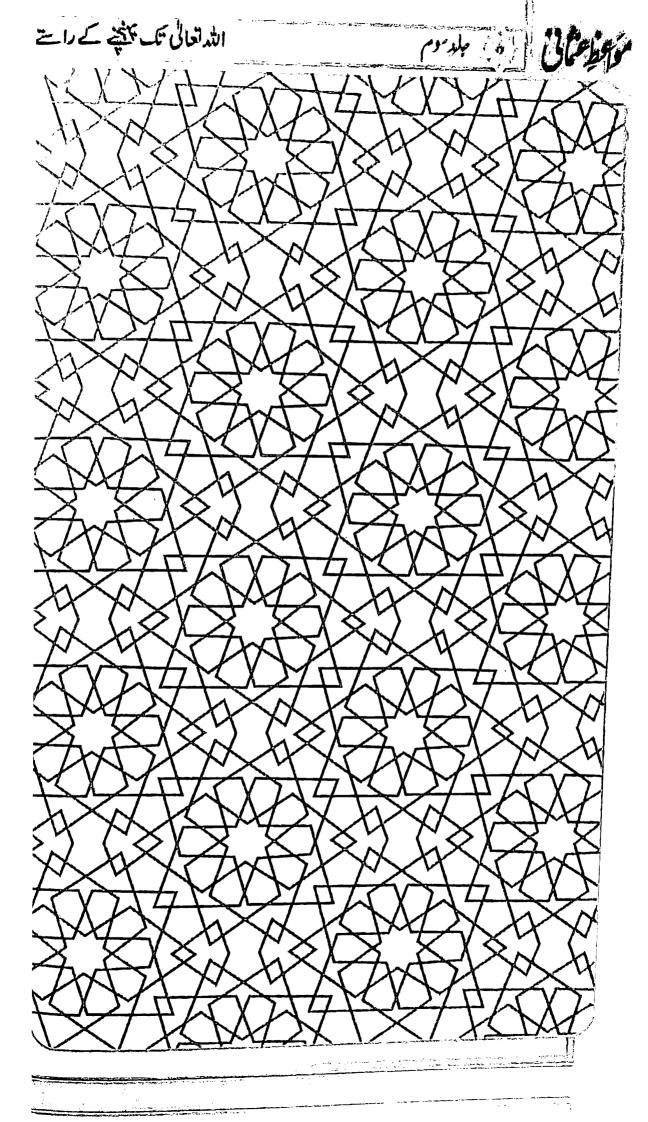
اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

امابعد!

حضرت والا نے فرمایا:

"طُرُقُ الْوُصُوْلِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ".

جس طرح وصول کی ایک صورت یہ ہے کہ حرم میں نماز پڑھو، یہ بھی ایک صورت ہے کہ کسی عذر سے گھر میں نماز پڑھو اور حرم کو ترستے رہو۔

(انفاسِ عیسیٰ، ص ۱۳)

بزرگوں کا یہ مقولہ عربی زبان میں مشہور ہے کہ "طرق الوصول الی اللہ تعالی بعدد انفاس الخلائق" اللہ جل شانہٗ تک پہنچنے کے طریقے اتنے ہی ہیں جتنے مخلوقات کے سانس (یعنی جس طرح ہر انسان کا سانس الگ ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے بھی الگ ہیں، ہر انسان کو ایک ہی لگا بندھا طریقہ بتانا مشکل ہے)۔

یعنی تمام انسانوں کے لیے کوئی ایک ہی ذریعہ لازم نہیں ہے، سینکڑوں ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے وصول کے لیے پیدا فرما رکھے ہیں، اگر ایک انسان کو حرم شریف کی حاضری کا موقع نصیب ہے تو وہ اس حاضری سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہے اور جسے اس کا موقع نہیں ملا، تو وہ خود کو محروم نہ سمجھے اس کے لیے حرم کی حاضری کا شوق اور حسرت ہی ذریعہ تقرب بن سکتی ہے۔

فرائض و واجبات ادا کرنا اور معاصی اور گناہوں سے اجتناب کرنا، یہ وہ چیز ہے جو سب کے لیے مشترک ہے، لیکن اس مقصود کو حاصل کرنے کے لیے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچنے کے لیے ہر ایک کے لیے الگ الگ نسخے تجویز کیے جاتے ہیں، اس کے لیے کسی رہبر اور رہنما اور شیخ کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ بتاتا ہے کہ اس شخص کے لیے مناسب طریقہ کون سا ہے؟

عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھنا

اسی بات کو حضرتِ والا نے ایک مثال سے سمجھایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ایک راستہ یہ ہے کہ حرم میں نماز پڑھو، اسی طرح ایک راستہ یہ بھی ہے کہ عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھو اور حرم کو ترستے رہو۔ فرمایا کہ وصول

دونوں صورتوں میں ہے، حرم میں نماز پڑھنے میں بھی وصول ہے اور عذر کی حالت میں گھر میں نماز پڑھ رہا ہے اور حرم کو ترس رہا ہے یہ بھی وصول ہے۔ عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھنے والا یہ نہ سمجھے کہ میرا راستہ الگ ہوگیا ہے، بلکہ عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھنا بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ہی ہے۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"إنَّ اللهَ يُحِبُّ أن تُؤتَى رُخَصه كمَا يُحِبُّ أن تُوتى عَزائِمُه"[1]

اللہ تعالیٰ اپنی رخصتوں پر عمل کرنے کو اسی طرح پسند فرماتے ہیں جس طرح عزیمت پر عمل کرنے کو پسند فرماتے ہیں۔

لہٰذا یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ صرف عزیمت پر عمل کرنے کی صورت میں ہی وصول نصیب ہوگا، بلکہ رخصت پر عمل کرنے سے بھی وصول کی نعمت سے سرفراز ہوجائے گا۔ اگر جائز عذر ہے اور شریعت کے مطابق ہے اور اس پر واقعی اطمینان ہے کہ یہ عذر کی حالت ہے، تو اس وقت رخصت پر عمل کرنے میں بھی ان شاء اللہ وہی ثواب اور انوار و برکات حاصل ہوں گے جو عزیمت پر عمل کرنے کی صورت میں ہوتے ہیں۔

---

(۱) مسند البزار ۲۵۰/۱۲ (۵۹۹۸) طبع مکتبة العلوم والحکم۔ وصحیح ابن حبان ۶۹/۲ (۳۵٤) طبع موسسة الرسالة. والمعجم الاوسط للطبرانی ۸۲/۸ (۸۰۳۲) طبع دار الحرمین. وقال الهیثمی فی "مجمع الزوائد" ۱۶۲/۳ (٤۹٤۰) رواه الطبرانی فی الکبیر والبزار ورجال البزار ثقات وکذلک رجال الطبرانی۔ (طبع مکتبة القدسی)۔

قضاء کے وقت وہی انوار و برکات

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رمضان المبارک میں کسی عذرِ شرعی کی وجہ سے روزہ چھوٹ گیا (مثلاً بیماری کی وجہ سے یا خواتین کی طبعی مجبوری کی وجہ سے روزہ چھوٹ گیا) تو کوئی نقصان نہیں، اس لیے کہ جب تم عام دنوں میں اس روزے کی قضا کروگے، تو اس دن وہ سارے انوار و برکات حاصل ہوں گے جو رمضان المبارک کے انوار و برکات تھے، کیونکہ ہم نے تم کو اس دن روزہ رکھنے سے معذور کردیا تھا، تو کیا اس کی وجہ سے ہم تم کو رمضان کی فضیلت سے اور رمضان کی برکات اور آثار سے محروم کردیں گے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اچھی اُمید نہ ہوئی، بلکہ اُمید یہی رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس قضا کے اندر وہی برکات اور وہی اجر و ثواب عطا کریں گے۔

دین ''اِتباع'' کا نام ہے

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا تھا کہ سارا دین ''اِتباع'' کے گرد گھومتا ہے جیسے وہ کہیں ویسے کرو اپنی عقل مت چلاؤ۔

چوں کہ برمیخت بہ بند و بستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش

جب تک انہوں نے باندھ رکھا ہے، تو تم بھی بندھے پڑے رہو، جب وہ کھول دیں تو خوب چھلانگیں لگاؤ۔

اس لیے اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے، اسی حال میں خوش رہو ۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

لہٰذا جس حال کی اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے بس اسی میں راضی رہو۔

اِتباع اور تفویض اختیار کرلو

بس دو چیزیں اختیار کرلو۔ ایک ''اتباع'' دوسرے ''تفویض''۔ اوامر و نواہی میں اتباع ہو اور حالات میں تفویض ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو امر آ رہا ہے اس کی اتباع کریں اور دنیا میں جو حالات پیش آ رہے ہیں، اس میں تفویض اختیار کریں۔ تفویض کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا، اللہ پر بھروسہ کرنا کہ جو کچھ انجام ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوگا اور خیر ہی ہوگا، اگر یہ دو چیزیں حاصل ہوجائیں، بس سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قوی ہوگیا۔

نیک کام کی حسرت

اس ملفوظ کے آخر میں فرمایا کہ ''عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھو اور حرم کو ترستے رہو'' یہ ترسنا بھی اللہ کو بہت پسند ہے، یعنی انسان کسی وجہ سے کوئی نیک عمل نہیں کر پایا، لیکن دل میں اس کے کرنے کی حسرت ہورہی ہے کہ کاش میرے اندر ایسی طاقت ہوتی اور میں بھی یہ نیک کام کرلیتا یا میرے حالات ایسے ہوتے کہ میں اس فضیلت کو حاصل کرلیتا۔ یہ حسرت بھی بعض اوقات انسان کو بہت بلندی تک پہنچا دیتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور لوہار کا قصہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا، تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ فرمایا؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا کرم فرمایا، بڑے اونچے درجے عطا فرمائے، لیکن ہمارے گھر کے سامنے جو لوہار رہتا تھا اس کو جو درجہ ملا وہ درجہ ہمیں نصیب نہ ہوا۔ حالانکہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اتنے بڑے بزرگ، محدث، فقیہ، صوفی اور اللہ کے خاص نیک بندے تھے، اس کے باوجود ان کا درجہ لوہار کا سا درجہ نہ ہوا۔ اُس شخص نے جا کر لوہار کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارے شوہر میں کیا ایسی خاص بات تھی، جس کے نتیجے میں وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آگے بڑھ گیا اور حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اس کے درجے پر حسرت کر رہے ہیں؟ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ کوئی خاص عمل تو نہیں کرتا تھا، سارا دن لوہا پیٹتا رہتا تھا، البتہ اس کے اندر دو باتیں تھیں؛ ایک یہ کہ جب اذان کی آواز اس کے کان میں آجاتی، تو فوراً اپنا کام بند کر دیتا تھا، حتیٰ کہ اگر ہتھوڑا مارنے کے لیے سر پر اُٹھایا ہوا ہے، اسی وقت اذان کی آواز کان میں پڑی، تو اس ہتھوڑے سے چوٹ مارنا گوارا نہیں کرتا تھا، اس اُٹھے ہوئے ہتھوڑے کو پیچھے کی طرف ہی پھینک دیتا تھا اور اُٹھ کر نماز کے لیے مسجد چلا جاتا تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ ہمارے گھر کے سامنے حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ رہا کرتے تھے، وہ اپنے مکان کی چھت پر رات کو اس طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے جس طرح لکڑی کھڑی ہوئی ہو، میرا شوہر ان کو

دیکھ کر بڑی حسرت کے ساتھ یہ کہتا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو معاش سے فراغت عطا فرمائی ہے، اس کے نتیجے میں ساری رات کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں اگر ہمیں بھی فراغت ہوتی، تو ہم بھی رات کو کچھ عبادت کر لیا کرتے، لیکن معاش کی فکر کی وجہ سے سارا دن لوہا کوٹنے میں گزر جاتا ہے، پھر تھکاوٹ کی وجہ سے رات کو جاگنے کی ہمّت نہیں ہوتی، ورنہ ہم بھی تہجد کی کچھ رکعتیں پڑھ لیا کرتے۔ یہ حسرت کیا کرتے تھے۔ اُس شخص نے یہ سن کر کہا کہ بس یہی باتیں تھیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ درجہ عطا فرمایا جو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب نہ ہوا۔ بہرحال! حسرت بھی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

جسم وطن میں اور دل حرم میں

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''جسم ہندوستان میں ہو اور دِل حرم شریف میں ہو، یہ بہتر ہے اس سے کہ جسم حرم شریف میں ہو اور دِل ہندوستان میں ہو۔'' یعنی جسم تو یہاں ہے اور دل میں خواہش ہو رہی ہے کہ کاش ہم بھی حرمین شریفین کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہوتے، کاش کہ ہمیں بھی وہاں جانے کا موقع مل جائے، تو ہم بھی وہاں پہنچ جائیں، یہ جذبہ، یہ خواہش، یہ حسرت، یہ تمنا دل میں ہے اور جسم اپنے وطن میں ہے، یہ صورت بہتر ہے اس سے کہ آدمی حرم میں بیٹھا ہوا ہے اور اپنے وطن کو یاد کر رہا ہے۔

حضرت مولانا بدر عالم رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرتِ مدینہ

حضرت مولانا بدر عالم رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے بزرگوں میں سے گزرے ہیں، یہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ چلے گئے تھے۔ آج کل تو ہجرت کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس لیے کہ آج لوگ پیسے کمانے کے لیے ہجرت کرتے ہیں، کیونکہ وہاں پیسے بہت ملتے ہیں۔ اصل ہجرت تو اس زمانے کی تھی جب وہاں پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، صرف اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے ہجرت ہوتی تھی۔ بہرحال! آپ نے اس طرح ہجرت فرمائی کہ ایک عرصے تک وہاں اس حال میں رہے کہ آپ کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ عقل حیران ہوتی ہے کہ وہ وقت آپ نے کس طرح گزارا ہوگا؟

چنانچہ خود اپنا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ جب میں پہلی مرتبہ مدینہ منورہ گیا، تو وہاں کسی سے جان پہچان تو تھی نہیں، ایک کمرے میں جو تنگ و تاریک تھا، قیام کیا، وہاں مجھے بخار آ گیا، اب وہاں پر نہ کوئی آنے والا نہ جانے والا، نہ مجھے کوئی دیکھنے والا، شدید بخار میں مبتلا اور تین دن مجھ پر اس طرح گزرے کہ ایک دانہ بھی میرے منہ میں نہیں گیا۔ شدید بخار کی وجہ سے خود اُٹھ کر بھی حرم نہیں جاسکتا تھا، کمزوری کی وجہ سے وہاں پر نماز پڑھنا مشکل ہورہا تھا۔ تین دن کے بعد ایک شخص میرا نام ''بدر عالم''، ''بدر عالم'' پکارتا ہوا آیا۔ اپنے ساتھ کچھ دوا اور کچھ کھانا بھی لایا۔ حضرت مولانا نے اس شخص سے پوچھا کہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ میرا نام ''بدر عالم'' ہے اور میں یہاں پر ہوں؟ اس شخص نے بتایا کہ میں نے ایک خواب دیکھا اور خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نام بتایا اور کہا کہ جا کر ان کو دیکھو وہ فلاں

جگہ پر بیمار پڑا ہوا ہے اور اس کی خبر گیری کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ مقام عطا فرمایا تھا۔

مدینہ میں رہتے ہوئے خارجِ مدینہ کی ضرورت

بہرحال! جب حضرت مولانا بدر عالم رحمۃ اللہ علیہ مدینہ طیبہ ہجرت کر گئے، تو ان کے پاس حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خط لکھا، اس خط میں حضرت مفتی صاحب نے ایک جملہ یہ لکھ دیا کہ "آپ کو یہاں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مجھے ارشاد فرمادیں، میں وہ چیز بھیجنے کو اپنی سعادت سمجھوں گا۔" حضرت مولانا بدر عالم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اس جملے کے جواب میں لکھا کہ

"مدینہ میں رہتے ہوئے خارج مدینہ کی ضرورت!!"

"اَمَّا إلیكَ فَلَا"

یعنی میں مدینہ میں رہتے ہوئے بھی اب اس بات کی فکر کروں کہ فلاں چیز فلاں جگہ ملتی ہے، یہ چیز وہاں سے منگواؤں، اس بات کو میری غیرت گوارا نہیں کرتی۔

اور "اَمَّا اِلَیْكَ فَلَا" سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جارہا تھا، تو حضرت جبرئیل امین علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ اگر میری کچھ ضرورت ہو تو میں کچھ مدد کروں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

"اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا"(۱)

آپ کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، ہاں مجھے اللہ جل جلالہٗ کی رحمت اور کرم کی ضرورت ہے، میں اس کا محتاج ہوں۔ اسی طرح حضرت مولانا بدر عالم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی صاحب کو یہ جملہ لکھ دیا۔

مدینہ جاؤں، پھر آؤں مدینہ پھر جاؤں

بہر حال! اگر مدینہ میں آدمی رہے اور اس طرح رہے جس طرح حضرت مولانا بدر عالم رحمۃ اللہ علیہ رہتے تھے، تب تو مزہ ہے یہ نہ ہو کہ رہے تو مدینہ میں، دل لگا ہوا ہو پاکستان اور ہندوستان میں۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ آدمی یہاں پاکستان میں رہے اور دل مدینہ کی طرف لگا رہے۔ امیر مینائی نے بڑا خوبصورت شعر کہا ہے ؎

مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

کسی نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا آپ نے کہا کہ مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں، ارے واپس ہی کیوں آؤں؟ وہیں کیوں نہ رہ پڑوں۔ انہوں نے کہا کہ مزہ اس میں ہے کہ مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں۔ اسی لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ یہ صورت بہتر ہے اس سے کہ آدمی وہاں رہے اور یہاں کے بارے میں سوچتا رہے۔

---

(۱) تفسیر الطبری ۳۰۹/۱۶ طبع دار هجر۔ وشعب الایمان للبیهقی ۳۵۲/۲ (۱۰۴۵) طبع مکتبة الرشد.

ہمّت کو استعمال کریں

ارشاد فرمایا:

''اختیاری اُمور میں کوتاہی کا علاج بجز ہمّت اور استعمالِ اختیار کے کچھ نہیں، اسی پر مدار ہے تمام اصلاحات کا اور یہی ہے اصل علاج تمام کوتاہیوں کا۔''

(انفاس عیسیٰ، ص ۱۳)

آج لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم کسی شیخ کے پاس جائیں گے، تو وہ ایسی نظر ڈالے گا یا وہ ایسی پھونک مار دے گا جس سے دل چل جائے گا اور دنیا بدل جائے گی اور ہماری زندگیوں میں انقلاب آجائے گا۔ یاد رکھیے! یہ سب وقتی اثرات سے زیادہ کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمّت کو استعمال کیے بغیر اصلاح نہیں ہوسکتی۔

اگر صرف نظر ڈال دینے سے اور پھونک مارنے سے کام چلا کرتا، تو حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جہاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور کسی تبلیغ و دعوت کی ضرورت نہ ہوتی۔ بس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک نظر ڈال دیتے اور لوگ مسلمان ہوجاتے، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے پتا چلا کہ تصرف کرنا اور نظر ڈال دینا اور پھونک مار دینا یہ معمول کے طریقے نہیں ہیں۔

تصرّفات کی ایک مثال

البتہ بعض اوقات ان تصرفات سے فوری اور وقتی اثرات کے ذریعے اصلاحِ حال میں کچھ مدد مل جاتی ہے، لیکن اس کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے انسان

کی کایا نہیں پلٹ جاتی، اگر کسی نے نظر ڈال دی یا کوئی تصرف کر دیا، تو اس کے نتیجے میں آدمی اصلاح کے راستے پر چلنا شروع تو کر دیتا ہے لیکن آگے بڑھنے کے لیے اور مستقل چلتے رہنے کے لیے اپنی ہمّت ہی کو استعمال کرنا ہوگا۔ ان تصرّفات کی مثال ایسی ہے جیسے گاڑی کا ''سیلف اسٹاٹر'' خراب ہوگیا یا گاڑی کی بیٹری کمزور ہوگئی، اب اس گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن وہ اسٹارٹ نہیں ہورہی ہے، اب اس کو دھکا لگا کر اسٹارٹ کرنا ہوگا، چنانچہ دھکا لگانے کے نتیجے میں اس کی بیٹری میں تھوڑی سی قوت پیدا ہوگئی اور گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ اب آگے وہ اپنی بیٹری اور انجن کی قوت سے چلے گی، لیکن اگر بیٹری میں اور انجن میں جان ہی نہیں ہے، تو پھر کتنے بھی دھکے لگاتے رہو وہ گاڑی چل کر نہیں دے گی۔

اسی طرح کسی بزرگ کا تصرف کر دینا یا توجہ ڈال دینا یہ درحقیقت دھکا لگانا ہے اس کے نتیجے میں انسان کے اندر کچھ نشاط اور جوشِ عمل پیدا ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے کچھ عمل کرنے کی توفیق ہوجاتی ہے، لیکن آگے عمل کو خود ہی جاری رکھنا ہوگا، یہ نہیں ہوسکتا کہ محض تصرف اور توجہ کے نتیجے میں ساری زندگی عمل ہوتا رہے، بلکہ آگے اپنے اختیار سے عمل کرنا ہوگا۔

کوتاہی اور سستی کا علاج

یاد رکھیے! کوتاہی کا علاج اور سستی کا علاج بجز استعمالِ ہمّت کے کچھ اور نہیں۔ کسی کام کے کرنے سے سستی ہورہی ہے، اس کا راستہ یہ ہے کہ عزم اور ہمّت کرکے اس سستی کا مقابلہ کرے، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ کوئی شخص یہ

چاہے کہ سستی کے علاج کے لیے کوئی نسخہ گھول کر پلا دیا جائے، تو ایسا کوئی نسخہ آج تک وجود میں نہیں آیا۔ لوگ پوچھتے رہتے ہیں کہ حضرت! نماز میں بڑی کوتاہی اور سستی ہوجاتی ہے، اس کے لیے کوئی وظیفہ بتادیجیے۔ ارے بھائی! اس کے لیے سب سے بڑا وظیفہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہمّت دی ہے اس ہمّت کو استعمال کرو، جب اس ہمّت کو استعمال کروگے تب تمہارا کام بنے گا، جھاڑ پھونک سے یہ کام نہیں بنا کرتا، ہمّت سے کام بنتا ہے۔

انسان کی ہمّت میں طاقت

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمّت میں بڑی طاقت رکھی ہے، اتنی طاقت رکھی ہے کہ کوئی حد وحساب نہیں، اللہ تعالیٰ اس ہمّت کے ذریعے بڑے بڑے کام کرادیتے ہیں جو انسان کے تصور میں نہیں آسکتے، اس ہمّت کے نتیجے میں انسان چاند تک پہنچ گیا، ورنہ پہلے چاند پر جانے کو ناممکن سمجھا جاتا تھا، لیکن جب ہمّت کی تو پہنچ گیا، لہٰذا جب ہمّت کرکے انسان چاند پر پہنچ سکتا ہے، تو اپنے نفس پر کیوں قابو نہیں پاسکتا اگر قابو کرنا چاہے۔

میرا ایک شعر ہے کہ۔

کمندیں ڈال رکھی ہیں میری ہمّت نے تاروں پر
مگر اب تک دلِ ناداں کی نادانی نہیں جاتی

یعنی ہمّت نے تو تاروں پر کمندیں ڈال رکھی ہیں اور چاند پر اور مریخ پر اور زہرہ پر پہنچ گیا، مگر اس دل پر اب تک قابو نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا جب انسان ان چیزوں پر قابو پاسکتا ہے، تو اس نفس اور دل پر قابو کیوں نہیں پاسکتا؟ بس

انسان اس کا مراقبہ کرے اور اپنی ہمّت کو تازہ کرے، یہی راستہ ہے، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں ہمّت عطا فرمائے اور ہمارے اعمال و اخلاق کی اصلاح فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

تعلق مع اللہ کا آسان طریقہ

(اصلاحی خطبات ج ۴ ص ۱۳۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعلق مع اللہ کا آسان طریقہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِیْ رضی اللہ عنہ قَالَ: ”كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اسْتَجَدَّ ثَوْبًا سَمَّاهُ بِاسْمِهٖ، عِمَامَةً اَوْ قَمِيْصًا اَوْ رِدَاءً يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ كَسَوْتَنِيْهِ، اَسْاَلُكَ خَيْرَهٗ وَخَيْرَ مَاصُنِعَ لَهٗ،

وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّہٖ وَشَرِّ مَاصُنِعَ لَہٗ.[1]

نیا کپڑا پہننے کی دعا

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ جب آپ کوئی نیا کپڑا پہنتے تو اس کپڑے کا نام لیتے، چاہے وہ عمامہ یا قمیص ہو یا چادر ہو اور اس کا نام لے کر یہ دعا کرتے کہ ''اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ لباس عطا فرمایا۔ میں آپ سے اس لباس کے خیر کا سوال کرتا ہوں اور جن کاموں کے لیے یہ بنایا گیا ہے ان میں سے بہتر کاموں کا سوال کرتا ہوں اور میں آپ سے اس لباس کے شر سے پناہ چاہتا ہوں اور جن بُرے کاموں کے لیے یہ بنایا گیا ہے اس کے شر سے پناہ چاہتا ہوں۔''

ہر وقت کی دعا الگ ہے

لباس پہنتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ آپ یہ دعا پڑھتے تھے اگر کسی کو یہ الفاظ یاد نہ ہوں، تو پھر اردو ہی میں لباس پہنتے وقت یہ الفاظ کہہ لیا کرے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اس اُمت پر یہ عظیم احسان ہے کہ آپ نے قدم قدم پر اللہ جل شانہٗ سے دعا مانگنے کا طریقہ سکھایا، ہم تو وہ لوگ ہیں جو محتاج تو بے انتہا ہیں، لیکن ہمیں مانگنے کا ڈھنگ نہیں آتا، ہمیں نہ تو یہ معلوم ہے کہ کیا مانگا جائے اور نہ یہ معلوم ہے کہ کس طرح مانگا جائے، لیکن حضورِ

---

(۱) سنن الترمذی ۳/۳۶۷ (۱۷۶۷) وقال ھذا حدیث حسن-طبع دار الجیل بیروت.
وسنن ابی داود ۴/۴۱ (۴۰۲۰) طبع المکتبۃ العصریۃ الصیدا.

اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں طریقہ بھی سکھادیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس طرح مانگو۔ صبح سے لے کر شام تک بے شمار اعمال انسان انجام دیتا ہے۔ تقریباً ہر عمل کے لیے علیحدہ دعا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے۔ مثلاً فرمایا کہ صبح کو جب بیدار ہو، تو یہ دعا پڑھو، جب استنجاء کے لیے جانے لگو، تو یہ دعا پڑھو، استنجا سے فارغ ہوکر باہر آؤ تو یہ دعا پڑھو، جب وضو شروع کرو تو یہ دعا پڑھو، وضو کے دوران یہ دعائیں پڑھتے رہو، وضو سے فارغ ہوکر یہ دعا پڑھو، جب نماز کے لیے مسجد میں داخل ہونے لگو تو یہ دعا پڑھو اور پھر جب مسجد سے باہر نکلو، تو یہ دعا پڑھو، جب اپنے گھر میں داخل ہونے لگو تو یہ دعا پڑھو، جب بازار میں پہنچو تو یہ دعا پڑھو، گویا کہ ہر ہر نقل و حرکت پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعائیں تلقین فرمادیں کہ یہ دعائیں اس طرح پڑھا کرو۔ (۱)

تعلق مع اللہ کا طریقہ

یہ ہر ہر نقل و حرکت پر علیحدہ علیحدہ دعا کیوں تلقین فرمائی؟ یہ درحقیقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنے کے لیے نسخۂ اکسیر بتادیا، اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا آسان ترین اور مختصر ترین راستہ یہ ہے کہ ہر وقت انسان اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے اور دعا کرتا رہے۔ قرآنِ کریم نے ہمیں یہ حکم دیا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿٤١﴾ (۲)

---

(۱) ان دعاؤں کو جاننے اور سیکھنے کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب ''پرنور دعائیں'' ملاحظہ فرمائیں۔ از مرتب

(۲) سورۃ الاحزاب آیت (۴۱)۔

اے ایمان والو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو، کثرت سے اس کا ذکر کرو۔

اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے پوچھا یارسول اللہ! سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ تو جناب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل عمل یہ ہے:

"لَا یَزَالُ لِسانُکَ رَطْبًا مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ"(۱)

یعنی تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے، ہر وقت زبان پر ذکر جاری رہے۔ خلاصہ یہ کہ کثرت سے ذکر کرنے کا حکم قرآنِ کریم نے بھی دیا اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی حدیث میں اس کی فضیلت بیان فرمائی۔

اللہ ذکر سے بے نیاز ہے

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کثرت ذکر کا کیوں حکم دیا؟ العیاذ باللہ۔ کیا اللہ تعالیٰ کو ہمارے ذکر سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو اس بات سے مزہ آتا ہے کہ میرے بندے میرا ذکر کر رہے ہیں؟ کیا اس کو اس سے لذت آتی ہے؟ یا اس کو کوئی نفع ملتا ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو، وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا، کیونکہ اگر ساری کائنات ہر وقت ہر لمحے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی رہے، تو اس کی کبریائی میں، اس کے جلال و جمال میں، اس کی عظمت میں ایک ذرّہ برابر

(۱) الزهد والرقائق لابن المبارك ص۲۷۹ (۹۳۵) طبع دار الكتب العلمية. وسنن الترمذی ۲۸۸/۵ (۳۳۷۵) وقال هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه۔

اضافہ نہیں ہوتا اور اگر ۔العیاذ باللہ۔ ساری کائنات مل کر اس بات کا عہد کرلے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ کو بھلادیں، ذکر سے غافل ہوجائیں اور معصیتوں کا ارتکاب کرنے لگیں، نافرمانیوں میں مبتلا ہوجائیں، تو اس کی عظمت و جلال میں ذرّہ برابر کمی واقع نہیں ہوگی، وہ ذات تو بے نیاز ہے ''اَللّٰہُ الصَّمَدُ'' وہ ہمارے ذکر سے بھی بے نیاز، ہمارے سجدوں سے بے نیاز، ہماری تسبیح سے بھی بے نیاز، اس کو ہمارے ذکر کی ضرورت نہیں۔

برائیوں کی جڑ اللہ سے غفلت

لیکن یہ جو کہا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو، اس سے ہمارا ہی فائدہ ہے، اس لیے کہ دنیا میں جتنے جرائم، بدعنوانیاں اور بداخلاقیاں برائیاں ہوتی ہیں، اگر ان سب برائیوں کی جڑ دیکھی جائے تو وہ اللہ سے غفلت ہے۔ جب انسان اللہ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ کو بھلا بیٹھتا ہے تب گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں ہو، اللہ تعالیٰ کا ذکر دل میں ہو اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس دل میں ہو کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، تو پھر گناہ سرزد نہیں ہوگا۔

چور جس وقت چوری کررہا ہے اس وقت وہ اللہ کی یاد سے غافل ہے، اگر اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوتا تو چوری کا ارتکاب نہیں کرتا، بدکار جس وقت بدکاری کررہا ہے، اس وقت وہ اللہ کی یاد سے غافل ہے، اگر اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوتا تو وہ بدکاری کا ارتکاب نہ کرتا، اسی بات کو حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَشْرَبُ الخَمْرَ حِينَ يَشْرَبُ وهو مُؤْمِنٌ، وَلَا يَسْرِقُ حِينَ يَسْرِقُ وهو مُؤْمِنٌ"(۱)

یعنی جب زنا کرنے والا زنا کرتا ہے اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا، مؤمن نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ایمان اس وقت مستحضر نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کا ذکر مستحضر نہیں ہوتا۔ جب چور چوری کرتا ہے، تو وہ مؤمن نہیں ہوتا، یعنی اس وقت اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں نہیں ہوتی۔ اگر یاد دل میں ہوتی، تو یہ گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا۔ لہٰذا ساری برائیاں، سارے مظالم، ساری بداخلاقیاں جو دنیا کے اندر پائی جارہی ہیں، ان کا بنیادی سبب اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت ہے۔

اللہ کہاں گیا؟

ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ منورہ سے باہر کسی علاقے میں گئے، ایک بکریوں کا چرواہا ان کے پاس سے گزرا جو روزے سے تھا، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کی دیانت کو آزمانے کے لیے اس سے پوچھا کہ اگر تم بکریوں کے اس گلّے میں سے ایک بکری ہمیں بیچ دو تو اس کی قیمت بھی تمہیں دے دیں گے اور بکری کے گوشت میں سے اتنا گوشت بھی دے دیں گے جس پر تم افطار کرسکو۔ اس نے جواب میں کہا کہ یہ بکریاں میری نہیں ہیں، میرے آقا کی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر اس کی ایک بکری گم ہوجائے گی تو وہ کیا کرے گا؟ یہ سنتے ہی

---

(۱) صحیح مسلم ۷۶/۱ (۵۷) طبع دار احیاء التراث العربی۔

چرواہے نے پیٹھ پھیری اور آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھا کر کہا "فاین اللہ" یعنی اللہ کہاں گیا؟ اور یہ کہہ کر روانہ ہوگیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما چرواہے کے اس جملے کو دھراتے رہے۔ مدینہ منورہ پہنچے تو اس چرواہے کے آقا سے مل کر اس سے بکریاں بھی خرید لیں اور چرواہے کو بھی خرید لیا، پھر چرواہے کو آزاد کردیا اور ساری بکریاں اس کو تحفے میں دے دیں (۱)۔

ذکر سے غفلت، جرائم کی کثرت

یہ ہے اللہ تعالیٰ کا ذکر، اللہ کی یاد، جو دل میں اس طرح جم گیا کہ کسی بھی وقت دل سے نہیں نکلتا، نہ جنگل کی تنہائی میں نہ رات کی تاریکی میں۔ اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس وہ چیز ہے جو تنہائی میں بھی انسان کے دل پر پہرے بٹھا دیتا ہے اور اگر یہ احساس باقی نہ رہے تو اس کا انجام آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج پولیس کی تعداد بڑھ رہی ہے، محکموں میں اضافہ ہورہا ہے، عدالتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، فوج لگی ہوئی ہے، گلی کوچوں میں پہرے لگے ہوئے ہیں، مگر پھر بھی ڈاکے پڑ رہے ہیں، لوگوں کے جان و مال اور آبرو پر کس طرح حملے ہورہے ہیں، جرائم میں اضافہ ہورہا ہے یہ سب کیوں؟ اس لیے کہ جرائم کی جڑ اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتی جب تک اللہ جل شانہٗ کی یاد، اللہ تعالیٰ کا ذکر دل میں نہ سما جائے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کا احساس دل میں پیدا نہ ہو، لہٰذا جب تک دل میں یہ شمع فروزاں نہیں ہوتی، اس وقت تک ہزار

(۱) شعب الایمان للبیہقی ۲۲۳/۷ (۴۹۰۸) وقصر الامل لابن ابی الدنیا ص ۱۲۷ (۱۸۷) طبع دار ابن حزم، والاربعون علی مذہب المتحققین من الصوفیہ لابی نعیم ص:۴ (۱۴) طبع دار ابن حزم۔

پہرے بٹھالو، ہزار فوجی بلالو، مگر جرائم بند نہیں ہوں گے، ذرا سی کسی کی آنکھ بہکے گی اور جرم ہوجائے گا، بلکہ جو آنکھ حفاظت کے لیے مقرر تھی آج وہ آنکھ جرم کرارہی ہے، جس کو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے بٹھایا گیا تھا، وہی لوگ جان و مال پر ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ لہٰذا جب تک اللہ کا ذکر، اس کی یاد دل میں نہ ہو، جواب دہی کا احساس دل میں نہ ہو، اس وقت تک جرائم کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔

جرائم کا خاتمہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

جرائم کا خاتمہ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا کہ نہ پولیس ہے، نہ محکمہ ہے، نہ عدالت ہے، نہ فوج ہے، بلکہ جس کسی سے جرم صادر ہوگیا، تو وہ روتا آرہا ہے کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! مجھ پر سزا جاری کردیجیے[1]، تاکہ میں آخرت کے عذاب سے بچ جاؤں اور ایسی سزا جاری کریں کہ پتھر مار مار کر مجھے ہلاک کردیجیے اور مجھے رجم کردیجیے۔ بس بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کا خوف دل میں سمایا گیا تھا، اسی لیے کہا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرو، ورنہ ہمارے ذکر سے اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں، لیکن جتنا ذکر کرو گے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس دل میں پیدا ہوگا اور پھر جرم گناہ معصیت اور نافرمانی سے ان شاء اللہ بچاؤ ہوگا، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرو۔

---

(۱) ملاحظہ ہو صحیح البخاری ۱۶۷/۸ (۶۸۲۵) طبع دار طوق النجاۃ وصحیح مسلم ۱۳۲۱/۳ (۱۶۹۵)۔

زبانی ذکر بھی مفید و مطلوب ہے

لوگ کہتے ہیں کہ اگر صرف زبان سے ''اللہ اللہ'' کر رہے ہیں یا ''سبحان اللہ'' کہہ رہے ہیں یا زبان سے ''الحمد للہ'' کہہ رہے ہیں اور دل کہیں ہے دماغ کہیں ہے، تو اس سے کیا حاصل؟ یاد رکھو! یہ زبان سے ذکر کرنا پہلی سیڑھی ہے، اگر یہ سیڑھی قطع نہ کی تو دوسری سیڑھی پر کبھی نہیں پہنچ سکتے، زندگی بھر نہیں پہنچ سکتے اور اگر یہ سیڑھی قطع کر لی اور زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا شروع کر دیا، تو کم از کم ایک سیڑھی تو طے ہوگئی پھر اس کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ دوسری سیڑھی بھی قطع کرا دیں گے۔ اس لیے اس ذکر کو بے کار مت سمجھو، یہ ذکر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اگر ہمارا سارا جسم نہ سہی، تو کم از کم ایک عضو تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی یاد میں مشغول ہے۔ اگر اس میں لگے رہے، تو ان شاء اللہ آگے جا کر یہی ترقی کر جائے گا۔

تعلق مع اللہ کی حقیقت

بہرحال! اللہ کے ذکر اور اللہ کی یاد کے دل میں سما جانے کا نام ہی ''تعلق مع اللہ'' ہے۔ یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کچھ نہ کچھ رابطہ اور تعلق قائم ہے، صوفیائے کرام کے سلسلوں میں جتنی ریاضتیں، مجاہدات، وظیفے اور اشغال ہیں۔ ان سب کا حاصل اور خلاصہ اور مقصود صرف ایک ہی چیز ہے وہ ہے ''تعلق مع اللہ کو مضبوط کرنا'' اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوجاتا ہے، تو پھر انسان سے گناہ بھی نہیں ہوتے، پھر انسان اللہ کی عبادت بھی اپنی بساط کے مطابق بہتر سے بہتر انجام دیتا ہے، پھر اخلاقِ فاضلہ اس کو حاصل

ہو جاتے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ سے نجات مل جاتی ہے یہ سب چیزیں تعلق مع اللہ سے حاصل ہوتی ہیں۔

⑤ ہر وقت مانگتے رہو

اس تعلق مع اللہ کو حاصل کرنے کے لیے صوفیائے کرام کے یہاں بڑے لمبے چوڑے مجاہدات اور ریاضتیں کرائی گئی ہیں، لیکن ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس تعلق مع اللہ کو حاصل کرنے کے لیے میں تمہیں ایک مختصر اور آسان راستہ بتاتا ہوں وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت اور ہر لمحے مانگنے اور مانگتے رہنے کی عادت ڈالو، ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگو، جو دکھ اور تکلیف پہنچے، پریشانی ہو، جو ضرورت اور حاجت ہو، بس اللہ تعالیٰ سے مانگو، مثلاً گرمی لگ رہی ہے کہو اے اللہ! گرمی دور فرما دیجیے۔ بجلی چلی گئی، یا اللہ! بجلی عطا فرما دیجیے۔ بھوک لگ رہی ہے، کہو یا اللہ! اچھا کھانا دے دیجیے، گھر میں داخل ہو رہے ہیں، کہو یا اللہ! گھر میں اچھا منظر سامنے آئے، عافیت کی خبر ملے، کوئی پریشانی کی بات نہ ہو، دفتر میں داخل ہونے سے پہلے کہو، یا اللہ! دفتر جا رہا ہوں حالات ٹھیک رہیں، طبیعت کے موافق رہیں۔ کوئی ناخوش گوار بات پیش نہ آئے۔ کوئی تکلیف کی بات پیش نہ آئے، بازار جا رہے ہو، کہو یا اللہ! فلاں چیز خریدنے جا رہا ہوں، مناسب قیمت پر مناسب چیز دلا دیجیے۔ ہر وقت ہر لمحے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی عادت ڈالو۔

یہ چھوٹا سا چٹکلا ہے

واقعہ یہ ہے کہ کہنے کو یہ معمولی بات ہے، اس لیے کہ یہ کام اتنا آسان ہے جس کی کوئی حد نہیں، اسی وجہ سے اس کی قدر نہیں ہوتی، لیکن اس نسخے پر عمل کر کے دیکھو، اللہ تعالیٰ سے مانگ کے دیکھو، ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے رٹ لگاؤ جو مسئلہ سامنے آئے اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرو، یا اللہ یہ کام کر دیجیے۔ اگر اس کی عادت ڈال لو، تو پھر کوئی لمحہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے سے خالی نہیں جائے گا، مثلاً ایک آدمی سامنے سے آپ سے ملاقات کے لیے آ رہا ہے، آپ ایک لمحے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیں کہ یا اللہ یہ شخص اچھی خبر لے کر آیا ہو، کوئی بری خبر لے کر نہ آیا ہو، یا اللہ یہ شخص جو بات کہنا چاہ رہا ہے اس کا اچھا نتیجہ نکال دیجیے۔ ڈاکٹر کے پاس دوا کے لیے جارہے ہیں، کہو یا اللہ اس ڈاکٹر کے دل میں صحیح تجویز ڈال دیجیے، صحیح دوا اس کے دل میں ڈال دیجیے، گویا کہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی عادت ڈالو۔ یہ چھوٹا سا چٹکلا اور چھوٹا سا نسخہ ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس چٹکلے پر عمل کر کے دیکھو کیا سے کیا ہوجاتا ہے، انسان اس کی وجہ سے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

ذکر کے لیے کوئی قید و شرط نہیں

اور یہ جو مسنون دعائیں ہیں، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ذریعے اس نسخے کی طرف لا رہے ہیں کہ جب کوئی مسئلہ پیش آئے، اللہ تعالیٰ سے مانگو اور دعا کرو اور اللہ تعالیٰ نے اس مانگنے کو اور فریاد کو اتنا آسان فرمادیا ہے کہ اس

پر کوئی قید اور شرط نہیں لگائی، بلکہ کسی بھی حالت میں ہو اللہ تعالیٰ سے مانگو، نہ وضو کی شرط، نہ قبلہ رو ہونے کی شرط، حتیٰ کہ جنابت کی حالت میں بھی دعا مانگنا ممنوع نہیں ہے، اگر چہ اس حالت میں قرآنِ کریم کی تلاوت جائز نہیں، لیکن دعا کر سکتے ہو، حتیٰ کہ جس وقت انسان قضائے حاجت میں مصروف ہے، اس وقت زبان سے کوئی دعا نہیں کرنی چاہیے، زبان سے ذکر نہیں کرنا چاہیے، اس وقت بھی دل دل میں ذکر کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں۔ بہرحال! اللہ تعالیٰ نے اس ذکر کو اتنا آسان کر دیا ہے کہ کوئی قید و شرط نہیں اور کوئی خاص طریقہ نہیں، اگر موقع ہو تو باوضو ہو کر قبلہ رو ہو کر ہاتھ اُٹھا کر مانگو، لیکن اگر ایسا موقع نہ ملے، تو نہ وضو کی شرط نہ ہاتھ اُٹھانے کی شرط نہ زبان سے بولنے کی شرط، بلکہ دل دل میں اللہ تعالیٰ سے مانگ لو، یا اللہ یہ کام کر دیجیے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص سوال کرنے کے لیے آتا ہے اور آکر یہ کہتا ہے کہ حضرت ایک بات پوچھنی ہے، تو اس وقت فوراً دل دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ! یہ شخص معلوم نہیں کیسا سوال کرے گا۔ اے اللہ! اس سوال کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجیے اور کبھی اس عمل سے تخلّف نہیں ہوتا، ہمیشہ یہ عمل کرتا ہوں۔

مسنون دعاؤں کی اہمیت

اب ہر ہر موقع پر اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا نکتہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سکھایا کہ مانگنے کی خاص خاص جگہیں بتادیں کہ اس جگہ تو مانگ ہی لو اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس احسانِ عظیم پر قربان جایئے کہ انہوں نے دعا مانگنا بھی سکھا دیا۔ ارے تم خود کیا مانگو گے؟ کس طرح مانگو گے؟ کن الفاظ سے

مانگو گے؟ تمہیں تو مانگنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا، یہ مانگنے کا ڈھنگ بھی میں ہی تم کو بتادیتا ہوں کہ یہ مانگو اور اس طرح مانگو، ان الفاظ سے مانگو یہ سب کچھ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سکھا گئے۔ اب ہمارا آپ کا کام یہ ہے کہ ان دعاؤں کو یاد کریں اور جب وہ موقع آئے، تو توجہ کے ساتھ وہ دعا مانگ لیا کریں بس اتنا سا کام ہے۔ سب کام حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کر گئے۔ پکی پکائی روٹی تیار کر کے پوری اُمت کے لیے چھوڑ گئے۔ اب اُمت کا کام ہے کہ اس روٹی کو اُٹھا کر اپنے حلق میں ڈال لے، بس اتنا کام بھی ہم سے نہیں ہوتا اور علماء نے ادعیۂ ماثورہ اور مسنون دعاؤں کے نام سے بے شمار کتابیں لکھ دیں اور اس میں وہ دعائیں جمع کرلیں، تاکہ ہر مسلمان اس کو آسانی کے ساتھ یاد کرلے۔ پہلے مسلمان گھرانوں میں یہ رواج تھا کہ جب بچے نے بولنا شروع کیا، تو سب سے پہلے اس کو دعائیں سکھائی جاتیں کہ بیٹا بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھاؤ، کھانے کے بعد یہ دعا پڑھو، بستر پر جاؤ، تو یہ دعا پڑھو، کپڑے پہنو، تو یہ دعا پڑھو، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کام کے لیے باقاعدہ کلاس لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور پھر بچپن کا حافظہ بھی ایسا ہوتا ہے جیسے پتھر پر لکیر۔ ساری عمر یاد رہتا ہے، اب بڑی عمر میں یاد کرنا آسان کام نہیں، لیکن بہرحال! یہ کام کرنے کا ہے، ہر مسلمان اس کو غنیمت سمجھے اور یہ مسنون دعائیں کوئی لمبی چوڑی نہیں ہوتیں، بلکہ چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں، روزانہ مسنون دعاؤں میں سے ایک یاد کرلو اور پھر اس کو موقع پر پڑھنے کا عزم کرلو کہ جب یہ موقع آئے گا، اس دعا کو ضرور پڑھیں گے پھر دیکھئے گا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو کیسے انوار و برکات عطا فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر وقت اپنا ذکر کرنے اور اس میں مشغول رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

حصولِ قرب کا مختصر طریقہ

(اصلاحی مجالس ج ۳ ص ۱۷۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصولِ قرب کا مختصر طریقہ
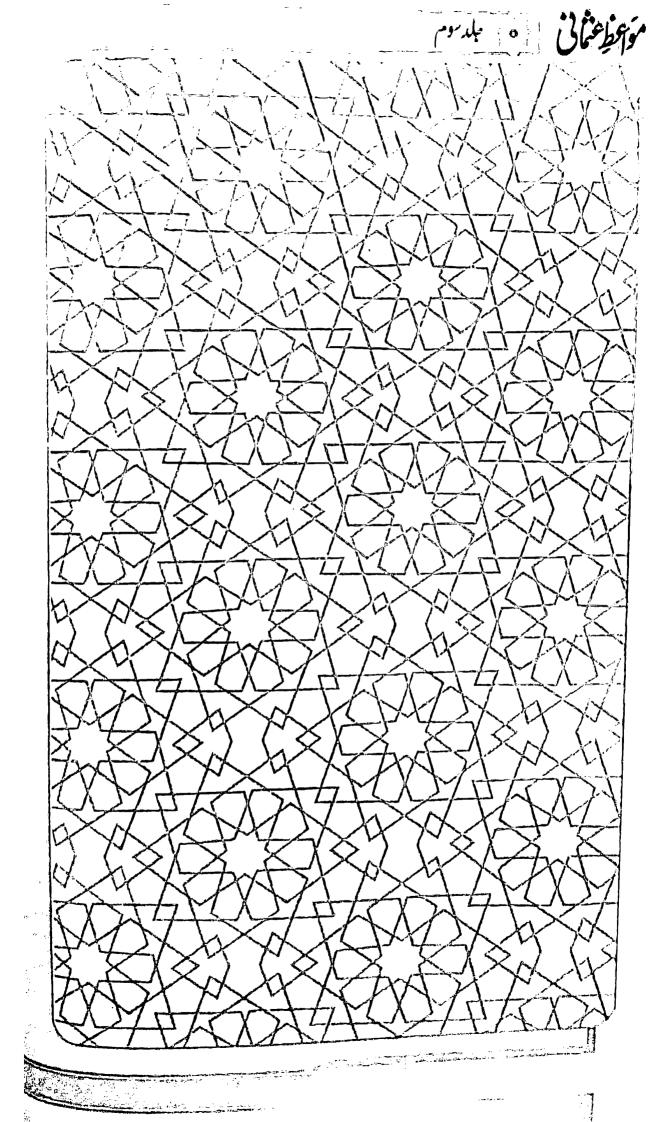
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

گھر میں بال بچوں کے ساتھ ذکر کرنا

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

اگر بال بچوں کے ساتھ گھر رہ کر ذکر نہ ہوتا ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ بالقصد ایسا اہتمام کرے کہ اگر گھر کے علاوہ دوسری جگہ میسر ہو، تب بھی گھر ہی میں ذکر کرے۔ رائضین کا معمول ہے کہ گھوڑا جس چیز سے چمکتا ہو، اس سے دور کرنے کا اہتمام نہیں کرتے کہ ہمیشہ کی مصیبت ہے، بلکہ اسی چیز کے سامنے آنے اور دیکھنے کا خوگر کرتے ہیں، یہاں تک کہ چمک نکل جاتی ہے۔ البتہ جس جگہ امرِ مانع ایسا ہو کہ اس

سے ملابست کی ضرورت نہ ہوگی، وہاں اسلم یہی ہے کہ اس
مانع سے مباعدت اختیار کی جائے۔ خوب سمجھ لو۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۷)

ایسا مانع دور کر دینا چاہیے

اس ملفوظ میں حضرت والا یہ فرما رہے ہیں کہ بعض اوقات ذکر کرنے سے دو قسم کے موانع ہوتے ہیں، ایک مانع تو عارضی قسم کا ہوتا ہے، اگر اس مانع کو دور کر دیا جائے، تو اس سے معمولاتِ زندگی میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا، اس صورت میں تو مناسب یہ ہے کہ آدمی اس مانع کو دور کرلے۔

مثلاً ایک شخص ایک گھر میں رہتا ہے، اس گھر کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں شور شغب ہوتا رہتا ہے، بچے کھیلتے کودتے ہیں اور شور مچاتے پھرتے ہیں، اگر آدمی اس جگہ بیٹھ کر ذکر کرے گا، تو اس کو جمعیتِ خاطر اور سکون حاصل نہیں ہوگا، ایسی صورت میں اس شخص کو چاہیے کہ ذکر کرنے کے لیے گھر کے اندر ایسی جگہ کا انتخاب کرے جہاں شور وشغب زیادہ نہ ہو اور دوسری جگہوں کے بنسبت وہاں نسبتاً سکون ہو۔ یہ مانع ایسا ہے کہ اس کو دور کر دینا چاہیے، اس لیے کہ اس مانع کو دور کر دینا ممکن ہے۔

اس صورت میں گھر میں ہی ذکر کرے

لیکن اگر مانع ایسا ہے کہ انسان کے لیے اپنی طبعی زندگی میں اس مانع سے چھٹکارا کرنا مشکل ہے، مثلاً پورا گھر شور وشغب کا شکار ہے اور ہر وقت بچے شور

مچاتے رہتے ہیں اور گھر چھوٹا ہے، جس کی وجہ سے گھر میں کوئی گوشۂ عافیت نہیں ہے، تو ایسی صورت میں کیا وہ شخص ذکر کے وقت گھر چھوڑ کر مسجد میں یا کسی دوسری جگہ چلا جائے اور وہاں جاکر ذکر کرے یا گھر میں ہی بیٹھ کر ذکر کرے؟

ایسے شخص کے لیے حضرت فرما رہے ہیں کہ وہ شخص گھر میں بیٹھ کر ذکر کرے، گھر چھوڑ کر نہ جائے، کیونکہ یہ ایک مستقل عمل ہے، کب تک گھر چھوڑ کر جائے گا۔ اس لیے گھر میں ہی ذکر کرے اور نفس کو اسی تشتّت کی فضا میں ذکر کرنے کا عادی بنائے اور اسی پراگندگی کی فضا میں ذکر کرنے کا عادی بنائے، اس کے لیے مسجد میں جاکر ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک مثال

اس کی بڑی اچھی مثال حضرت والا نے یہ دی کہ یہ جو گھوڑا سدھانے والے اور پالنے والے سائس ہوتے ہیں، ان کا معمول یہ ہوتا ہے کہ جب گھوڑا کسی خاص چیز کو دیکھ کر بدکتا ہے، فرض کریں کہ گھر میں گھوڑا بھی ہے اور کتا بھی ہے، اب گھوڑا کتے کو دیکھ کر بدکتا ہے یا کوئی توبڑا[1] رکھا ہے، اس کو دیکھ کر گھوڑا بدکتا ہے، تو سائسوں کا معمول یہ ہے کہ جس توبڑے کو دیکھ کر گھوڑا بدک رہا ہے، تو گھوڑے کو رام کرنے کے لیے اس توبڑے کو سامنے سے نہیں ہٹاتے، کیونکہ آج وہ اس توبڑے سے بدک رہا ہے اور تم نے اس توبڑے کو اس کے سامنے سے ہٹا دیا، تو کل وہ کسی اور چیز سے بدکے گا، اس کو بھی ہٹانا پڑے گا، پرسوں تمہارے بچے کو دیکھ کر بدکے گا، تو کیا بچے کو بھی گھر سے باہر

---

(۱) ٹاٹ یا چمڑے کا وہ تھیلا جس میں دانہ بھر کر گھوڑے یا خچر کے منہ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ (اردو لغت تاریخی اصول پر، اردو لغت بورڈ کراچی)

نکال دو گے؟ وہ تو روز کی ایک مصیبت بن جائے گی۔ لہٰذا اس کا علاج یہ ہے کہ گھوڑے کو اس چیز سے مانوس کرے، چنانچہ سائس وہی توبڑا بار بار اس کے سامنے لے کر جائے گا جس کے نتیجے میں وہ رفتہ رفتہ اس توبڑے سے مانوس ہوجائے گا، مانوس ہونے کے نتیجے میں پھر نہیں بدکے گا۔

نفس کو اس شور وشغب کا عادی بناؤ

اس لیے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ جب اسی گھر میں تمہیں رہنا ہے، مستقل طور پر تم اس گھر سے بھاگ نہیں سکتے، تو اس نفس کو اسی شور وشغب میں ذکر کرنے کا عادی بناؤ۔ اگر اسی حالت میں ذکر کرنے سے یکسوئی میسر آجائے، تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اگر یکسوئی میسر نہ آئے، تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن رفتہ رفتہ اس کے اندر یکسوئی آنے لگے گی اور انسان کا نفس اسی کا عادی بن جائے گا۔

غیر معمولی راستہ اختیار کرنا مضر ہے

خلاصہ یہ ہے کہ دل جمعی اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے کوئی غیر معمولی راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ غیر معمولی راستہ اختیار کرنا مضر ہے۔ اپنے معمول کی زندگی میں یکسوئی حاصل کرنے کے لیے جتنی تھوڑی بہت فکر کر سکتے ہو کر لو، جیسے میں نے ابھی بتایا کہ گھر کے جس حصے میں شور وشغب زیادہ ہے، اس کو چھوڑ دو اور جس حصے میں شور وشغب کم ہے وہاں بیٹھ کر ذکر کر لو، لیکن گھر چھوڑ کر نہ بھاگو۔ یہ سب تجربے، حکمت اور دانائی کی باتیں ہیں، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ تو اتنے مراحل سے خود بھی گزرے ہوئے تھے اور دوسروں کو

بھی ان مراحل سے گزارا ہوا تھا، نہ جانے سیکڑوں، بلکہ ہزاروں کو ان مراحل سے گزار دیا، اس لیے یہ باتیں ان کے تجربے کا نچوڑ ہیں، ورنہ یہ باتیں سالہا سال پریشان ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہیں، لیکن حضرت والا نے دو چار لفظوں میں یہ چٹکلے بتا دیے۔

یکسوئی کی زیادہ فکر مت کرو

بہر حال! ذکر بذاتِ خود مقصود ہے، ذکر میں اس بات کی فکر کرنا کہ اس میں یکسوئی ہے یا نہیں؟ اس کی بہت زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے، تھوڑی بہت فکر کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرت والا کو لکھا کہ مجھے ذکر میں یکسوئی نہیں ہوتی۔ جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ

''چاہے یکسوئی بقدر یک سوئی نہ ہو تب بھی ذکر فائدے سے خالی نہیں''۔

لہٰذا اس فکر میں مت پڑو کہ یکسوئی حاصل ہے یا نہیں۔ ارے جس ذات کا ذکر زبان سے جاری ہو رہا ہے، اس کے انوار و برکات اور اس کے فوائد ان شاء اللہ حاصل ہوں گے اور پھر رفتہ رفتہ یکسوئی بھی حاصل ہو جائے گی۔

مفید ترین ذکر

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

زیادہ قرب ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' میں ہے کہ یہ ماثور ہے اور

دوسرے اذکار ''اِلَّا اللہ'' یا ''اللہ اللہ'' مصلحتِ یکسوئی کے لیے تجویز ہوتے ہیں، واقعی تجربہ سے ذکرِ مأثور اوفق بالطبائع ہے اور اس لیے انفع بھی ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۶۷)

ذکرِ مأثور اوفق بالطبع ہوتا ہے

حدیث شریف میں بھی ہے کہ افضل الذکر ''لا الٰہ الا اللہ'' ہے [1]۔ حضرت والا یہ ملفوظ ''دوازدہ تسبیح'' کے سیاق میں ارشاد فرما رہے ہیں کہ ''دوازدہ تسبیح'' میں پہلے ''لا الٰہ الا اللہ'' کی تسبیح پڑھی جاتی ہے اور اس کے بعد پھر ''الا اللہ'' کی تسبیح ہوتی ہے، پھر اس کے بعد ''اللہ اللہ'' کی تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ ان تمام تسبیحات میں قرب سب سے زیادہ ''لا الٰہ الا اللہ'' سے حاصل ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ یکسوئی کی خاطر اور دوسرے اذکار یعنی ''الا اللہ'' یا ''اللہ اللہ'' وغیرہ یہ مصلحتِ یکسوئی کی خاطر تجویز کیے گئے، باقی تجربے سے یہ بات ثابت ہے کہ ذکرِ مأثور اوفق بالطبائع ہے، یعنی جو اذکار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہیں یا آپ کا اس ذکر کو کرنا یا دوسروں کو بتانا ثابت ہے، وہ ذکر جتنا مفید ہوتا ہے اور طبیعت کے موافق ہوتا ہے، دوسرا ذکر نہیں ہوتا، اس لیے ایسا ذکر مفید بھی زیادہ ہے۔

ذکرِ مسنون میں نور اور برکت ہوتی ہے

جتنے وظائف، اوراد اور معلومات وغیرہ ہیں، ان میں سے جو سنت کے

---

(۱) سنن الترمذی ۳۹۳/۵ (۳۳۸۳) وقال ہذا حدیث حسن غریب۔ وسنن ابن ماجہ ۷۱۱/۴ (۳۸۰۰) طبع دار الرسالۃ العالمیہ۔

قریب ہیں اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہیں، ان میں جو نور و برکت ہے اور ان میں جو نفع ہے، وہ دوسرے اذکار اور اوراد میں نہیں۔ ویسے تو بزرگوں سے بہت سے اذکار ثابت ہیں، ان اذکار کے اپنے خواص بھی ہیں جن سے انکار نہیں ہوسکتا، نہ اوراد کو ناجائز اور برا کہہ سکتے ہیں، لیکن جو سنت کا نور ماثور اذکار میں حاصل ہوسکتا ہے، وہ دوسرے اذکار میں حاصل نہیں ہوسکتا۔

بعض لوگوں کی طبیعت

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی طبیعت ماثور اذکار میں نہیں لگتی، اس لیے وہ ادھر ادھر کے دوسرے اذکار کے چکر میں لگے رہتے ہیں، بعض ''درودِ لکھی'' اور ''درودِ تاج'' میں اور بعض ''دعا گنج العرش'' وغیرہ میں لگے رہتے ہیں، ان کی طرف ان کی طبیعت بہت مائل ہوتی ہے اور اذکارِ ماثورہ کی طرف ان کی طبیعت متوجہ نہیں ہوتی، حالانکہ یہ غیر ماثور اذکار ہیں، ان میں سے بعض میں تو خلافِ شرع امور ہوتے ہیں، البتہ بعض میں خلافِ شرع امور نہیں ہوتے۔ مثلاً ''حزب البحر'' ہے، اس میں کوئی خلافِ شرع امر نہیں ہے اور بزرگوں کا اس کو پڑھنے کا معمول رہا ہے، لیکن جو نور ادعیۂ ماثورہ میں ہے، یعنی جو ادعیۂ ماثورہ قرآنِ کریم سے ثابت ہیں یا نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہیں، ان سے بہتر دعا کوئی نہیں ہوسکتی، ان میں جو نور، جو برکت، جو نفع ہے وہ دوسرے اذکار میں نہیں۔

ادعیۂ ماثورہ سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

واقعہ یہ ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کچھ مانگ کر تشریف لے گئے، دنیا

اور آخرت کی کوئی ضرورت اور کوئی حاجت اور کوئی نفع کی چیز ایسی نہیں ہے جو ان ادعیۂ ماثورہ میں نہ آ گئی ہو، اس لیے ان ادعیۂ ماثورہ سے باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے، اگر دن رات آدمی انہی دعاؤں کے پڑھنے کا معمول بنا لے، تو بس یہی کافی ہیں۔ یہی معاملہ ذکر کا ہے، جو اذکارِ ماثورہ ہیں، ان میں جو نور، جو برکت اور جو نفع ہے وہ دوسرے اذکار میں نہیں۔

اتباعِ سنت کا راستہ زیادہ مختصر ہے

صوفیائے کرام کے طریقے مختلف ہوتے ہیں، کسی سلسلے میں کوئی راستہ اختیار کیا جاتا ہے، کسی سلسلے میں کوئی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ سب کا مقصود ''وصول الی اللہ'' ہے اور تعلق مع اللہ قائم کرنا ہے، لیکن راستے الگ الگ ہیں، کوئی راستہ مختصر ہے اور کوئی لمبا ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تو یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے میں جتنا مختصر راستہ ''اتباعِ سنت'' کا ہے، کوئی اور راستہ اتنا مختصر نہیں۔ جو دوسرے راستے مجاہدات، مراقبات، ریاضتوں اور اشغال کے صوفیائے کرام نے تجویز کیے ہیں، ان کے نافع ہونے سے انکار نہیں اور نہ ہی ان کی تنقیص مقصود ہے، لیکن اللہ تعالیٰ تک پہنچانے میں جتنا زود اثر اتباعِ سنت کا راستہ ہے، کوئی اور راستہ اتنا زود اثر نہیں۔

اتباعِ سنت میں محبوبیت کی شان

وجہ اس کی یہ ہے کہ اتباعِ سنت میں محبوبیت کی شان پائی جاتی ہے، قرآنِ کریم

میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ'' (۱)

آپ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو، تو تم لوگ میرا اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

اس آیت سے پتہ چلا کہ اتباعِ سنت کرنے والے سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں۔ یہ بات طے شدہ اور منصوص ہے کہ جو بھی نبی کریم ﷺ کی سنت کی اتباع کرے گا، اس میں محبوبیت کی شان پیدا ہوجائے گی اور محبوبیت کی خاصیت ''جذب'' ہے، یعنی محب محبوب کے لیے جاذب ہوتا ہے، محب محبوب کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے، اس لیے جو شخص اتباعِ سنت کا کام کرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بنے گا اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف کھینچ لیں گے، یہ ''جذب'' کا طریقہ جلد منزل پر پہنچا دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

''اَللّٰهُ يَجْتَبِیْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ'' (۲)

یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

لہٰذا اتباعِ سنت میں محبوبیت ہے اور محبوبیت میں جذبہ کا خاصہ ہے، تو اللہ تعالیٰ اتباعِ سنت کرنے والے کو ''جذب'' فرما لیتے ہیں، اس کے نتیجے میں راستہ جلد قطع ہو جاتا ہے۔

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۳۱).
(۲) سورۃ الشوریٰ آیت (۱۳).

ایک بزرگ اور ایک بادشاہ کا واقعہ

حضرت والا نے ہی ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بادشاہ اپنے قلعے کی برج میں بیٹھا تھا، نیچے سے ایک بزرگ گزر رہے تھے، بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ ان بزرگ سے کچھ استفادہ کرنا چاہیے، چنانچہ بادشاہ نے ان بزرگ کو آواز دی کہ حضرت کچھ ہماری طرف بھی نگاہ فرمالیں، ان بزرگ نے فرمایا کہ میں تمہاری طرف کیسے نگاہ ڈالوں، تمہاری طرف آنے کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے، اس لیے کہ اتنے بڑے قلعے کا چکر لگا کر دروازے تک پہنچوں، پھر چوکیداروں اور پہرے داروں سے اجازت لے کر اندر آؤں، پھر تم تک پہنچوں، یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔

بادشاہ نے کہا کہ میرے تک پہنچنا کوئی مشکل نہیں، یہ کہہ کر اس نے اوپر سے ایک ٹوکری لٹکا دی اور ان بزرگ سے کہا کہ آپ اس ٹوکری میں بیٹھ جائیں، چنانچہ وہ بزرگ اس ٹوکری میں بیٹھ گئے، بادشاہ نے اپنے خادموں سے وہ ٹوکری اوپر کھچوالی۔

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا طریقہ

جب وہ بزرگ اوپر پہنچے تو انہوں نے بادشاہ سے فرمایا کہ اب بتایئے کیا بات ہے؟ اس بادشاہ نے کہا کہ مجھے بتائیں کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اس طرح پہنچ جاؤ جیسے میں تمہارے پاس پہنچ گیا، تم نے پکارا، میں نے عذر ظاہر کیا کہ اتنا لمبا چوڑا راستہ

قطع کر کے کیسے آؤں، تو تم نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص مجھ تک آنا چاہتا ہے، وہ مجھے پکارے اور یہ کہے کہ یا اللہ! میں آپ تک پہنچنا چاہتا ہوں، تو پھر اللہ تعالیٰ اس بندے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

بندے کی مشیت پر اللہ تعالیٰ کھینچ لیتے ہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آیت:

"اَللّٰہُ یَجْتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ" (۱)

کے ظاہری معنی تو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ "یَشَآءُ" کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے، لیکن اس آیت میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "یَشَآءُ" کی ضمیر "مَنْ" کی طرف لوٹ رہی ہو، اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "اللہ تعالیٰ اس شخص کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں جو یہ چاہے کہ اسے کھینچ لیا جائے"، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ جاؤں، تو اس کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پکارے اور اللہ تعالیٰ سے اس کا قرب مانگے، تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

---

(۱) سورۃ الشوریٰ آیت (۱۳)

یہ قلندری راستہ ہے

لہٰذا یہ کھینچنے کا راستہ مختصر ترین راستہ ہے، اس کے مقابلے میں مجاہدات اور ریاضتوں کا جو راستہ ہے، وہ دور کا راستہ ہے۔ فارسی کا مشہور شعر ہے ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

یعنی مجاہدات وریاضتوں کا جو راستہ ہے یہ تو لمبا چوڑا راستہ ہے جو میرے بس کا نہیں، مجھے تو قلندر والا راستہ بتائیے۔ قلندر والے راستے سے مراد محبت کا راستہ اور اتباع سنت والا راستہ ہے۔ اس اتباع سنت کے ذریعے جب محبت پیدا ہوگی، تو وہ محبت انسان کے اندر اسٹیم بھر دے گی، پھر وہ اسٹیم اس کو تیزی سے راستہ قطع کرادے گی۔ دیکھئے! ریل کا انجن جو فولاد کا ہے اور بہت بھاری ہے، لیکن جب اس کے اندر اسٹیم بھر دی، تو اب وہ انجن خود بھی تیزی سے دوڑتا ہے اور پوری گاڑی کو دوڑاتا ہوا لے جاتا ہے۔

اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ دل کے اندر محبت کی اسٹیم بھر دیں، تو پھر وہ راستہ بہت تیزی سے قطع ہوجائے گا۔

اتباعِ سنت کا راستہ خاموشی والا راستہ ہے

اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ اتباعِ سنت کا راستہ قریب کا راستہ ہے اور جلدی منزل تک پہنچانے والا ہے، البتہ اس راستے میں شور وشغب نہیں ہے، جس کی وجہ سے دیکھنے والے کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ شخص کوئی لمبا چوڑا راستہ

قطع کر رہا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص بیٹھا ذکر و شغل میں مصروف ہے یا مراقبہ کر رہا ہے، چلہ کاٹ رہا ہے، تو دیکھنے والے کو بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کچھ کر رہا ہے، لیکن یہ جو قلندر والا راستہ ہے اور اتباعِ سنت والا راستہ ہے، اس میں دیکھنے والے کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس نے کوئی عمل کیا ہے، مثلاً ایک شخص نے مسجد سے نکلتے وقت بایاں پاؤں باہر نکال دیا، تو اب کسی کو کیا پتہ چلا کہ اس نے کیا عمل کیا، لیکن اتباعِ سنت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگیا۔ ہوا کا جھونکا آیا، اس پر آپ نے دل میں کہہ دیا ''اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ'' اب کسی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کیا سے کیا ہوگیا اور کہاں سے کہاں پہنچ گئے، ایک لمحے میں اللہ تعالیٰ کی اہم عبادت انجام پا گئی اور وہ ہے ''شکر'' کی عبادت۔

یہ راستہ شیطانی وساوس سے مامون ہے

بہر حال! اتباعِ سنت کا راستہ ایسا ہے کہ دیکھنے والے کو کچھ پتہ نہیں لگتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شیطان کے جو وساوس ہیں، یعنی حبِ مال، حبِ جاہ، تکبر، خود پسندی، عجب، ریا کاری، وہ اس راستے میں کم ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اپنے اندر اس طرح تبدیلی لاؤ کہ انگلیاں نہ اٹھیں، ایسا نہ ہو کہ کل تو یہ حال تھا اور آج ایک انقلابِ عظیم برپا ہوگیا، کیا سے کیا ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اس طرح اشارہ کریں گے کہ اس آدمی میں اچانک انقلاب آ گیا، یہ انگلیاں اٹھنا فتنہ ہے، اس لیے کہ انگلیاں اٹھنے کے نتیجے میں انسان کے اندر عجب، تکبر، خود پسندی پیدا ہو جاتی ہے۔

چپکے چپکے تبدیلی لاؤ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحئی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس طرح تبدیلی لاؤ جس طرح بچہ بالغ ہوجاتا ہے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ بچہ کس دن بالغ ہوا، ایک ایک دن گزرتا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بچہ بالغ ہوگیا، کسی کو پتا نہیں چلا کہ کون سا وقت اور کون سا دن تھا جب وہ بالغ ہوا۔ اس طرح تبدیلی لاؤ۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نقل اتارو

اور یہ تبدیلی اس طرح آتی ہے کہ ہر چیز میں اس بات کا اہتمام کرو کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو اور سچی بات تو یہ ہے کہ سارے دین کا، سارے احکامات کا، ساری شریعت اور طریقت کا حاصل اگر کچھ ہے تو وہ ''اتباعِ سنت'' ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالی نے مبعوث اسی لیے فرمایا تھا کہ تم اُن کو دیکھو اور ان کی نقل اتارو اور ان کی اتباع کرو۔

روزانہ اپنا جائزہ لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دین پر اور شریعت پر عمل کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ ارے کوئی مشکل نہیں، اپنا ایک لائحہ عمل بنا لو اور روزانہ اپنا جائزہ لو اور میں نے تمہارے لیے ''اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کے نام سے ایک ڈائری بنا دی ہے، روز اس کو دیکھتے جاؤ کہ کس کس کام میں ہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کر رہے ہیں اور کس کام میں نہیں کر رہے ہیں، جس کام میں سنت کا اتباع نہیں کر رہے ہیں،

ایک ایک کر کے ان میں بھی اتباع کرتے چلے جاؤ، اس طرح رفتہ رفتہ بالغ ہوجاؤ گے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کیا سے کیا ہوگیا۔

پانی کا قطرہ پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے

دیکھیے! اگر نل سے پانی ٹپک رہا ہو اور نیچے پتھر رکھا ہوا ہو، پانی ٹپکتے ہوئے ایک دن گزرا، دو دن گزرے، ایک ہفتہ گزرا، ایک مہینہ گزر گیا، رفتہ رفتہ وہ پانی پتھر میں سوراخ کر دے گا۔ اگر اس قطرے کو دیکھو تو اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ پتھر کے اندر سوراخ کر دے اور نہ کسی کو یہ پتا چلتا ہے پانی کا کون سا قطرہ تھا جس نے پتھر میں سوراخ کیا، لیکن مجموعی طور پر سارے قطرے مل کر اس پتھر میں سوراخ کر دیتے ہیں، اسی طرح اتباعِ سنت والے اعمال بظاہر دیکھنے میں بہت چھوٹے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کا مجموعہ مل کر سوراخ کر دیتا ہے اور پھر وہ دین دل میں جاگزیں ہوجاتا ہے۔ اس لیے ہمارے بزرگوں نے دوسرے راستوں کو چھوڑ کر اتباعِ سنت کا راستہ اپنایا ہے اور اسی کو اپنا مقصودِ زندگی بنایا ہے۔
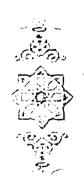
حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور ظاہری اور باطنی ترقی کی انتہاء

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنایا کرتے تھے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب میں نے علومِ ظاہری کی تکمیل کر لی، تو میں نے سنا کہ کچھ علومِ باطنہ بھی ہوتے ہیں جو صوفیائے کرام رحمہم اللہ علیہم کے پاس ہیں، میں نے سوچا کہ وہ بھی دیکھنے چاہییں کہ وہ کیا ہیں۔ چنانچہ میں

صوفیائے کرام کے پاس گیا، معلوم ہوا کہ صوفیاء میں چار قسم کے سلسلے ہیں، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور قادریہ۔ پھر ہر ایک کی الگ شاخیں ہیں، میں نے ہر ایک سلسلہ والوں کے پاس جاکر ان کے علوم حاصل کیے اور ہر ایک سلسلے والوں نے جو طریقے مقرر کیے ہوئے تھے ان طریقوں کو نہ صرف یہ کہ دیکھا، بلکہ ہر ایک طریقے کو برتا اور اس پر عمل کیا یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے ایک بہت اونچا مقام عطا فرمایا، پھر اس میں ترقی کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچا کہ علمائے ظاہر تو اسے کیا سمجھیں گے، علمائے باطن بھی اس کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی دعا

لیکن میں سب مقامات طے کرنے کے بعد ایک دعا کرتا ہوں اور جو شخص اس دعا پر آمین کہے گا، ان شاء اللہ اس کے حق میں بھی یہ دعا قبول ہوجائے گی۔ وہ دعا یہ ہے:

اے اللہ! اتباعِ سنت کی توفیق عطا فرمایئے، آمین۔

اے اللہ! مجھے اتباعِ سنت پر زندہ رکھیے، آمین۔

اے اللہ! مجھے اتباعِ سنت پر موت عطا فرمایئے، آمین۔

بہر حال! اذکار میں جو ماثور اذکار ہیں اور دعاؤں میں جو ماثور دعائیں ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہیں، ان میں جو نور اور برکت ہے، وہ نور اور برکت دوسرے اذکار میں نہیں۔

درودِ ماثور پڑھنے چاہییں

آج لوگ دوسرے درود کی تلاش میں رہتے ہیں، حالانکہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درود شریف کے بہت سے طریقے بتادیے، جس پر علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے پوری کتاب لکھ دی اس کتاب کا نام ''القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع'' ہے۔ اس کتاب میں درود شریف کے سینکڑوں الفاظ جمع فرمادیے، جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہیں، اس لیے اپنی طرف سے درود شریف گھڑنے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا ماثور اذکار اور ماثور دعائیں اور ماثور درود ہی پڑھنے چاہییں، ان میں برکت ہے۔

مبتدی کو ذکر اور منتہی کو تلاوت

آگے حضرت والا نے فرمایا:

مبتدی کے لیے ذکر سے زیادہ شغف مناسب ہے، منتہی کے لیے تلاوت ہے۔ (انفاسِ عیسیٰ ص ۶۷)

ابتدا میں چونکہ مبتدی کا دل نہیں لگتا، اس کے لیے ذکر کرنا مناسب ہے، اس لیے کہ اس میں اس کا دل لگ جاتا ہے، لیکن منتہی کے لیے تلاوت مناسب ہے کہ وہ جتنی تلاوت کی کثرت کرے، اتنا ہی اس کے لیے فائدہ مند ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

سنّت کا مذاق نہ اڑائیں

(اصلاحی خطبات ج ۷ ص ۱۷۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سنت کا مذاق نہ اڑائیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا أَمَّا بَعْدُ!

عن ابی أیاس سلمة بن عمرو بن الأكوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رَجُلًا أَكَلَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ علیه وسلم بِشِمَالِهٖ، فَقَالَ "کُل بیمینك" قال: لا أستطیع، قال "لَا اسْتَطَعْتَ"، مَا مَنَعَهٗ اِلَّا الْكِبْرُ، قال فما رفعه الی فیه۔ (۱)

(۱) صحیح مسلم ۱۵۹۹/۳ (۲۰۲۱)۔

ذرا سے تکبّر کا نتیجہ

صحابیِ رسول حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ اہلِ عرب میں بائیں ہاتھ سے کھانا عام تھا اور اکثر لوگ بائیں ہاتھ سے کھاتے تھے۔ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ وہ شخص بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنبیہ فرماتے ہوئے فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں زندگی گزارنے کے جو آداب سکھائے گئے ہیں، ان میں داہنی طرف کو بائیں طرف پر ترجیح حاصل ہے۔ اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر معاملے میں داہنی طرف کو بائیں طرف پر ترجیح دیا کرتے تھے[1]۔ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بتایا ہوا ادب ہے۔ چاہے اس کو کوئی مانے یا نہ مانے، چاہے کسی کی عقل اس کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔

بہرحال! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حکم سن کر اس شخص نے جواب میں کہا کہ میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا اور اس جواب دینے کا سبب تکبّر تھا اور اس نے سوچا کہ مجھے اس بات پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ٹوک کر میری توہین کی ہے۔ اس لیے میں حکم نہیں مانتا۔ جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آئندہ تم کبھی دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکو گے، اس کے بعد ساری عمر وہ شخص اپنا داہنا ہاتھ منہ تک نہیں لے جا سکا۔

---

(۱) ملاحظہ ہو صحیح البخاری ۱/۴۵ (۱۶۸).

کاش! ہم صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانے میں ہوتے

اس حدیث میں ہمارے لیے کئی عظیم الشان سبق ہیں۔ پہلا سبق یہ ہے کہ بسا اوقات نادانی اور بیوقوفی کی وجہ سے ہمارے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوتے، تو کتنا اچھا ہوتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار نصیب ہوا۔ اگر ہمیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اور دیدار نصیب ہوجاتا اور ہم بھی صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی فہرست میں شامل ہوجاتے، تو کتنی اچھی بات تھی اور کبھی کبھی یہ خیال شکوے کی صورت اختیار کرلیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس زمانے میں کیوں پیدا نہیں فرمایا، آج ہمارے لیے پندرہویں صدی میں دین پر چلنا مشکل ہوگیا ہے ماحول خراب ہوگیا ہے۔ اگر اس زمانے میں ہوتے، تو چونکہ ماحول بنا ہوا ہوتا اس لیے اس ماحول میں دین پر چلنا آسان ہوتا۔

اللہ تعالیٰ ظرف کے مطابق دیتے ہیں

ہمارے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو جو سعادت عطا فرماتے ہیں، اس کے ظرف کے مطابق عطا فرماتے ہیں۔ یہ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا ظرف تھا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت سے استفادہ بھی کیا اور اس کا حق بھی ادا کیا۔ وہ زمانہ بے شک بڑی سعادتوں کا زمانہ تھا، لیکن ساتھ میں بڑے خطرے کا زمانہ بھی تھا۔ آج ہمارے پاس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو ارشادات ہیں، وہ واسطہ در واسطہ ہوکر ہم تک پہنچے ہیں، اس لیے علمائے کرام نے فرمایا کہ جو شخص خبرِ واحد سے ثابت شدہ بات کا

انکار کردے اور یہ کہے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا، تو ایسا شخص سخت گنہگار ہوگا، لیکن کافر نہیں ہوگا[1]، منافق نہیں ہوگا اور اس زمانے میں اگر کسی شخص نے کوئی کلمہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے براہِ راست سنا اور پھر اس کا انکار کیا، تو انکار کرتے ہی کفر میں داخل ہوگیا اور حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو ایسی ایسی آزمائشیں پیش آئی ہیں کہ یہ انہی کا ظرف تھا کہ ان آزمائشوں کو جھیل گئے۔ خدا جانے اگر ہم ان کی جگہ ہوتے، تو نہ جانے کس شمار میں ہوتے۔

اس ماحول میں جس طرح حضرت سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر فاروق، سیدنا عثمانِ غنی اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم پیدا ہوئے، اسی ماحول میں ابوجہل اور ابولہب بھی پیدا ہوئے۔ عبد اللہ بن اُبی اور دوسرے منافقین بھی پیدا ہوئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جس شخص کے حق میں جو چیز مقدر فرمائی ہے وہی چیز اس کے حق میں بہتر ہے۔ لہٰذا یہ تمنا کرنا کہ کاش ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پیدا ہوتے یہ نادانی کی تمنا ہے اور ۔معاذ اللہ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض ہے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ جتنی نعمت عطا فرماتے ہیں وہ اس کے ظرف کے مطابق عطا فرماتے ہیں۔

آپ نے اس کو بددعا کیوں دی؟

ایک سوال ذہنوں میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کی شان تو یہ تھی کہ کسی سے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہیں لیا اور حتی الامکان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے لیے دعا ہی فرمائی

---

(۱) ملاحظہ ہو الفتاوی الهندیة ۲/۲۶۵ مطلب فی موجبات الکفر۔ طبع دار الفکر۔

بد دعا نہیں فرمائی۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس شخص سے وقتی طور پر غلطی ہوگئی اور اس نے یہ کہہ دیا کہ میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس کے لیے بد دعا کیوں فرمادی کہ آئندہ تمہیں کبھی منہ تک ہاتھ اُٹھانے کی توفیق نہ ہو۔ علمائے کرام نے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ اس شخص نے تکبّر کی وجہ سے یہ جھوٹ بول دیا کہ میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا، حالانکہ وہ کھا سکتا تھا اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا اس طرح تکبّر کی وجہ سے جھوٹ بول کر مقابلہ کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا بڑا گناہ کہ اس کی وجہ سے آدمی جہنم کا مستحق ہوجاتا ہے، لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر شفقت فرماتے ہوئے اور اس کو جہنم کے عذاب سے بچانے کے لیے فوراً اس کے حق میں بد دعا فرمادی تاکہ اس گناہ پر جو عذاب اس کو ملنا ہے وہ دنیا ہی کے اندر مل جائے اور اس دنیاوی عذاب کے نتیجے میں ایک طرف تو وہ جہنم کے عذاب سے بچ جائے اور دوسری طرف اس کو عذاب کے بعد عملِ صالح کی توفیق ہوجائے۔ اس حکمت کی وجہ سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں بد دعا فرمائی۔

بزرگوں کی مختلف شانیں

اسی طرح بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ سے منقول ہے کہ ان کو کسی نے تکلیف دی اور ستایا، تو انہوں نے اسی وقت بدلہ لے لیا۔ وہ حضرات اسی شفقت کی وجہ سے بدلہ لیتے ہیں، اس لیے کہ اگر وہ بدلہ نہ لیں، تو اس ستانے والے اور تکلیف دینے والے پر اس سے زیادہ بڑا عذاب نازل ہونے کا اندیشہ ہے۔ ایک صاحب ایک بزرگ کے مرید تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شیخ سے کہا

کہ حضرت! ہم نے سنا ہے کہ بزرگان دین اور اولیاء اللہ کے رنگ الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان کی شانیں الگ الگ ہوتی ہیں، کسی کی کچھ شان ہے، کسی کی کچھ شان ہے، میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کی شانیں کس قسم کی ہوتی ہیں؟ ان کے شیخ نے فرمایا کہ تم اس کے پیچھے مت پڑو۔ اپنے کام میں لگے رہو۔ تم ان کی شانوں کا کہاں ادراک کر سکتے ہو۔ مرید نے کہا کہ آپ کی بات درست ہے، لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے ذرا یہ پتہ لگ جائے کہ بزرگوں کے کیا مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ شیخ نے فرمایا کہ اگر تمہیں دیکھنے پر اصرار ہی ہے، تو ایسا کرو کہ فلاں مسجد میں چلے جاؤ، وہاں تمہیں تین بزرگ ذکر کرتے ہوئے، اللہ اللہ کرتے ہوئے ملیں گے۔ تم جا کر ان تینوں کی کمر میں ایک ایک مُکّا مار دینا اور پھر جو کچھ وہ بزرگ کریں وہ مجھے آ کر بتا دینا۔

چنانچہ یہ صاحب اس مسجد میں گئے، تو وہاں دیکھا کہ واقعتاً تین بزرگ ذکر میں مشغول ہیں۔ شیخ کے حکم کے مطابق انہوں نے جا کر ایک بزرگ کے پیچھے ایک مُکّا مارا، تو انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کس نے مُکّا مارا، بلکہ اپنے ذکر میں مشغول رہے۔ اس کے بعد جب دوسرے بزرگ کو مُکّا مارا، تو وہ پیچھے مڑے اور ان مُکّا مارنے والے کا ہاتھ سہلانے لگے اور فرمانے لگے کہ بھائی تمہیں تکلیف تو نہیں ہوئی؟ چوٹ تو نہیں لگی؟ اور جب تیسرے بزرگ کے مُکّا مارا، تو انہوں نے پیچھے مڑ کر اتنی ہی زور سے ان کو مُکّا مار دیا اور پھر اپنے ذکر میں مشغول ہو گئے۔

یہ صاحب اپنے شیخ کے پاس واپس آ گئے اور ان سے جا کر عرض کیا کہ حضرت! اس طرح قصہ پیش آیا کہ جب پہلے بزرگ کو مُکّا مارا، تو انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور جب دوسرے کو مارا، تو وہ اُلٹا میرے ہی ہاتھ کو سہلانے

لگے اور جب تیسرے بزرگ کو مارا، تو انہوں نے مجھ سے بدلہ لیا اور مجھے بھی ایک مُکّا ماردیا۔ شیخ نے فرمایا کہ تم یہ پوچھ رہے تھے کہ بزرگوں کی مختلف شانیں کیا ہوتی ہیں، تو یہ تین شانیں تم نے علیحدہ علیحدہ دیکھ لی ہیں۔ ایک شان وہ ہے جو پہلے بزرگ میں تھی۔ انہوں نے یہ سوچا کہ اللہ کے ذکر میں مشغول ہوں اور اس ذکر میں جو لذت اور مزہ آرہا ہے، اس کو چھوڑ کر میں پیچھے کیوں دیکھوں کہ کون مُکّا مار رہا ہے اور اپنا وقت کیوں ضائع کروں۔ دوسرے بزرگ پر مخلوق پر شفقت اور رحمت کی شان غالب تھی اس لیے انہوں نے نہ صرف یہ کہ بدلہ نہیں لیا، بلکہ اس مارنے والے کے ہاتھ کو دیکھ رہے ہیں کہ تمہارے ہاتھ میں کوئی چوٹ تو نہیں لگی اور تیسرے بزرگ نے جلدی سے بدلہ اس لیے لے لیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ان کا بدلہ لینے کے لیے اس پر اپنا عذاب نازل فرمادیں اور اس بدلہ لینے سے وہ آخرت کے بدلے سے بھی بچ جائے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس شخص کے حق میں بد دعا فرما کر اس شخص کو بڑے عذاب سے بچالیا۔

ہر اچھا کام داہنی طرف سے شروع کریں

بہرحال! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کی تحقیر سے بچنا چاہیے۔ آج کل تو لوگ اس قسم کی سنتوں کے بارے میں حقارت آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میاں! ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں کیا رکھا ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور بائیں ہاتھ سے نہ کھاؤ۔ یاد رکھیے! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی سنت چھوٹی نہیں، چاہے بظاہر دیکھنے میں وہ چھوٹی معلوم ہوتی ہو۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کا ہر حکم، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر سنت، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر عمل اس دنیا کے لیے نمونہ ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر اچھا کام داہنی طرف سے شروع کرنے کا حکم دیا ہے۔ مثلاً داہنے ہاتھ سے کھاؤ، داہنے ہاتھ سے پیو، اگر مجمع میں کوئی چیز تقسیم کرنی ہے، تو داہنی طرف سے شروع کرو اور ایک حدیث میں ہے کہ

”كانَ رَسُوْلُ اللهُ ﷺ يُعْجِبُه التيمُّن فِي تنعُّله وترجُّله، وفي طُهوره، وفي شأنِه كلِّه“(۱)

یعنی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر چیز میں داہنے ہاتھ سے ابتدا کرنے کو پسند فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ لباس پہننے کے بارے میں فرمایا کہ پہلے داہنی آستین میں ہاتھ ڈالو پھر بائیں آستین میں ہاتھ ڈالو۔ جوتا پہننا ہے، تو پہلے دایاں جوتا پہنو اور پھر بایاں جوتا پہنو، بالوں میں کنگھی کرنی ہے، تو پہلے دائیں طرف کنگھی کرو اور پھر بائیں طرف کرو۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالنا ہے، تو پہلے داہنی آنکھ میں سرمہ ڈالو، پھر بائیں آنکھ میں سرمہ ڈالو۔ ہاتھ دھوتے وقت پہلے دایاں ہاتھ دھو، پھر بایاں ہاتھ دھو۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر چیز میں دائیں طرف سے شروع کرنے کا حکم فرمایا۔

ایک وقت میں دو سنتوں کا اجتماع

بظاہر یہ معمولی سنتیں ہیں، لیکن اگر انسان ان سنتوں پر عمل کرلے تو ہر عمل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبوبیت کا پروانہ مل رہا ہے اور اس پر عظیم اجر وثواب مرتب ہو رہا ہے۔ اگر انسان محض غفلت اور لاپرواہی سے ان سنتوں کو چھوڑ

(۱) صحيح البخاری ۱/۴۵ (۱۶۸).

دے اور ان پر عمل نہ کرے، تو اس سے زیادہ ناقدری اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس لیے اہتمام سے ہر کام انسان دائیں طرف سے شروع کرے۔ حتیٰ کہ بزرگوں نے یہاں تک فرمایا ہے کہ دیکھیے! کہ یہ دو سنتیں ہیں؛ ایک یہ کہ جب آدمی مسجد سے باہر نکلے، تو پہلے بایاں پیر نکالے اور پھر دایاں پیر نکالے اور دوسری سنت یہ ہے کہ جب جوتا پہنے، تو پہلے دائیں پاؤں میں ڈالے پھر بائیں پاؤں میں ڈالے، تو ان دونوں سنتوں کو اس طرح جمع کرے کہ مسجد سے پہلے بایاں پیر نکال کر جوتے کے اوپر رکھ لے اور پھر دایاں پیر نکال کر جوتا پہنے اور پھر بائیں پیر میں جوتا پہنے، اس طرح دو سنتوں پر عمل ہو جائے گا۔

ہر سنت عظیم ہے

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے یہاں اس کا امتیاز نہیں تھا کہ کون سی سنت چھوٹی ہے اور کون سی سنت بڑی ہے، بلکہ ان کے نزدیک ہر سنت عظیم تھی۔ اس لیے وہ تمام سنتوں پر عمل کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذرا سا اہتمام کرنے سے انسان کے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا ذخیرہ جمع ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے سنتوں پر عمل کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

مغربی تہذیب کی ہر چیز اُلٹی ہے

حضرت قاری محمد طیّب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ نئی مغربی تہذیب میں پہلی تہذیب کے مقابلے میں ہر چیز اُلٹی ہے اور پھر مزاحاً فرماتے کہ پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوتا تھا اور اب بلب کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے۔ اس مغربی تہذیب نے ہماری قدروں کو باقاعدہ اہتمام کرکے بدلا ہے، چنانچہ

آج کل کی تہذیب یہ ہے کہ کھانا کھاتے وقت کانٹا اور چھری دائیں ہاتھ میں پکڑی جائیں اور بائیں ہاتھ سے کھایا جائے۔

آج سے کئی سال پہلے میں ہوائی جہاز میں سفر کر رہا تھا۔ میری ساتھ والی سیٹ پر ایک اور صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ سفر کے دوران ان سے ذرا بے تکلفی بھی ہوگئی تھی، جب کھانا آیا، تو ان صاحب نے حسبِ معمول دائیں ہاتھ سے چھری لی اور بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کر دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم نے ہر چیز میں انگریز کی تقلید شروع کر رکھی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ آپ دائیں ہاتھ سے کھاتے تھے، اس لیے اگر آپ دائیں ہاتھ سے کھالیں، تو آپ کا یہی عمل موجبِ ثواب بن جائے گا۔ وہ جواب میں کہنے لگے کہ اصل میں ہماری قوم اسی وجہ سے پیچھے رہ گئی ہے کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان مولویوں نے ان چیزوں کے اندر ہماری قوم کو پھنسا دیا اور ترقی کا راستہ روک دیا اور جو بڑے بڑے کام تھے، ان میں ہم پیچھے رہ گئے۔

مغربی دنیا پھر کیوں ترقی کر رہی ہے؟

میں نے ان سے عرض کیا کہ ماشاء اللہ آپ تو مدتِ دراز سے اس ترقی یافتہ طریقے سے کھا رہے ہیں۔ اس ترقی یافتہ طریقے سے کھانے سے آپ کو کتنی ترقی حاصل ہوئی؟ اور آپ کتنے آگے بڑھ گئے؟ اور کتنے لوگوں پر آپ کو فوقیت حاصل ہوگئی؟ اس پر وہ خاموش ہوگئے۔ پھر میں نے ان کو سمجھایا کہ مسلمانوں کی ترقی اور سربلندی تو نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقوں پر

عمل کرنے میں ہے دوسرے طریقوں پر عمل کرنے میں نہیں۔ اگر مسلمان دوسرے طریقوں کو اختیار کرے گا، تو وہ سربلند نہیں ہوسکتا۔ ان صاحب نے کہا کہ آپ نے عجیب بات کہی کہ ترقی سنتوں پر عمل کرنے میں ہے۔ یہ ساری مغربی قومیں کتنی ترقی کررہی ہیں، حالانکہ وہ قومیں اُلٹے ہاتھ سے کھاتی ہیں۔ سارے کام سنت اور شریعت کے خلاف کرتی ہیں۔ گناہوں کے اندر بُری طرح مبتلا ہیں۔ فسق و فجور کے کام کرتی ہیں، شرابیں پیتی ہیں، جوا کھیلتی ہیں، اس کے باوجود وہ قومیں ترقی کررہی ہیں اور پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں، لہٰذا آپ جو یہ کہتے ہیں کہ سنتوں پر عمل کرنے سے ترقی ہوتی ہے، لیکن ہمیں نظر آرہا ہے کہ سنتوں کے خلاف اور شریعت کے خلاف کام کرنے سے دنیا میں ترقی ہورہی ہے۔

بوجھ بجھکڑ کا قصہ

میں نے ان سے کہا کہ آپ نے یہ جو فرمایا کہ مغربی قومیں سنتوں کو چھوڑنے کے باوجود ترقی کررہی ہیں، لہٰذا ہم بھی اسی طرح ترقی کرسکتے ہیں، اس پر میں نے ان کو ایک قصہ سنایا۔

وہ یہ کہ ایک گاؤں میں ایک شخص کھجور کے درخت پر چڑھ گیا۔ کسی طرح چڑھ تو گیا لیکن درخت سے اُترا نہیں جارہا تھا، اب اس نے اوپر سے گاؤں والوں کو آواز دی کہ مجھے اُتارو۔ اب لوگ جمع ہوگئے اور آپس میں مشورہ کیا کہ کس طرح اس کو درخت سے اُتاریں۔ کسی کی سمجھ میں کوئی طریقہ نہیں آرہا تھا۔ اس زمانے میں گاؤں کے اندر ایک بوجھ بجھکڑ ہوتا تھا، جو سب سے زیادہ عقلمند

سمجھا جاتا تھا۔ گاؤں والے اس کے پاس پہنچے اور اس کو جا کر سارا قصہ سنایا کہ اس طرح ایک آدمی درخت پر چڑھ گیا ہے اس کو کس طرح اُتاریں؟ اس بوجھ بجھکڑ نے کہا کہ یہ تو کوئی مشکل نہیں ایسا کرو کہ ایک رسّا لاؤ اور جب رسّا لایا گیا، تو اس نے کہا کہ اب رسّا اس شخص کی طرف پھینکو اور اس شخص سے کہا کہ تم اس رسّے کو اپنی کمر سے مضبوطی سے باندھ لو۔ اس نے جب رسّا باندھ لیا، تو اب لوگوں سے کہا: تم اس رسّے کو زور سے کھینچو۔ جب لوگوں نے رسّا کھینچا، تو وہ شخص درخت سے نیچے گرا اور مرگیا۔ لوگوں نے اس بوجھ بجھکڑ سے کہا کہ آپ نے یہ کیسی ترکیب بتائی یہ تو مرگیا۔ اس نے جواب دیا کہ معلوم نہیں کیوں مرگیا۔ شاید اس کی قضا ہی آگئی تھی اس لیے مرگیا، ورنہ میں نے اس طریقے سے بے شمار لوگوں کو کنویں سے نکالا ہے اور وہ صحیح سالم نکل آئے۔

مسلمانوں کی ترقی کا راستہ صرف ایک ہے

اس بوجھ بجھکڑ نے کھجور کے درخت پر چڑھے شخص کو کنویں کے اندر گرے ہوئے شخص پر قیاس کیا۔ یہی قیاس یہاں بھی کیا جارہا ہے اور یہ کہا جارہا ہے کہ چونکہ غیر مسلم قوتیں فسق و فجور اور معصیت اور نافرمانی کے ذریعے ترقی کررہی ہیں، اسی طرح ہم بھی نافرمانیوں کے ساتھ ترقی کرجائیں گے۔ یہ قیاس درست نہیں۔ یاد رکھیں! جس قوم کا نام مسلمان ہے اور جو کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پر ایمان لائی ہے وہ اگرچہ سر سے لے کر پاؤں تک ان مغربی اقوام کا طریقہ اپنالے اور اپنا سب کچھ بدل دے تب بھی ساری زندگی کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔ ہاں اگر وہ ترقی کرنا چاہتی ہے، تو ایک مرتبہ ـ معاذ اللہ ـ اسلام

کے چولے کو اپنے جسم سے اُتار دے اور یہ کہہ دے کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ پھر ان کے طریقوں کو اختیار کرلے تو اللہ تعالیٰ انہیں بھی دنیا میں ترقی دے دیں گے، لیکن مسلمان کے لیے وہ ضابطہ اور قانون نہیں ہے جو کافروں کے لیے ہے۔ مسلمان کے لیے دنیا میں ترقی کرنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو صرف حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی ترقی کا کوئی راستہ نہیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی اختیار کرلو

بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ مغربی اقوام جو کام کررہی ہیں وہ قابلِ تقلید ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت (معاذ اللہ) ایک معمولی سی چیز ہے اور قابلِ تقلید نہیں ہے، بلکہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ حالانکہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر تم نے دائیں ہاتھ سے کھانا کھالیا، تو تمہاری ترقی میں کون سی رکاوٹ آجائے گی، لیکن ہمارے دل و دماغ پر غلامی مسلط ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی چھوڑ کر ان کی غلامی اختیار کرلی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غلامی کے اندر جی رہے ہیں اور غلامی کے اندر مر رہے ہیں اور اب اس غلامی سے نکلنا بھی چاہتے ہیں، تو نکلا نہیں جاتا۔ نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا اور سچی بات یہ ہے کہ اس وقت تک اس غلامی سے نہیں نکل سکتے اور دنیا میں عزت اور سربلندی حاصل نہیں کرسکتے جب تک ایک مرتبہ صحیح معنیٰ میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی قبول نہیں کرلیں گے اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ قدم پر نہیں چلیں گے۔

سنت کے مذاق سے کفر کا اندیشہ ہے

البتہ یہ بات ضروری ہے کہ سنت صرف انہی چیزوں کا نام نہیں کہ آدمی دائیں ہاتھ سے کھانا کھالے اور دائیں طرف سے کپڑا پہن لے، بلکہ زندگی کے ہر شعبے سے سنتوں کا تعلق ہے۔ ان سنتوں میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق بھی داخل ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے ساتھ کس طرح معاملہ فرماتے تھے؟ کس طرح خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرتے تھے؟ کس طرح لوگوں کی تکلیفوں پر صبر فرماتے تھے۔ یہ سب باتیں بھی ان سنتوں کا حصہ ہیں، لیکن کوئی سنت ایسی نہیں ہے جس کو چھوٹا سمجھ کر اس کی تحقیر کی جائے۔ دیکھیے! فرض کریں کہ اگر کسی شخص کو کسی سنت پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہو رہی ہے، تو کم از کم اس شخص کو بہتر سمجھے جس کو اس سنت پر عمل کرنے کی توفیق ہو رہی ہے، لیکن اس سنت کا مذاق اُڑانا، اس کی تحقیر کرنا، اس کو بُرا قرار دینا، اس پر آواز کسنا، ان افعال سے اس شخص پر کفر کا اندیشہ ہے[1]۔ اس لیے ادنیٰ سے ادنیٰ سنت کے بارے میں بھی کبھی تحقیر اور تذلیل کا کلمہ زبان سے نہیں نکالنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

اگلی حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی تعلیمات کی ایک مثال بیان فرماتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور اس کو قبول کرنے والوں کی مثال

عن ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ قال: قال

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ۱/۴۷۴ طبع دار الفکر و الفتاوی الهندية ۲/۲۶۵.

رسول اللہ ﷺ: ”إِنَّ مَثَلِي وَمَثَل مَا بَعَثَنِيَ اللّٰه مِنَ الهُدٰى وَالعِلْم كَمَثَلِ غَيْثٍ اَصَابَ اَرْضًا، فَكَانَتْ مِنَّا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ... الخ (۱)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مثال اور جن تعلیمات کو میں دے کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک زمین پر بارش ہوئی اور وہ زمین تین قسم کی تھی:

① پہلی قسم کی زمین بڑی زرخیز تھی، جب اس پر بارش ہوئی، تو اس زمین نے پانی کو جذب کرلیا اور پھر اس زمین سے پھول پودے نکل آئے۔

② دوسری قسم کی زمین سخت تھی۔ جس کی وجہ سے پانی اندر جذب نہیں ہوا، بلکہ اوپر ہی جمع ہوگیا اور پھر اس پانی سے بہت سے انسانوں نے اور جانوروں نے فائدہ اُٹھایا۔

③ تیسری قسم کی زمین میں نہ تو اُگانے کی صلاحیت تھی اور نہ پانی کو اوپر جمع کرنے کی صلاحیت تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارش کا پانی اس پر برسا اور وہ پانی بے فائدہ چلا گیا۔

لوگوں کی تین قسمیں

پھر فرمایا کہ اسی طرح میں جو تعلیمات لے کر آیا ہوں وہ بارش کی طرح ہیں اور ان تعلیمات کو سننے والے تین طرح کے لوگ ہیں۔ بعض لوگ وہ ہیں

(۱) صحيح مسلم ١٧٨٧/٤ (٢٢٨٢) وصحيح البخاری ٢٧/١ (٧٩).

جنہوں نے ان تعلیمات کو اپنے اندر جذب کرکے اس سے فائدہ اُٹھایا اور اس کے نتیجے میں ان کے اعمال اور اخلاق درست ہوگئے اور وہ اچھے انسان بن گئے۔ اور لوگوں کے لیے ایک بہترین نمونہ بن گئے اور دوسرے لوگ وہ ہیں جنہوں نے میری تعلیمات کو حاصل کیا پھر خود بھی اس سے فائدہ اُٹھایا اور دوسرے لوگوں کے فائدے کے لیے اس کو جمع کرلیا اور پھر وہ ان تعلیمات کو تعلیم، تدریس، وعظ اور دعوت کے ذریعے دوسروں تک پہنچارہے ہیں۔ تیسرے قسم کے لوگ وہ ہیں جنہوں نے میری تعلیمات کو ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا، نہ ان سے خود فائدہ اُٹھایا اور نہ ان کے ذریعے دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔

اس حدیث کے ذریعے اس بات کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ میری تعلیمات کے بارے میں دو باتوں میں سے ایک بات اختیار کرلو یا تو خود اس سے فائدہ اُٹھاؤ اور دوسروں کو بھی اس کے ذریعے فائدہ پہنچاؤ یا کم ازکم خود اس سے فائدہ اُٹھالو۔ اس لیے کہ تیسرا راستہ بربادی کا ہے اور وہ یہ ہے کہ میری تعلیمات سن کر اس کو پسِ پشت ڈال دو۔ اسی بات کو ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا کہا:

"كُنْ عَالِمًا اَوْ مُتَعَلِّمًا وَلَاتَكُنْ ثَالِثًا فَتَهْلِكَ"(۱)

---

(۱) عن عبدالرحمن بن ابی بکرة عن ابیه رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: "اغد عالما او متعلما او مستمعا او محبا ولا تكن الخامس فتهلك". اخرجه البزار فی مسنده ۹/۹۴ (۳۶۲۶). وذكره الهيثمی فی "المجمع" ۱/۳۲۸ (۴۹۵)-طبع دار الفكر-وقال رواه الطبرانی فی "الثلاثة" والبزار ورجاله موثقون. فليراجع للتفصيل "كشف الخفاء" للعجلونی ۱/۱۴۸ (۴۳۷) طبع مكتبة القدسی.

یعنی یا تو تم دین کے عالم بن جاؤ کہ خود بھی عمل کرو اور دوسروں تک پہنچاؤ یا اس علم دین کے سیکھنے والے بن جاؤ، کوئی تیسری صورت اختیار مت کرو ورنہ تم ہلاک اور برباد ہو جاؤ گے۔

دوسروں کو دین کی دعوت دیں

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں اور تعلیمات کے بارے میں ایک مسلمان کا اصل فریضہ یہ ہے کہ وہ خود اس پر عمل کرے اور دوسروں تک اس کو پہنچائے۔ اگر خود عمل کرلیا اور دوسروں تک نہیں پہنچایا، تو صرف یہ نہیں ہوگا کہ ناقص رہے گا، بلکہ اس نے خود جو نفع حاصل کیا ہے اس کے بھی ہاتھ سے جاتے رہنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے کہ اگر اس کا اپنا ماحول درست نہیں ہوگا، تو وہ کسی بھی وقت پھسل جائے گا۔ مثلاً ایک شخص دین دار بن گیا۔ نماز پابندی سے پڑھنے لگا۔ احکامات پر عمل کرنے لگا۔ گناہوں سے خود بچنے لگا، لیکن اپنے گھر والوں کی اصلاح کی فکر نہ کی اور گھر کے سب افراد اس کے خلاف ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا وہ ایک نہ ایک دن اس راستے سے پھسل جائے گا۔ اس لیے اس شخص کے ذمے فرض ہے کہ اپنے گھر والوں پر بھی محنت کرتا رہے، ان کو بھی محبت، پیار اور شفقت سے اس راستے کی طرف لانے کی کوشش کرتا رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عزیز و اقارب اور دوست و احباب تک بھی بات پہنچانے کی فکر کرتا رہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

"اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰةُ الْمُؤْمِنِ"(۱)

---

(۱) سنن ابی داود ۲۸۰/۴ (۴۹۱۸) وذکرہ الحافظ ابن حجر فی "بلوغ المرام" ص ۴۶۰ (۱۵۴۹) وقال: اخرجہ ابو داود باسناد حسن. طبع دار الفلق الریاض.

''ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے۔''

یعنی ایک مسلمان کو کسی غلطی کی طرف توجہ نہیں ہو رہی ہے، تو دوسرا مسلمان اس کو محبت اور پیار سے اس غلطی کی طرف توجہ دلائے۔ البتہ اس میں ایسا طریقہ اختیار نہ کرے جو دل آزار ہو۔ جس سے دل کو ٹھیس پہنچے اور جس سے نفرت پیدا ہو۔ بعض لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہم بہت سمجھاتے ہیں لیکن فائدہ نہیں ہوتا، تو یاد رکھیے! فائدہ ہونا یا نہ ہونا یہ تمہارا کام نہیں، تمہارا کام تو صرف اپنا فریضہ انجام دینا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھیے! ساڑھے نو سو سال تک تبلیغ کرتے رہے اور صرف اُنیس (۱۹) آدمی ایمان لائے۔ ان کا حوصلہ اور جگر گردہ دیکھیے کہ اس کے باوجود تبلیغ و دعوت کا کام نہیں چھوڑا۔

دعوت سے اکتانا نہیں چاہیے

لہٰذا ایک داعی اور مبلغ کا کام یہ ہے کہ وہ گھبرائے نہیں، اُکتائے نہیں، مایوس نہ ہو، بلکہ ان سے کہتا رہے اور اس کے درپے بھی نہ ہو کہ میری بات کا تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، لہٰذا ان کو کہنے سے کیا فائدہ؟ بلکہ موقع بموقع مختلف انداز سے اپنی بات پہنچاتا رہے۔ یاد رکھیے! اچھی بات کسی نہ کسی وقت ضرور اپنا اثر دکھاتی ہے اور اس کے اثرات ضرور ظاہر ہوتے ہیں اور اگر بالفرض کسی کے مقدر میں ہدایت نہیں ہے جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے مقدر میں ہدایت نہیں تھی، تو تمہارا اس کو دعوت دینا خود تمہارے حق میں فائدہ مند ہے اور اس پر تمہارے لیے اجر و ثواب لکھا جا رہا ہے اور خود بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں اور تعلیمات پر عمل کرنے کی کوشش کرتا رہے اور جو کوتاہی ہو جائے اس پر استغفار کرتا رہے اور معافی مانگتا رہے۔ ساری عمر یہ کرتا رہے، تو ان

شاء اللہ بیڑا پار ہو جائے گا۔ البتہ غفلت بہت بُری چیز ہے۔ اس غفلت سے بچنے کی کوشش کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی غفلت سے حفاظت فرمائے اور حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین
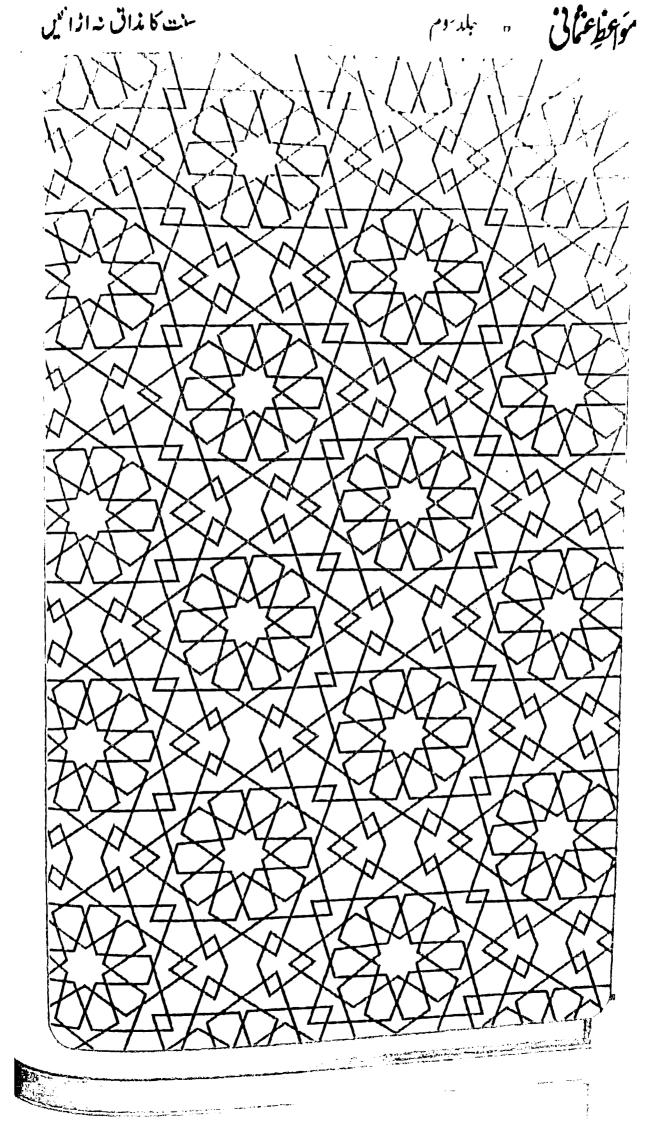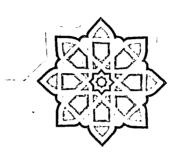
خندہ پیشانی سے ملنا سنّت ہے

(اصلاحی خطبات ج ۱۲ ص ۱۳۰)
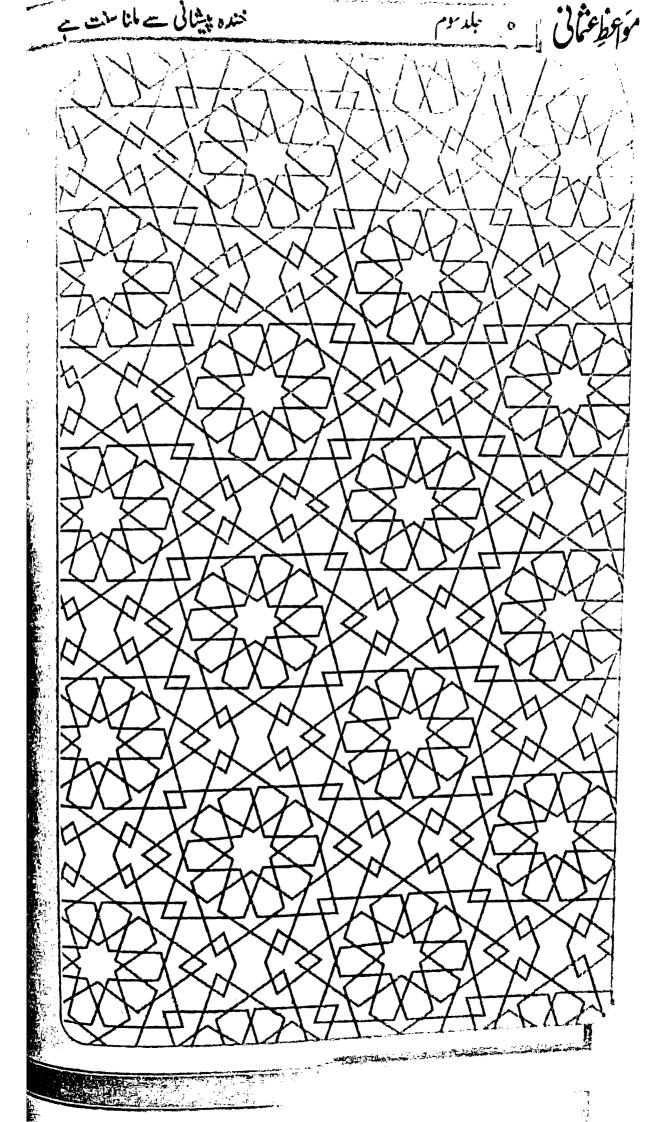
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خندہ پیشانی سے ملنا سنت ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔

أَمَّا بَعْدُ!

عن عطاء بن یسار رحمہ اللہ تعالیٰ قال: لَقِيتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما قُلْتُ أَخْبِرْنِي عَنْ صِفَةِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي التَّوْرَاةِ. قَالَ أَجَلْ، وَاللّٰهِ إِنَّـه لَمَوْصُوفٌ فِي التَّوْرَاةِ

بِبَعْضِ صِفَتِهِ فِي الْقُرْآنِ: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا، وَحِرْزًا لِلأُمِّيِّينَ، أَنْتَ عَبْدِي وَرَسُولِي سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ، لَيْسَ بِفَظٍّ وَلاَ غَلِيظٍ وَلاَ سَخَّابٍ فِي الأَسْوَاقِ، وَلاَ يَدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ، وَلَكِنْ يَعْفُو وَيَغْفِرُ، وَلَنْ يَقْبِضَهُ اللهُ حَتَّى يُقِيمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِأَنْ يَقُولُوا: لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللهُ. وَيَفْتَحُ بِهَا أَعْيُنًا عُمْيًا، وَآذَانًا صُمًّا، وَقُلُوبًا غُلْفًا.(۱)

۵ خندہ پیشانی سے پیش آنا خلقِ خدا کا حق ہے

یہ ایک طویل حدیث ہے اور اس پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”باب الانبساط الی الناس“ کا عنوان قائم فرمایا ہے، یعنی لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا اور لوگوں میں گھلے ملے رہنا۔

یہ کتاب امامِ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”الادب المفرد“ کے نام سے لکھی ہیں اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ احادیث جمع کی ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی آداب سے متعلق ہیں اور ان آداب کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قول وفعل سے تلقین فرمائی ہے، ان میں سے ایک ادب اور ایک سنت یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ گھلے ملے رہو اور ان کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آؤ۔

(۱) صحیح البخاری ۶۶/۳ (۲۱۲۵) و ۱۳۵/۶ (۴۸۳۸) والادب المفرد ص ۱۲۹ (۲۴۶) طبع مکتبۃ المعارف الریاض.

اور یہ خلقِ خدا کا حق ہے کہ جب اللہ کے کسی بندے سے ملاقات ہو تو اس سے آدمی خندہ پیشانی سے ملے، اپنے آپ کو بہ تکلف تند خو اور سخت مزاج نہ بنائے کہ لوگ قریب آتے ہوئے وحشت محسوس کریں، خواہ اللہ پاک نے دین کا یا دنیا کا بڑے سے بڑا مقام یا منصب عطا فرمایا ہو، وہ اس مقام کی وجہ سے اپنے آپ کو لوگوں سے کٹ کر سخت مزاج بن کر نہ بیٹھے، بلکہ گھلا ملا رہے، یہ انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی سنت ہے۔

اس سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کافروں کا اعتراض

بلکہ یہ وہ سنت ہے جس پر بعض کافروں نے اعتراض کیا تھا۔ قرانِ پاک میں آتا ہے:

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ(۱)

اور کفار کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی پھرتا ہے۔

کفار سمجھتے تھے کہ بازاروں میں پھرنا منصبِ پیغمبری کے خلاف ہے۔ یہ اس وجہ سے سمجھتے تھے کہ انہوں نے اپنے بادشاہوں اور سرداروں کو دیکھا تھا کہ جب وہ بادشاہت کے منصب پر فائز ہو جاتے تھے، تو عوام سے کٹ کر بیٹھ جاتے تھے، عام آدمی کی طرح بازاروں میں نہیں آتے تھے، بلکہ خاص شاہانہ

---

(۱) سورۃ الفرقان آیت (۷).

شان و شوکت سے آتے تھے، تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ پیغمبری اتنا بڑا اور اونچا مقام ہے کہ بادشاہت تو اس کے مقابلے میں گرد ہے۔

لیکن قرآن کریم نے ان کے اس خیالِ باطل کی تردید کی، اس لیے کہ پیغمبر تو آتے ہی تمہارے اصلاح کے لیے ہیں، لہٰذا دنیا کا بھی ہر کام عام انسانوں میں گھل مل کر کر کے دکھاتے ہیں اور اس کے آداب اور اس کی شرائط بتاتے ہیں، نہ یہ کہ اپنے آپ کو عوام سے کاٹ کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ لہٰذا پیغمبروں کا بازاروں میں چلنا پھرنا اور ملنسار ہونا کوئی عیب کی بات نہیں۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص مقتداء (مقتداء کا مطلب ہوتا ہے جس کو دیکھ کر لوگ اطاعت کرتے ہوں) بننے کے بعد لوگوں سے کٹ کر بیٹھ گیا اور اپنی شان بنالی، تو اس کو اس طریق کی ہوا بھی نہیں لگی۔ فرمایا کہ ایک عام آدمی کی طرح رہو جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رہا کرتے تھے۔

ملنساری کا نرالا انداز

شمائلِ ترمذی میں روایت ہے:

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ مدینہ منورہ کے سوقِ مناقہ (سوق مناقہ مدینہ منورہ کا ایک بازار تھا جو اب حرم شریف کی توسیع والے حصے میں شامل ہو گیا ہے، میں نے بھی کسی زمانے میں اس کی زیارت کی تھی) میں تشریف لے گئے، تو وہاں ایک دیہاتی تھے حضرت زاہر رضی اللہ عنہ۔ دیہات سے سامان لاکر شہر میں بیچا کرتے تھے، سیاہ رنگ تھا اور غریب

آدمی تھے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت محبت فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چپکے سے ان کے پیچھے گئے اور ان کی کولی بھر لی اور ان کو پیچھے سے کمر سے پکڑ لیا، پھر آواز لگائی:

"مَنْ يَشْتَرِى هٰذَا الْعَبْدَ مِنِّى"

کون ہے جو مجھ سے یہ غلام خریدے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح فرمایا۔ جب حضرتِ زاہر رضی اللہ عنہ نے آواز پہچان لی، تو ان کی خوشی کی انتہاء نہ رہی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی پشت نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسدِ اطہر کے ساتھ اور ملانے کی کوشش کی اور میں نے کہا: یارسول اللہ! اگر آپ اس غلام کو فروخت کریں گے، تو بہت کم پیسے ملیں گے، اس لیے کہ سیاہ فام ہے اور معمولی درجے کا آدمی ہے، تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہیں اے زاہر! اللہ کے ہاں تمہاری قیمت بہت زیادہ ہے۔[1]

اس واقعے سے اندازہ لگائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بازار میں تشریف لے جا رہے ہیں اور کس طرح ایک معمولی درجے کے آدمی کے ساتھ مزاح فرما رہے ہیں۔ دیکھنے والا یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ کتنا اولوا العزم پیغمبر ہے کہ جس کے سامنے جبرئیل امین کے بھی پر جلتے ہیں۔ علیہ الصلاۃ والسلام۔
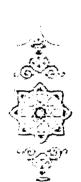
---

(۱) الشمائل المحمدیۃ للترمذی ص۱۴۳ (۲۲۹) باب ما جاء فی صفة مزاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم - طبع دار احیاء التراث العربی.

مفتیٔ اعظم یا عام راہ گیر؟

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے مطب میں بیٹھا ہوا تھا (حضرتؒ کا مطب اس وقت برنس روڈ پر ہوتا تھا اور ہمارا گھر بھی اس زمانے میں اس کے قریب ہی ہوا کرتا تھا) دیکھا کہ مطب کے سامنے فٹ پاتھ پر حضرت مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہاتھ میں پتیلی لیے ہوئے ایک عام آدمی کی طرح جا رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مفتی اعظم پاکستان جس کے چار دانگِ عالم میں علم و فضل اور تقویٰ کے گن گائے جاتے ہیں، وہ اس طرح ایک عام آدمی کی طرح ہاتھ میں پتیلی لے کر پھر رہا ہے، تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کیا ان کو دیکھ کر کوئی آدمی پہچان سکتا ہے کہ یہ مفتی اعظم پاکستان ہیں؟

پھر حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ خاص تعلق عطا فرما دیتے ہیں، وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں کے ساتھ اس طرح گھلا ملا کر رکھتا ہے کہ کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ کس مقام کے آدمی ہیں۔ اور یہی سنت ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی، نہ یہ کہ آدمی اپنی شان بنا کر رکھے اور لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے میں تکلف سے کام لے۔

مسجدِ نبوی سے مسجدِ قبا کی طرف عامیانہ چال

ایک مرتبہ جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجدِ نبوی سے پیدل چل کر ایسے ہی دوستانہ ملاقات کے لیے حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے

گئے، جو مسجدِ قباء کے قریب رہتے تھے، تقریبا تین میل کا فاصلہ ہے، ان کے گھر کے دروازے پر جا کر تین دفعہ آواز دی، شاید وہ صحابی کسی ایسی حالت میں تھے کہ جواب نہیں دے سکتے تھے[1] تو قرآنِ پاک کے حکم کے مطابق:

"وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا"[2].

اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ، تو واپس ہو جاؤ۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس مسجدِ نبوی تشریف لے آئے۔ کوئی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا، دوست سے ملنے گئے تھے، اپنی طرف سے دوستی کا حق ادا کیا، نہیں ہوئی ملاقات، واپس تشریف لے آئے۔

بعد میں حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا، تو وہ دوڑتے ہوئے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملے اور فدا ہونے لگے کہ میری کیا حیثیت کہ آپ میرے در پر تشریف لائے۔

شاید یہ مشکل ترین سنت ہو

ویسے تو حضورِ اقدس حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری سنتیں ایسی ہیں کہ ہر سنت پر انسان قربان ہو جائے، لیکن ایک سنت ترمذی شریف کی ایک روایت میں آئی ہے، میں سمجھتا ہوں شاید اس پر عمل کرنا مشکل ترین کام ہے، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا۔

---

(۱) المعجم الاوسط ۲۷٦/۷ (۷٤۸۹) وقال الهيثمى فى "المجمع" ۲٦٥/۱ (۱٤۳٥) ورجال الطبرانى موثقون إلا شيخ الطبرانى محمد بن شعيب فانى لم اعرفه. واصله فى صحيح مسلم ۲٦۹/۱ (۳٤۳).

(۲) سورۃ النور آیت (۲۸)۔

روایت میں آتا ہے کہ حضور اقدس سرورِ دو عالم ﷺ سے کوئی بات کرتا، تو آپ ﷺ اس وقت تک اس سے چہرہ نہیں پھیرتے تھے، جب تک وہ خود ہی چہرہ نہ پھیر لے، اپنی طرف سے بات کاٹتے نہیں تھے۔[1]

کہنے کو آسان بات ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب سینکڑوں آدمی رجوع کرتے ہوں، کوئی مسئلہ پوچھ رہا ہے، کوئی اپنی مشکل بیان کر رہا ہے، تو آدمی کا دل چاہتا ہے کہ میں جلدی جلدی ان سے نمٹ جاؤں۔

اور بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ وہ جب بولنے پر آ جائیں تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتے، تو ان کے ساتھ یہ معاملہ کرنا کہ جب تک وہ نہ رک جائے اس وقت تک اس سے نہ ہٹے، یہ بہت زیادہ مشکل کام ہے، لیکن نبی کریم ﷺ جو جہاد میں بھی مشغول ہیں، تبلیغ میں بھی مصروف ہیں، جو پوری دنیا کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے ہیں، ایک بڑھیا بھی راستے میں پکڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے، تو اس وقت تک اس سے نہیں پھرتے جب تک کہ پوری طرح اس کو مطمئن نہیں کر دیتے۔

مخلوق سے محبت کرنا، حقیقتاً اللہ سے محبت کرنا ہے

یہ صفت انسان کے اندر اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب مخلوق کے ساتھ اس وجہ سے محبت ہو کہ یہ میرے اللہ کی مخلوق ہے۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تمہیں

---

(۱) الزهد لابن المبارك ۱۳۲/۱ (۳۹۲) طبع دار الكتب العلمية وسنن الترمذي ۲۶۷/٤ (۲٤۹۰) وقال هذا حديث غريب.

اللہ تعالیٰ سے محبت ہے، تو تم اللہ تعالیٰ سے کیا محبت کرو گے، اللہ کی ذات کو نہ دیکھا ہے نہ سمجھا، نہ اس کو تم تصور میں لا سکتے ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر مجھ سے محبت ہے، تو میری مخلوق سے محبت کرو اور میری مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرو، تو اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک عکس تمہاری زندگی میں آئے گا، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اسی لیے امامِ بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ باب قائم کر رہے ہیں "باب الانبساط الی الناس" لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا اور ان کے ساتھ گھلا ملا رہنا اور اس طرح رہنا کَأَحَدٍ مِنَ النَّاسِ جیسے ایک آدمی ہوتا ہے، یعنی اپنا کوئی امتیاز پیدا نہ کرنا، یہ مقصود ہے اس باب کا۔ اس میں حدیث نقل کی ہے حضرتِ عطاء بن یسار تابعی رحمۃ اللہ علیہ کی، وہ کہتے ہیں کہ میری ملاقات ہوئی حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے۔

حضرتِ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی امتیازی خصوصیت

حضرتِ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی ہیں اور ان صحابہ کرام میں سے ہیں جو اپنی کثرتِ عبادت میں مشہور تھے، بہت عابد و زاہد بزرگ تھے اور انہوں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بھی کثیر تعداد میں روایت کی ہیں [1]۔

ایک خصوصیت ان کی یہ ہے کہ انہوں تورات، زبور، انجیل کا علم بھی کسی ذریعے سے حاصل کیا ہوا تھا، حالانکہ یہ کتابیں ایسی ہیں کہ یہودیوں اور

(۱) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب لابن عبد البر ۹۵٦/۳ طبع دار الجیل بیروت وسیر اعلام النبلاء للذہبی ۷۹/۳ تا ۹۳ طبع الرسالۃ۔

عیسائیوں نے اس میں بہت تحریفیں کر دی ہیں اور اپنی اصلی حالت میں برقرار نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کو اس نقطۂ نظر سے پڑھنا تاکہ ان کی حقیقت معلوم ہو اور یہودیوں اور عیسائیوں کو تبلیغ کرنے میں مدد ملے، تو پڑھنے کی اجازت ہے۔ تو حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کچھ توراۃ یہودیوں سے پڑھی ہوئی تھی۔

تورات میں اب بھی کتاب اللہ کا نور جھلکتا ہے

تورات اگرچہ مکمل طور پر پہلے کی طرح نہیں ہے، یہودیوں نے اس میں بہت زیادہ تحریفات کر دی ہیں، بہت سے حصے حذف کر دیے ہیں، نئے اضافے کر دیے، الفاظ کو بدل دیا، لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں پھر بھی کتاب اللہ کا نور جھلکتا ہے۔

اسی وجہ سے اس میں اب بھی جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات موجود ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تو اور بھی زیادہ واضح تھیں، اسی وجہ سے قرآن کریم کہتا ہے:

> ''یہ یہودی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح جانتے ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں''۔(۱)

اس لیے کہ تورات میں جو علامتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیان ہوئی تھیں کہ نبیِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی ایسی صفات کے حامل ہوں گے، ایسا ان کا حلیہ ہوگا، اس خاندان کے ہوں گے، اس شہر میں ہوں گے، یہ ساری تفصیل مذکور تھی، تو جو یہودی ان کتابوں کے عالم تھے وہ اپنی آنکھوں سے وہ علامتیں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(۱) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآئَهُمْ'' سورۃ البقرۃ آیت (۱۴۶)۔

ہیں دیکھتے تھے کہ پائی جا رہی ہیں، مگر اپنی ضد اور ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے مانتے نہیں تھے، تو حضرتِ عطاء بن یسار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میری ملاقات عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے ہوئی، تو میں نے ان سے کہا کہ آپ نے تورات پڑھی ہے، تورات میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات مذکور ہیں وہ ہمیں بتلائیں۔

بائبل سے قرآن تک

یہ کتابیں ان لوگوں نے اتنی بگاڑ دی ہیں، اس کے باوجود اس میں بعض ٹکڑے ایسے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے قرآنِ کریم کا ترجمہ ہے۔ان کی مشہور کتاب بائبل جس کو کتابِ مقدس بھی کہتے ہیں، اس کو یہودی بھی مانتے ہیں اور عیسائی بھی مانتے ہیں، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں آج بھی موجود ہیں، مجھے تورات کا ایک جملہ یاد آگیا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

> ”جو فاران سے طلوع ہوگا۔سلع میں بسنے والے گیت گائیں گے، قیدار کی بستیاں حمد کریں گی۔“(۱)

فاران نام ہے اس پہاڑ کا جس پر غارِ حرا واقع ہے۔اور سلع نام ہے اس پہاڑ کا جس کا ایک حصہ ثنیۃ الوداع ہے، جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے، تو اس پر بچیوں نے کھڑے ہو کر یہ ترانے پڑھے تھے:

---

(۱) کتاب استثناء، باب ۳۳ آیت ۲، کتاب یسعیاہ باب ۴۲ آیت ۹۔

"طلع البدر علينا من ثنيات الوداع"(۱)

اور قیدار نام ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صاحب زادے کا اور ان کی بستیاں عرب میں آباد ہیں، ان کی طرف اشارہ ہے کہ جب ان کی اولاد نبی آخر الزمان پیدا ہوں گے، تو ان کی بستیاں حمد کریں گی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات تورات میں بھی موجود ہیں

بہر حال حضرتِ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہاں میں بتاتا ہوں۔

"واللّٰهِ اِنَّه لَمَوْصُوْفٌ فِی التَّوْرَاةِ بِبَعْضِ صِفَته فی القرآن"

اللہ کی قسم حضور علیہ السلام کی بعض صفات تورات میں ایسی مذکور ہیں جو کہ قرآنِ پاک میں بھی مذکور ہیں۔

پھر انہوں نے قرآنِ پاک کی آیت تلاوت فرمائی:

"يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا"(۲)

اے نبی ہم نے آپ کو گواہ بنا کر اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔

(۱) دلائل النبوة للبيهقى ۵۰۷/۲ طبع دار الكتب العلمية، والسيرة النبوية لابن حبان ۱۳۹/۱ طبع دار الكتب الثقافيه بيروت.

(۲) سورة الاحزاب آيت (۴۵).

گواہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گواہی دیں گے کہ اس امت کو اللہ تعالیٰ کی توحید کا پیغام دیا گیا تھا تو کس نے اس پر عمل کیا اور کس نے نہیں کیا، اس بات کی گواہی دیں گے۔

وَ مُبَشِّرًا: اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو جنت کی خوش خبری دینے والے ہوں گے۔

وَّ نَذِیْرًا: اور جہنم سے ڈرانے والے ہوں گے۔

یہ آیت قرآنِ کریم کی تلاوت فرمائی، پھر آگے توراۃ کی عبارت پڑھ کر سنائی:

"وَحِرْزًا لِّلْاُمِّیِّیْنَ" یعنی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پڑھ لوگوں کے واسطے نجات دہندہ بن کر آئیں گے، اُمّی کا لفظ خاص طور سے لقب کے طور پر عربوں کے لیے بولا جاتا تھا، اس لیے کہ ان کے ہاں لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا تو یہ تورات میں تھا کہ امیوں کے نجات دہندہ بن کر آئیں گے۔ آگے فرمایا:

"وَأَنْتَ عَبْدِیْ وَرَسُوْلِیْ" یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت تورات میں فرما رہے ہیں کہ اے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! تم میرے بندے اور پیغمبر ہو۔

"وَ سَمَّیْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ" اور میں نے تمہارا نام متوکل رکھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والا، آگے صفات بیان فرمائیں کہ وہ نبی کیسا ہوگا؟ فرمایا:

"لَیْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِیْظٍ" وہ نہ تو سخت گو ہوگا اور نہ سخت طبیعت والا ہوگا۔

فظ کے معنی ہیں جس کی باتوں میں سختی ہو، کرختگی ہو۔

"وَلَا صَخَّابٍ فِی الْأَسْوَاقِ"

اور نہ بازاروں میں شور مچانے والا ہوگا۔

”وَلَا یَدْفَعُ بِالسَّیِّئَۃِ السَّیِّئَۃَ“

اور وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دے گا۔

”وَلٰکِنْ یَعْفُو وَیَغْفِر“

لیکن وہ معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہوگا۔

”وَلَنْ یَقْبِضَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی حَتّٰی یُقِیْمَ بِہِ الْمِلَّۃَ الْعَوْجَاءَ بِأَنْ یَقُوْلُوْا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ“

اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس کو اپنے پاس نہیں بلائیں گے جب تک ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کر دے، اس طرح کہ وہ کہہ دیں: لا الہ اللہ۔

”وَیَفْتَحُ بِھَا أَعْیُنًا عُمْیًا وَّ اٰذَانًا صُمًّا وَّ قُلُوْبًا غُلْفًا“

اور اس کلمہ توحید کے ذریعے ان کی اندھی آنکھیں، بہرے کان کھول دے گا اور وہ دل جن کے اوپر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ ان کے ذریعے کھل جائیں گے۔

اور یہ صفات تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ تورات میں آج بھی موجود ہیں۔

تورات کی عبرانی زبان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات

چونکہ محاورے ہر زبان میں مختلف ہوتے ہیں، تو اصل تورات عبرانی زبان میں تھی، اس کا ترجمہ جب اردو میں کرتے ہیں، تو اس طرح کرتے ہیں کہ

وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہ توڑے گا، ٹمٹماتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا۔[1]

اور عبرانی زبان کے محاورے میں اس طرح ترجمہ کرتے ہیں:

وہ کسی برائی کا بدلہ برائی سے نہ دے گا اور عفو و درگزر سے کام لے گا اور اس کے آگے پتھر کے بت اوندھے منہ گریں گے۔

اور یہ واقعہ اس وقت پیش آیا کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ معظمہ فتح کیا، تو پتھر کے بت جو خانہ کعبہ میں نصب تھے وہ اوندھے منہ گرے، یہ ساری تفصیل آئی ہے۔ میں نے جو اظہار الحق کا ترجمہ ''بائبل سے قرآن'' تک کے نام سے کیا ہے، اس کی تیسری جلد کا چھٹا باب انہی بشارتوں پر مشتمل ہے۔ میں نے دو کالم بنا کر ایک کالم میں بائبل کی عبارت اور دوسرے کالم میں وہ احادیث لکھی ہیں جن میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات آئی ہیں، پھر ان کا موازنہ کرکے دکھایا ہے کہ بائبل میں یہ آیا ہے اور قرآنِ کریم میں یا حدیث میں یہ آیا ہے، تو اتنی تحریفات کے باوجود آج بھی یہ صفات بائبل میں باقی ہیں۔

حدیثِ مذکور سے امامِ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غرض

لیکن جس غرض سے امامِ بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث لے کر آئے ہیں، وہ یہ ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو حالات پچھلی کتابوں میں بیان ہوئے وہ کیا تھے اور اس پیشینگوئی میں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امتیازی صفات ہیں اور سب سے

(۱) کتاب یسعیاہ: باب ۴۲، آیات ۱ تا ۸

زیادہ اہمیت کی حامل ہیں وہ کیا ہیں؟

وہ یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرخت نہیں ہیں اور ترش مزاج نہیں ہیں اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے۔ یہ سنت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے شریعت میں اجازت دی ہے کہ اگر کسی شخص نے تمہارے ساتھ برائی کی ہے، تو جتنی برائی کی ہے اتنا بدلہ لے سکتے ہو[1]، ایک طمانچہ مارا ہے، تو تم بھی اتنے ہی زور سے ایک طمانچہ مار سکتے ہو جتنے زور سے اس نے مارا، اس سے کم و بیش نہ ہو، اس کی اجازت ہے، لیکن اجازت ہونا اور بات ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہونا اور بات ہے۔ آپ نے ساری عمر کبھی کسی شخص سے اپنی ذات کا بدلہ نہیں لیا۔

برائی کا جواب حسنِ سلوک سے دینا

یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بڑی عظیم الشان سنت ہے۔ ہم نے سنتوں کو چند ظاہری سنتوں کی حد تک محدود کر لیا ہے۔ مثلاً سنت ہے کہ مسواک کرنا چاہیے، داڑھی رکھنی چاہیے اور ظاہری وضع قطع سنت کے مطابق کرنی چاہیے۔ یہ سب سنتیں ہیں، ان کی اہمیت سے بھی جو انکار کرے وہ سنتوں سے ناواقف ہے، لیکن سنتیں اس حد تک محدود نہیں، عام تعلقات اور معاملات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو طرزِ عمل تھا، وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ اور جس اہتمام کے ساتھ دوسری سنتوں پر عمل کرنے کا دل میں داعیہ پیدا ہوتا ہے، اس سے بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ اس سنت پر عمل کرنے کی فکر کرنی چاہیے کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیں، بلکہ برائی کا بدلہ حسنِ سلوک سے

(۱) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ" سورۃ البقرۃ آیت (۱۹٤)۔

دیں، سنت کے مطابق اچھائی سے دیں۔ اب ذرا ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم اس سنت پر کتنا عمل کر رہے ہیں؟ ہمارے ساتھ اگر کسی نے برائی کی ہے، تو کتنا انتقام کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے اور کتنی اس کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں؟ اگر غور کرو، تو معاشرے کے فساد کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کو چھوڑ دیا ہے۔ ہماری سوچ یہ ہوتی ہے کہ چونکہ اس نے میرے ساتھ برائی کی ہے، میں بھی اس سے برائی کروں گا، اس نے مجھے گالی دی ہے، میں بھی دوں گا، اس نے مجھے میری شادی پر کیا تحفہ دیا تھا میں بھی اتنا ہی دوں گا اور اس نے شادی پر تحفہ نہیں دیا تھا، تو میں بھی نہیں دوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سب کچھ بدلہ کرنے کے لیے ہوا، بدلہ کرنے والا درحقیقت صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہوتا۔ حدیث میں نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے:

"لیسَ الواصِلُ بالمُکافِیءِ، ولٰکِنِ الواصِلُ الذي إذا قُطِعَتْ رَحِمُهُ وَصَلَها"(١)

یعنی صرف بدلہ چکانے والا صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص ہے کہ دوسرا تو قطع رحمی کر رہا ہے اور رشتہ داری کے حقوق ادا نہیں کر رہا ہے اور یہ جواب میں قطع رحمی کرنے کی بجائے اس کے ساتھ اچھا معاملہ کر رہا ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عجیب واقعہ

ایک دن حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ گھر پر اپنے متوسلین اور خدام

(١) صحیح البخاری ٦/٨ (٥٩٩١).
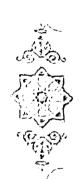
وغیرہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اچانک ایک صاحب آئے، جو حضرت کے کوئی رشتے دار تھے، داڑھی مونچھ صاف، عام آدمیوں کی طرح تھے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی انتہائی بے ادبانہ لہجے میں گالیاں دینا شروع کر دیں، جتنے الفاظ برائی کے ان کے منہ میں آئے کہتے ہی گئے۔ آگے سے حضرت ان کی ہر بات پر کہہ رہے ہیں کہ بھائی ہم سے غلطی ہوگئی ہے، تم ہمیں معاف کر دو، ہم ان شاء اللہ تلافی کر دیں گے، تمہارے پاؤں پکڑتے ہیں، معاف کردو۔ بہرحال! ان صاحب کا اس قدر شدید غصے کا عالم کہ دیکھنے والوں کو بھی برداشت نہ ہو، بالآخر ٹھنڈے ہو گئے۔

بعد میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ اس اللہ کے بندے کو کوئی غلط اطلاع مل گئی تھی، اس وجہ سے ان کو غصہ آ گیا تھا، اگر میں چاہتا تو ان کو جواب دے سکتا تھا اور بدلہ لے سکتا تھا، لیکن اس واسطے میں نے اس کو ٹھنڈا کیا کہ بہرحال یہ رشتے دار ہے اور رشتے داروں کے بھی حقوق ہوتے ہیں، تو رشتہ داروں کے ساتھ قطعِ تعلق کر لینا آسان ہے، لیکن تعلق جوڑ کر رکھنا یہ درحقیقت تعلیم ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور یہ ہے ''لا یدفع السیئة بالسیئة'' کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں، بلکہ پیار سے، محبت سے، شفقت سے اور خیر خواہی سے دو۔

مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم تھے، عجیب ولی اللہ بزرگ تھے، دار العلوم میں مہتمم کے معنی گویا کہ سب سے بڑے عہدے پر فائز، حضرت نے ایک گائے پال رکھی تھی، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اس کو لے کر آ رہے تھے کہ راستے میں مدرسے کا کوئی کام یاد آ گیا، اسی طرح مدرسے آئے

اور گائے مدرسے کے صحن میں درخت کے ساتھ باندھ کر دفتر میں چلے گئے۔

وہاں دیوبند کے ایک صاحب آئے اور چیخنا شروع کر دیا کہ یہ گائے کس کی بندھی ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ مہتمم صاحب کی ہے، تو کہنے لگے اچھا! مدرسہ مہتمم کا کمیلا بن گیا، ان کی گائے کا باڑا بن گیا اور مہتمم صاحب مدرسے کو اس طرح کھا رہے ہیں کہ مدرسے کے صحن کو انہوں نے اپنی گائے کا باڑا بنا لیا ہے۔ شور سن کر وہاں ایک مجمع اکٹھا ہو گیا، اب سراسر الزام سراسر ناانصافی، حضرت وہاں کام کر رہے تھے، اندر آواز آئی، تو باہر نکلے کہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ صاحب ناراض ہو رہے ہیں کہ مہتمم صاحب نے یہاں گائے باندھ دی، کہنے لگے ہاں واقعی یہ مدرسہ ہے اللہ کا، مجھے گائے یہاں نہیں باندھنی چاہیے تھی، یہ گائے میری ذاتی ہے اور یہ صحن مدرسے کا ہے، مجھ سے غلطی ہو گئی، میں اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں، اس غلطی کا کفارہ یہ ہے کہ میرا دل چاہ رہا ہے کہ یہ گائے آپ ہی لے جاؤ، وہ بھی اللہ کا بندہ ایسا تھا کہ لے کر چلتا بنا۔

اب آپ دیکھیے کہ سراسر ناانصافی اور ظلم ہے، اتنے بڑے ولی اللہ اور اتنے بڑے خادمِ دین کے اوپر ایک معمولی آدمی اتنی گرمی دکھا رہا ہے سب لوگوں کے سامنے، بجائے اس کے کہ اس سے بدلہ لیا جاتا، گائے بھی اس کو دے دی، یہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور "لَا يَدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ" پر عمل۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری سنتوں پر عمل ضروری ہے

درحقیقت سنت صرف یہی نہیں ہے کہ آسان آسان سنتوں پر عمل کر لیا جائے، بلکہ ہر ایک سنت پر عمل کی فکر کرنی چاہیے اور انسان اس سنت کے جتنا

قریب ہوگا، اتنا ہی معاشرے کا فساد ختم ہوگا، غور کر کے دیکھ لو اور تجربہ کر کے دیکھ لو کہ جو بگاڑ پھیلا ہوا ہے وہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے دور ہونے کا نتیجہ ہے۔

"ولٰکِنْ یَعْفُو وَیَغْفِر"

لیکن وہ معاف فرما دیتے ہیں اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔کوئی کچھ بھی کہہ دے، لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جواب نہیں دیتے۔ اور جو اللہ کے ولی ہوتے ہیں، وہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبع ہوتے ہیں اور ان کا طریقہ بھی یہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کا کچھ حصہ ہم کو بھی عطا فرما دے۔

یہ سب کچھ اس لیے عرض کیا جاتا ہے کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، معلوم نہیں ہم کہاں چلے گئے ہیں، کس وادی میں بھٹک رہے ہیں، یہاں بیٹھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کا کم از کم تھوڑی دیر دھیان ہو تو شاید دلوں میں کچھ داعیہ پیدا ہو جائے اور اللہ تبارک وتعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرما دے۔ اس کی عادت ڈالو، اس کے لیے خون کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں، اس کے لیے مشق کرنی پڑتی ہے، دل پر جبر کرنا پڑتا ہے، دل پر پتھر رکھنے پڑتے ہیں، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی منزل کی طرف جانا ہے، تو یہ کڑوے گھونٹ پینے پڑیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ گھونٹ

حدیثِ پاک میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی گھونٹ جو آدمی پیتا

ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کو اتنا پسند نہیں جتنا کہ غصے کا گھونٹ پینا۔[1]

یعنی جب غصہ آرہا ہو اور غصہ میں آدمی آپے سے باہر ہو رہا ہو اور اس میں اندیشہ ہو کہ وہ کسی کو نقصان پہنچا دے گا، اس وقت غصہ کے گھونٹ کو محض اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کے لیے پی جانا اور اس کے تقاضے پر عمل نہ کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کو بہت ہی پسند ہے۔

''وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ''[2]

قرآنِ کریم نے ایسی ہی مدح فرمائی ہے ایسے لوگوں کی کہ جب بھی غصہ آئے اور انتقام کے جذبات پیدا ہوں، تو ٹھیک ہے تمہیں شریعت نے جائز حدود میں بدلہ لینے کا حق دیا ہے، لیکن یہ دیکھو کہ بدلہ لینے سے تمہیں کیا فائدہ؟ فرض کرو کہ ایک شخص نے تمہیں طماچہ مار دیا، تو تم بدلہ لینے کے لیے ایک طماچہ اسے مار دو، تو تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوا؟ اگر تم نے اس کو معاف کر دیا اور یہ کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے اس کو معاف کرتا ہوں، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں صابرین کا اجر

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

''اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ''[3]

---

(۱) سنن ابن ماجه ٦٠٣/٥ (٤١٨٩) طبع دار الجيل وقال البوصيري في "مصباح الزجاجة" ٢٣٣/٤ هذا اسناد صحيح رجاله ثقات-طبع دار العربية بيروت، ومسند احمد ١٤٩/٥ (٣٠١٥). طبع مؤسسة الرسالة.

(۲) سورة آل عمران آيت (١٣٤).

(۳) سورة الزمر آيت (١٠).

بے شک صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بے حساب اجر عطا فرمائیں گے۔

اور حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے بندوں کو معاف کرنے کا عادی ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب اس نے میرے بندوں کو معاف کیا تھا، تو میں اس کو معاف کرنے کا زیادہ حق دار ہوں، تو اس کی خطائیں بھی اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں (۱)۔

عفو وصبر کا مثالی واقعہ

حضرتِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دو آدمی آپس میں لڑے، لڑائی میں ایک کا دانت ٹوٹ گیا، جس کا دانت ٹوٹا وہ شخص اس کو پکڑ کر حضرتِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے گیا اور کہا کہ دانت کا بدلہ دانت ہوتا ہے، لہٰذا قصاص دلوائیے۔

حضرتِ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، تمہیں حق ہے، لیکن کیا فائدہ، تمہارا دانت تو ٹوٹ ہی گیا، اس کا بھی توڑیں، اس کی بجائے تم دانت کی دیت لے لو، دیت پر صلح کر لو، وہ شخص کہنے لگا کہ میں دانت ہی توڑوں گا، حضرتِ معاویہ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اس کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ نہ مانا، حضرتِ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر چلو، اس کا بھی دانت توڑتے ہیں۔

راستے میں حضرتِ ابو درداء رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے، بڑے درجے کے مشہور صحابی ہیں، انہوں نے کہا کہ بھئی دیکھو! تم قصاص تو لے رہے ہو، مگر ایک بات

---

(۱) مسند احمد ۲۹۶/۲۸ (۱۷۰۶٤) والمستدرك على الصحيحين للحاكم ۳۳/۲ (۲۲۲۳) قال الحاكم هذا حديث صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه وقال الذهبی فی "التلخيص" على شرط مسلم. طبع دار الكتب العلمية.

تو سنتے جاؤ، میں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو تکلیف پہنچائے اور پھر جس کو تکلیف پہنچی ہے وہ اس کو معاف کر دے، تو اللہ تعالیٰ اس کو اس وقت معاف فرمائیں گے جب کہ اس کو معافی کی سب زیادہ حاجت ہوگی، یعنی آخرت میں۔

تو یہ شخص یا تو اتنے غصہ میں آیا تھا کہ پیسے لینے پر بھی راضی نہیں تھا، جب یہ بات سنی، تو کہا:

"ءَأَنْتَ سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ؟"

کیا آپ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سنی ہے۔

حضرتِ ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں میں نے سنی ہے اور میرے ان کانوں نے سنی ہے، وہ شخص کہنے لگا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بات فرمائی ہے، تو جاؤ اس کو بغیر کسی پیسے کے معاف کرتا ہوں، چنانچہ معاف کر دیا[1]۔

ہم میں اور صحابہ میں فرق

احادیث ہم بھی سنتے ہیں اور وہ حضرات بھی سنتے تھے، لیکن ان کا حال یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک ارشاد کان میں پڑا، تو بڑے سے بڑا قصد و ارادہ اور بڑے سے بڑا منصوبہ اس ارشاد کے آگے ایک پل میں ڈھیر کر دیا۔

ہم صبح سے شام تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں لیکن عمل کا داعیہ پیدا نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس پڑھنے اور سننے

---

(۱) مسند احمد ۴۵/۵۲۱ (۲۷۵۳۴) وسنن الترمذی ۳/۶۷ (۱۳۹۳) وقال ھذا حدیث غریب لا نعرفه الا من هذا الوجه ولا اعرف لابی السفر سماعا من ابی الدرداء.

کے نتیجے میں ہماری زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آتا، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی عزت دی تھی اور آخرت میں بھی ان شاء اللہ ان کا عظیم مقام ہوگا۔

مذکورہ حدیث کا آخری ٹکڑا

اس میں دوسری بات آگے یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت اپنے پاس نہیں بلائیں گے، جب تک کہ اس ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کر لیں، ٹیڑھی قوم سے مراد بت پرستوں والی عرب قوم، کہ ان کے اندر شرک تو تھا ہی اور دماغ میں خناس بھی کہ ہم ساری مخلوق سے برتر ہیں، اپنے آپ کو خدا جانے کیا کچھ سمجھتے تھے، ان کو سیدھا کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا۔

چنانچہ ۲۳ سال کی مدت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے پورے جزیرۃ العرب پر لا الہ الا اللہ کی حکومت قائم فرما دی۔

اور آگے فرمایا کہ

"یَفْتَحُ بِهَا أَعْيُنًا عُمْيًا"

اس کلمہ توحید کے ذریعے ان کی اندھی آنکھوں کو کھولے گا اور ان کے دلوں کے پردوں کو ہٹائے گا۔ یہ سب الفاظ تورات کے ہیں جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کے بارے میں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
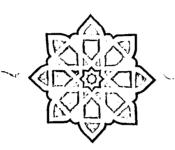
صحت کی دعا کرنا سنّت ہے

(اصلاحی مجالس ج ۳ ص ۲۷۹)
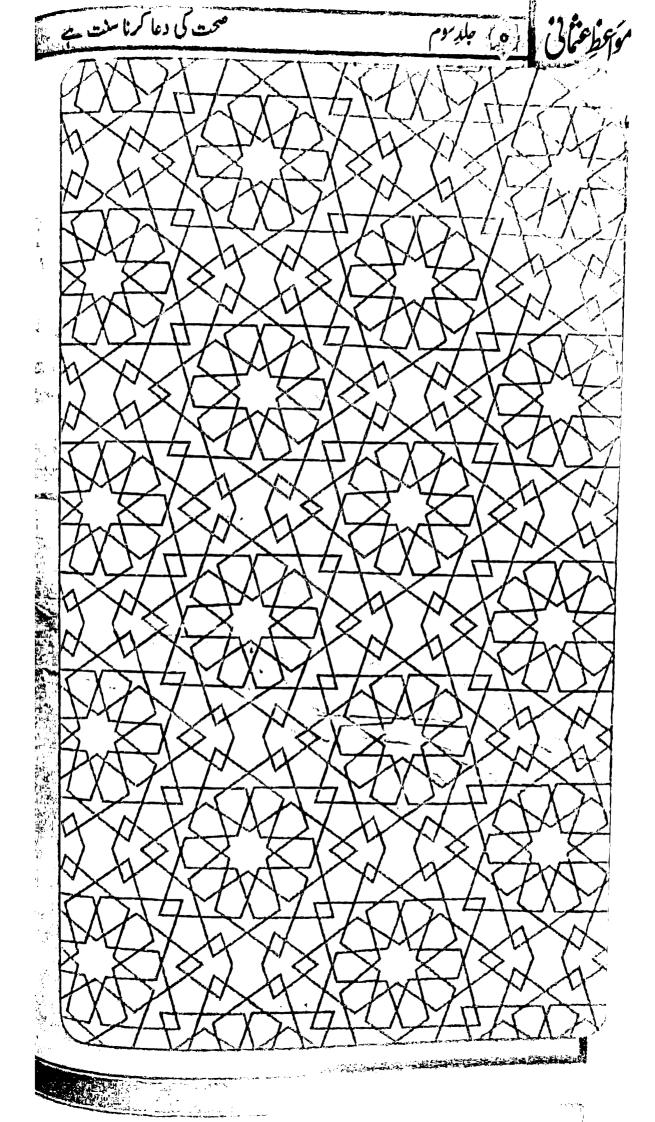
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صحت کی دعا کرنا سنّت ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

ایک بیمار کا خط

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ:

"اب پروردگارِ عالم ساتھ ایمان کے بلالیں، بلا بصارت زندگی بے کار ہے، تلاوت ومواعظ وغیرہ سے محرومی کا سخت رنج ہے"۔ (انفاس عیسیٰ ص ۷۸)

ان صاحب کی آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی اور بینائی کا چلے جانا بلاشبہ سخت مصیبت کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حفاظت میں رکھے۔ خاص طور پر وہ شخص جو اچھا بھلا دیکھنے والا اور مطالعہ کرنے والا ہو، اگر اس کی بینائی جاتی رہے، تو بڑی سخت تکلیف کی بات ہے۔ اس تکلیف پر انہوں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ بس اب تو یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان کے ساتھ اپنے پاس بلالیں، کیونکہ جب آنکھ ہی نہ رہی، تو اب زندگی سے کچھ فائدہ نہیں، اب تو قرآنِ کریم کی تلاوت بھی نہیں کرسکتے، مواعظ بھی نہیں پڑھ سکتے، ان سب سے محرومی ہوگئی ہے۔

صحت کی دعا عبدیت کی علامت ہے

''صحت کی دعا تو ''سنت'' ہے اور علامت ''عبدیت'' کی ہے، مگر یہ کہنا کہ ''اب پروردگارِ عالم ساتھ ایمان کے بلالیں، بلا بصارت زندگی بے کار ہے'' یہ نہایت بے ادبی ہے اور بعید از ''عبدیت'' ہے، ہم کو رائیں لگانے کا کیا حق ہے، حضرتِ حق سے جو پیش آئے خیر ہے، تلاوت وکتب بینی میں ثواب اور رضا منحصر نہیں، اوّل تو صحت کی حالت میں تطوع پر مداومت کرنے والے کو مرض میں بدون عمل کیے بھی ثواب عملِ سابق کا ملتا رہتا ہے۔ دوسرے بعض اوقات صبر کا اجر، عمل کے اجر سے بڑھ جاتا ہے، البتہ بینائی کی دعا خود رائی نہیں، اس کی اجازت ہے۔ دعا مانگے اور دل سے مانگے اور ساتھ میں یہ سمجھے کہ اگر اس کے خلاف واقع ہوا وہ بھی خیر ہے، اس پر بھی راضی رہے۔'' (ایضاً)

بیماری میں دعا کرنے کا ثبوت

دو باتیں الگ الگ ہیں، دونوں کی حقیقت سمجھنے کی ضرورت ہے، پہلی بات تو یہ کہ جب آدمی بیمار ہو یا تکلیف میں ہو تو اس بیماری کی حالت میں صحت مانگنا کہ یا اللہ! مجھے صحت عطا فرمادے، یہ دعا کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ سنت ہے، اس لیے یہ دعا مانگنی چاہیے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

''اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ الصِّحَّةَ وَالۡعِفَّةَ وَالۡاَمَانَةَ وَحُسۡنَ الۡخُلُقِ وَالرِّضَا بِالۡقَدَرِ''(۱)

اے اللہ! میں آپ سے صحت، عفّت، امانت، حسن اخلاق اور رضا بالقدر کا سوال کرتا ہوں۔

اور ایک مرتبہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکلیف کے عالم میں تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ سے دعا فرمائی:

''اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ تَعۡجِيۡلَ عَافِيَتِكَ وَصَبۡرًا عَلٰى بَلِيَّتِكَ وَخُرُوۡجًا مِنَ الدُّنۡيَا اِلٰى رَحۡمَتِكَ''(۲)

---

(۱) الأدب المفرد للبخاری ص ۱۶۰(۳۰۷) والمعجم الكبير للطبرانی ۲۹/۱۳ (۶۰) مکتبة ابن تیمیة القاهرة وقال الهيثمی فی "المجمع" ۱۷۳/۱۰ (۱۷۳۶۷) رواه الطبرانی والبزار ...وفيه عبد الرحمن بن زياد بن انعم وهو ضعيف الحديث وقد وثق وبقية رجال احد الاسنادين رجال الصحيح.

(۲) المعجم الاوسط للطبرانی ۲۹۳/۱ (۹۶۹) والمستدرك على الصحيحين للحاكم ۷۰۳/۱ (۱۹۱۷) قال الحاكم صحيح الاسناد ولم يخرجاه، ووافقه الذهبی فی "التلخيص".

اس دعا میں صرف یہ نہیں کیا کہ عافیت مانگ رہے ہیں، بلکہ جلدی مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! جلدی سے عافیت دے دیجیے اور مصیبتوں پر صبر عطا فرمائیے۔ لہٰذا تعجیلِ عافیت کی دعا مانگنا بھی سنت ہے اور اس میں ثواب بھی ہے۔ اور عبدیت اور بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے تکلیف کے ازالے کی دعا کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری کا مظاہرہ کرنا اچھی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عبدیت، شکستگی، عاجزی کا مظاہرہ کرنا مطلوب ہے، یہ نہ ہو کہ سینہ تان کر کہیں کہ اور بیماری لاؤ، برداشت کریں گے، یہ عبدیت کا تقاضا نہیں۔ عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ جب بیماری آئے، تو اللہ تعالیٰ سے صحت مانگے کہ یا اللہ! مجھے صحت عطا فرمادے، جیسے حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا:

"اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ"(۱)

دوسری جگہ فرمایا:

"اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ"(۲)

مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔

بہرحال! صحت مانگنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا کہ ایک بزرگ بیمار ہوگئے، دوسرے بزرگ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، انہوں نے جا کر دیکھا

(۱) سورۃ ص آیت (۴۱).
(۲) سورۃ الانبیاء آیت (۸۳).

کہ وہ بیمار بزرگ تکلیف میں ہیں، لیکن اس تکلیف کے عالم میں الحمد للہ الحمد للہ کا ورد کر رہے ہیں، نہ آہ آہ کر رہے ہیں اور نہ ہی صحت کی دعا کر رہے ہیں۔ جو بزرگ عیادت کرنے کے لیے گئے تھے، انہوں نے کہا کہ دیکھو بھائی! اگر تم نے اس طرح ''الحمد للہ'' کا ورد جاری رکھا، تو صحت حاصل نہیں ہوگی۔ اگر صحت چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ یہ تکلیف دور ہو جائے، تو تھوڑا ہائے ہائے کرو اور اللہ تعالیٰ سے صحت مانگو اور کہو کہ یا اللہ! میں عاجز اور کمزور ہوں، مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی، آپ مجھ سے اس تکلیف کو دور فرما دیجیے اور صحت عطا فرما دیجیے۔ بہرحال! اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور شکستگی کا اظہار کرنا مطلوب ہے، نہ یہ کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری کا اظہار کرے۔

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں

ہمارے بڑے بھائی تھے، محمد ذکی کیفی صاحب، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین، شعر بہت اچھے کہتے تھے، ایک شعر میں انہوں نے یہی بات بیان فرمائی ہے، فرمایا:

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حسن کا پندار کیا؟

ضبطِ غم ویسے تو اچھی چیز ہے، لیکن اس قدر بھی ضبطِ غم نہ ہو کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادر بن جائے، کیا اللہ تعالیٰ کا پندار توڑنا چاہتے ہو کہ آپ مجھے کتنی بھی تکلیف دیں، لیکن میں بڑا بہادر ہوں، میں سب برداشت کروں گا۔

یاد رکھو! یہ بندگی کا تقاضا نہیں ہے، بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگے کہ یا اللہ! مجھے صحت عطا فرما دیجیے۔

بھوک کی وجہ سے ایک بزرگ کا رونا

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سنایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ بیٹھے رو رہے تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! کیوں رو رہے ہیں؟ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس لیے رو رہا ہوں کہ بھوک لگ رہی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا ہوں کہ یا اللہ! بھوک لگ رہی ہے، کھانا کھلا دیجیے۔ کسی نے کہا کہ آپ تو بچوں کی طرح رو رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ میاں نے مجھے اسی لیے بھوک دی ہے تاکہ میں رو رو کر اس سے مانگوں اور اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کروں۔

بیماری میں ہائے ہائے کرنا

بہرحال! بیماری کی حالت میں صحت کی دعا کرنا تو سنت ہے، بشرطیکہ وہ ایسے طریقے سے نہ ہو کہ اس میں شکوہ پنہاں ہو، معاذ اللہ۔ بیماری کی حالت میں ہائے ہائے کرنے میں کوئی حرج نہیں، تکلیف کے اظہار میں کوئی حرج نہیں، لیکن تکلیف کا اظہار ایسے الفاظ سے نہ ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ ہو، کیونکہ یہ بڑی خطرناک بات ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ''یا اللہ! فیصلہ آپ ہی کا برحق ہے، مشیت آپ ہی کی درست ہے لیکن میں کمزور ہوں، عاجز ہوں، اس تکلیف کو برداشت نہیں کر پا رہا ہوں، اے اللہ! اس تکلیف کو دور فرما دیجیے۔''

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تکالیف پر صبر

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کو دیکھا کہ آپ کو دل کی تکلیف شدید تھی، اس کے ساتھ ساتھ پاؤں میں نقرس کا درد اور پھر اس کے علاوہ جسم پر پھنسیاں بھی نکل آئیں، جس کو ڈاکٹر ہرپیز کی پھنسیاں کہتے ہیں، جو ڈاکٹر اور اطبا آکر ان پھنسیوں کو دیکھ رہے تھے، وہ بتاتے تھے کہ یہ پھنسیاں ایسی ہیں کہ جب جسم پر نکل آتی ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسم پر کسی نے انگارا رکھ دیا ہو اور پوری ٹانگ ان پھنسیوں سے بھری ہوئی تھی اور سینے پر بھی نکلی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس دوران حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھنے کے لیے چھ سات بڑے بڑے اطباء اور ڈاکٹر آئے جن میں حکیم سعید صاحب بھی تھے، جب یہ حضرات دیکھ کر باہر تشریف لائے، تو انہوں نے کہا کہ ہمیں اس پر حیرت ہے کہ مفتی صاحب کیسے اس کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں، اس لیے کہ یہ پھنسیاں تو بالکل انگاروں کی طرح تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

رحم کی دعا پر استغفار

ابھی اپنی ان تکالیف کے اندر مبتلا تھے کہ اسی حالت میں ہمارے بڑے بھائی صاحب ”بھائی ذکی کیفی مرحوم“ کے انتقال کی خبر آئی، جو جوان اور محبوب بیٹے تھے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ ایک طرف دل کی تکلیف، دوسری طرف نقرس کا درد، تیسرے ہرپیز کی پھنسیاں اور چوتھے جوان بیٹے کے انتقال کی خبر۔ اس وقت بے ساختہ زبان پر یہ الفاظ آئے یا اللہ! فضل فرما، یا اللہ! رحم فرما۔ تھوڑی

ہی دیر کے بعد فرمایا کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا کہ یا اللہ! رحم فرما، اس کا تو مطلب یہ ہے کہ اب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحم نہیں ہورہا ہے، یہ تو [illegible] شکوے کی بات ہوگئی، اس میں شکوہ کا شائبہ پیدا ہوگیا، حالانکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش سے زندگی گزار رہے ہیں، یا اللہ! میں ان الفاظ پر آپ سے استغفار کرتا ہوں، استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ، پھر یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ! یہ بیماری بھی آپ کی نعمت ہے، لیکن یا اللہ! ہم کمزور ہیں، عاجز ہیں، اس نعمت کو برداشت کرنے کی طاقت ہمارے اندر نہیں ہے، اے اللہ! اس بیماری کی نعمت کو صحت کی نعمت سے تبدیل فرما۔

دعا میں شکوہ کا رنگ نہ ہو

آپ اندازہ لگائیں کہ جس شخص پر یہ تکالیف اور پریشانی گزر رہی ہو، اس وقت ذہن کا اس بات کی طرف جانا کہ میرا یہ جملہ ''یا اللہ! رحم فرما'' کہیں غلط نہ ہوگیا ہو، یہ اسی شخص کا ذہن اس طرف جاسکتا ہے جس کا رابطہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے جڑا ہوا ہو، ہر کس و ناکس کا ذہن اس طرف نہیں جاسکتا۔ اس کے ذریعے ادب سکھادیا کہ صحت کی دعا مانگو، لیکن اس طرح نہ مانگو کہ اس میں شکوہ کا رنگ پیدا ہوجائے، بلکہ اپنی کمزوری اور اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے صحت کی دعا کرو، اپنی شکستگی کا اظہار کرتے ہوئے مانگو، پھر ان شاء اللہ اس دعا پر اللہ تعالیٰ ثواب بھی عطا فرمائیں۔ اسی لیے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''صحت کی دعا تو سنت ہے اور علامت ''عبدیت'' کی ہے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں توصیف کے کلمات

یاد رکھیے! انسان کا اعلیٰ ترین مقام جس سے اعلیٰ مقام کوئی اور نہیں ہوسکتا، وہ ''عبدیت'' کا مقام ہے، یعنی انسان اللہ کا بندہ بن جائے۔ دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کتنے عنوانات سے فرمایا کہ تعریف اور توصیف کا کوئی کلمہ نہیں چھوڑا۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا:

''یَاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۶﴾''(۱)

اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہم نے آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

''لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۸﴾''(۲)

یعنی تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند

---

(۱) سورۃ الاحزاب آیت (۴۵و۴۶)۔
(۲) سورۃ التوبۃ آیت (۱۲۸)۔

رہتے ہیں، مؤمنین کے ساتھ بڑے ہی شفیق مہربان ہیں۔

مختلف عنوانات سے اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف فرمائی، کہیں ''یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ'' فرما رہے ہیں اور کہیں ''یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ'' فرما رہے ہیں، کہیں ''کملی والے'' کہہ کر خطاب کر رہے ہیں، کہیں ''چادر والے'' کہہ کر خطاب کر رہے ہیں، محبت اور پیار کا اور تعظیم و تکریم کا کوئی عنوان نہیں چھوڑا۔

معراج کے تذکرے میں ''عبد'' کا لفظ لانا

لیکن جب اللہ تعالیٰ نے معراج کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرب کا سب سے اعلیٰ مقام عطا فرمایا، جہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم کلامی کا شرف عطا فرمایا اور اس مقام پر پہنچایا کہ جبرئیل امین بھی وہاں نہ جاسکے، تو قرآنِ کریم میں جہاں اس بلند مقام کے عطا کرنے کا ذکر فرمایا، وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صرف ایک لفظ ''عبد'' کا ذکر فرمایا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

> ''سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ''(۱)

> یعنی پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے لے گئی۔

اب یہاں پر نہ ''شاھدًا'' کا لفظ ارشاد فرمایا، نہ ''مبشراً'' نہ ''نذیراً'' لائے، یہاں صرف ''بعبدہ'' کا لفظ لائے کہ اپنے بندے کو لے گئے، اس

(۱) سورۃ الاسراء آیت (۱)

سے اشارہ اس طرف فرمادیا کہ ''بندگی'' سے زیادہ اونچا کوئی دوسرا مقام نہیں ہو سکتا، چاہے کوئی انسان کتنا ہی آگے بڑھ جائے، لیکن اس کی معراج یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جائے۔ لہٰذا انسان کا اعلیٰ ترین مقام ''عبدیت'' ہے اور یہ ''عبدیت'' اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے روئے، گڑگڑائے، شکستگی اور عاجزی کا اظہار کرے۔

یہ بے ادبی کے الفاظ ہیں

بہرحال! حضرت والا نے فرمایا کہ ''صحت کی دعا کرنا تو سنت ہے اور علامت عبدیت کی ہے۔ مگر یہ کہنا کہ اب پروردگارِ عالم ساتھ ایمان کے بلالے، بلابصارت زندگی بے کار ہے، یہ نہایت بے ادبی ہے۔'' یہ الفاظ اکثر وبیشتر لوگوں کی زبان پر آجاتے ہیں کہ اب تو اللہ میاں ایمان کے ساتھ اٹھالے، اب تو زندگی بے کار ہے۔ ان الفاظ کے بارے میں فرمایا کہ یہ بہت بے ادبی کی بات ہے اور عبدیت سے بہت بعید ہے۔ ارے ہم کو رائے قائم کرنے کا کیا حق ہے کہ ہم زندگی کے بارے میں یہ رائے قائم کریں کہ اب تو زندگی بے کار ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فضول زندہ رکھا ہے۔ معاذ اللہ۔

یہ تکلیف تمہیں کس بلند مقام پر پہنچا رہی ہے

تمہیں کیا معلوم کہ تمہارے لیے زندگی بہتر ہے یا موت بہتر ہے، کیا معلوم کہ اس آنے والی زندگی میں کوئی ایک عمل ایسا ہوجائے جس سے بیڑا پار ہوجائے، کیا معلوم کہ یہ تکلیف جس کی وجہ سے تم کراہ رہے ہو اور یہ تمنا کررہے ہو کہ مجھے موت آجائے تو بہتر ہے، یہی تکلیف تمہیں معلوم نہیں کس بلند مرتبے

پر پہنچا رہی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں معاملات بڑے عجیب ہوتے ہیں، کوئی ان کو سمجھ نہیں سکتا۔

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کسے را چون و چرا نہ رسد در قضائے ما

یعنی ہم دشمنوں کو پالتے ہیں اور دوستوں کو مار دیتے ہیں، کسی کو ہمارے فیصلے میں چوں و چرا کرنے کی گنجائش نہیں۔ اچھے خاصے دشمنِ خدا اور دشمنِ دین کو ڈھیل دی جارہی ہے، وہ چاند پر جھنڈے گاڑ رہے ہیں اور جو اپنے پیارے اور محبوب ہیں، ان کو آروں سے چروایا جارہا ہے۔

ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی بندے کو کسی خاص مقام تک پہنچانا چاہتے ہیں، لیکن وہ شخص اپنے اعمال کے ذریعے اس مقام تک نہیں پہنچ سکا، تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں، کبھی جسم میں، کبھی جان میں، کبھی خیالات میں، کبھی جذبات میں تکلیف دے دیتے ہیں، پھر اس تکلیف کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں (۱)۔

ایک مسلمان اور ایک یہودی کا قصہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شہر میں ایک یہودی تھا

(۱) المرض والکفارات لابن ابی الدنیا ص ۱۹۳ (۲۵۰) طبع الدار السلفیة بومبای وشعب الایمان للبیهقی ۱۲/۲۷۶ (۹۳۹۱) وذکره المنذری فی "الترغیب والترهیب" ۴/۱۴۳ بصغیة التمریض وقال رواه ابن ابی الدنیا (طبع دار الکتب العلمیه)۔

اور ایک مسلمان تھا، دونوں بستر مرگ پر مرنے کے قریب تھے، یہودی کے دل میں مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش کہیں سے مچھلی مل جائے تو کھاؤں اور مسلمان کے دل میں زیتون کا تیل کھانے کا دل چاہا، اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے سے فرمایا کہ فلاں شہر میں ایک یہودی ہے، اس کا مچھلی کھانے کو دل چاہ رہا ہے، تم ایسا کرو کہ ایک مچھلی پکڑ کر اِس کے گھر کے اندر جو تالاب ہے اس میں ڈال دو، تا کہ وہ مچھلی وہاں سے نکلوا کر کھالے۔ اور ایک فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ فلاں مسلمان کو زیتون کھانے کا دل چاہ رہا ہے اور اس کے گھر کی الماری میں زیتون موجود ہے، تم جا کر وہ زیتون ضائع کر دو، چنانچہ وہ دونوں فرشتے اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کے لیے روانہ ہو گئے۔

فرشتوں نے اپنا اپنا کام کرلیا

راستے میں دونوں فرشتوں کی ملاقات ہوگئی، ایک فرشتے سے دوسرے نے پوچھا کہ تم کہاں جارہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ ایک یہودی کا مچھلی کھانے کو دل چاہ رہا ہے، اس کے تالاب میں مچھلی ڈال دوں، تا کہ وہ اس کو کھالے۔ دوسرے فرشتے نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں جارہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ فلاں مسلمان کو زیتون کا تیل کھانے کو دل چاہ رہا ہے، تم جا کر اس کے تیل کو ضائع کر دو، تا کہ وہ اس کو نہ کھاسکے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم تو بہر حال حکم ہے، اس کو ماننا ضروری ہے، چنانچہ دونوں فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنا اپنا کام کرلیا۔

یا اللہ! بات سمجھ میں نہیں آئی

جب وہ دونوں فرشتے اپنا اپنا کام کر کے واپس ہوئے، تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچے اور عرض کیا کہ یا اللہ! یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی، ایک طرف یہودی ہے جو کافر ہے، اس کی خواہش تو آپ اس طرح پوری کرارہے ہیں کہ اس کے تالاب میں مچھلی موجود بھی نہیں تھی، اس کے باوجود اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے اس کے تالاب میں مچھلی ڈلوادی۔ دوسری طرف مسلمان ہے جس کے گھر میں زیتون کا تیل موجود تھا، اس کے باوجود آپ نے اس کے تیل کو ضائع کرادیا، تاکہ وہ اپنی خواہش پوری نہ کرسکے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

کافروں کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ یہ جو غیر مسلم اور کافر ہیں ان کے ساتھ میرا معاملہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ دنیا میں اچھے کام کرتے ہیں، مثلاً کوئی صدقہ خیرات کردیا، دوسروں کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آگئے، کوئی خیراتی کام کردیے وغیرہ، میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کے اچھے کاموں کا بدلہ دنیا میں ہی چکا دیا جائے اور جب یہ میرے پاس آئیں تو ان کی اچھائیوں کا حساب دنیا میں بے باک ہوچکا ہو اور میرے ذمے آخرت میں ان کی نیکی کا بدلہ کوئی نہ ہو، اس لیے میں ان کی نیکیوں کا بدلہ دنیا میں دیتا رہتا ہوں۔ یہ یہودی بھی بہت سے اچھے کام کرتا تھا، ان تمام اچھے کاموں کا بدلہ میں دنیا میں دے چکا تھا، صرف ایک اچھے کام کا بدلہ اس کو دنیا میں نہیں ملا تھا اور اب یہ یہودی

ہمارے پاس آنے والا تھا، اس لیے ہم نے چاہا کہ اس کی یہ آخری خواہش پوری کردی جائے، تاکہ اس کے نتیجے میں اس کا حساب کتاب برابر ہوجائے، لہٰذا اس کی اس خواہش کو پورا کرکے ہم نے اس کا حساب کتاب برابر کردیا، اب یہ ہمارے پاس آئے گا، تو ہمارے ذمے اس کی کسی نیکی کا بدلہ دینا باقی نہیں ہوگا۔

مسلمانوں کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے

اور مسلمانوں کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں گناہ کرتا ہے، تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس کے گناہوں کا حساب دنیا ہی میں بے باق ہوجائے، تاکہ جب وہ ہمارے پاس آئے، تو گناہ کا کوئی حساب اس کے کھاتے میں نہ ہو اور ہمیں اس کو عذاب دینے کے لیے جہنم میں نہ بھیجنا پڑے۔ لہٰذا اگر کسی مسلمان کے ذمے کوئی گناہ باقی ہوتا ہے، تو ہم تکلیفوں کے ذریعے اور بیماریوں کے ذریعے اس کے گناہ ختم کردیتے ہیں۔ اسی طرح اس مسلمان کے اور سارے گناہ تو معاف ہوگئے تھے، صرف ایک گناہ باقی رہ گیا تھا، ہم نے چاہا کہ اس کا یہ گناہ بھی باقی نہ رہے، تاکہ جب یہ ہمارے پاس آئے، تو پاک صاف ہوکر ہمارے پاس آئے، اس لیے جب اس کے دل میں زیتون کا تیل کھانے کی خواہش ہوئی تو ہم نے اس کا زیتون کا تیل ضائع کرادیا اور اس کے دل پر ایک چوٹ اور لگادی اور اس کے نتیجے میں اس کا وہ گناہ بھی ختم ہوگیا اور اب وہ ہمارے پاس دھلا دھلایا پاک صاف ہوکر آئے گا، لہٰذا کہاں تک انسان اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا ادراک کرے گا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو نوازنے کا انداز

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا، اتفاق سے کسی کتاب میں نہیں دیکھا اور تلاش بھی کیا لیکن نہیں ملا، آپ حضرات بھی تلاش کیجیے گا، مل جائے تو مجھے اس کا حوالہ بتادیں۔

وہ قصہ یہ ہے کہ جس وقت حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا بیمار تھیں اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرماتھے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اپنی تکلیف کا اظہار کررہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ یہ تمہاری تکلیف جان لیوا تکلیف ہے، تم اب بچو گی نہیں، اسی بیماری میں تمہارا انتقال ہوجائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت رحیم وکریم تھے، بڑے شفیق اور مہربان تھے اور پھر عام لوگوں کو بھی یہ حکم ہے کہ جب آدمی کسی کی عیادت کے لیے جائے، تو جاکر اس کو تسلی دے، نہ یہ کہ اس کو یہ کہے کہ تم اس بیماری میں مرجاؤ گے، پھر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی تھیں اور بیوی بھی ایسی ہم درد اور غم گسار تھیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساری عمران کو یاد فرمایا۔ ایسی بیوی سے آپ نے یہ جملہ کیسے فرمادیا کہ تم اس بیماری میں بچو گی نہیں، بلکہ مرجاؤ گی؟

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ علمائے کرام نے اس کے بارے میں فرمایا کہ بات دراصل یہ تھی کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو آخرت میں جنت میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہنا تھا، لیکن اعمال کے ذریعے وہ ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکی تھیں، اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو جنت میں اپنے ساتھ رکھنے کی خاطر یہ عمل کیا کہ ان کے سامنے ایسے الفاظ کہے،

تاکہ اس کے ذریعے ان کے دل پر چوٹ لگے اور اس چوٹ لگنے کے نتیجے میں ان کے درجات بلند ہوجائیں اور آخرت میں یہ میرے پاس آجائیں۔

تکالیف پر رضا مندی، درجات کی بلندی کا ذریعہ

بہرحال! یہ تکلیف اور یہ بیماری جو تمہیں دنیا میں پہنچ رہی ہے، تمہیں کیا معلوم کہ یہ تمہارے حق میں فائدہ مند ہے یا نقصان دہ ہے، لیکن حقیقت میں ان کے آخرت میں فائدہ مند ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں، بشرطیکہ تم اس پر راضی رہو۔ لہٰذا اپنی طرف سے یہ کہنا کہ اب تو زندگی بے کار ہے، یہ بہت غلط بات ہے اور بے ادبی کا جملہ ہے، اسی وجہ سے موت کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے، ارے کیا معلوم کہ اگر وہ موت جس کو تم مانگ رہے ہو، وہ ابھی آگئی اور مرنے کے بعد سیدھے مقامِ غضب میں پہنچ گئے، تو بتایئے موت آنے کا کیا نتیجہ ہوا؟ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا، تو کدھر جائیں گے

موت اس وقت قابلِ محبت ہے جب اس کے ذریعے سے اللہ جل شانہ کا مقامِ رضا حاصل ہو، اس وقت بے شک موت محبوب چیز ہے، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ مرنے کے بعد کہاں پہنچو گے، اس لیے موت کی تمنا مت کرو۔

موت کی دعا کے بجائے یہ دعا کریں

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا تلقین فرمائی، وہ تو یہ ہے:

''اَللّٰھُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَیْبِ وَقُدْرَتِكَ عَلَی الْخَلْقِ اَحْیِنِیْ مَاعَلِمْتَ الْحَیَاۃَ خَیْرًا لِّیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاۃَ خَیْرًا لِّیْ''(۱)

یعنی اے اللہ! آپ کے علمِ غیب کا واسطہ دے کر اور مخلوق پر آپ کی قدرت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ یا اللہ! جب تک آپ کے علم میں میرے لیے زندگی بہتر ہو، مجھے زندہ رکھیے اور جب میرے حق میں موت بہتر ہو، اس وقت مجھے موت دے دیجیے۔

یہ دعا کرنی چاہیے نہ یہ کہ یہ کہا جائے کہ بس اب تو مجھے موت ہی آ جائے، تو اچھا ہے، اب تو زندگی سے دل بیزار ہوگیا ہے، اب تو بس اللہ تعالیٰ اپنے پاس بلالے۔ یہ سب بے ادبی کی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی رائے چلانا ہے۔

تین سبق

بہرحال! اس ملفوظ سے تین سبق ملے، پہلا سبق یہ ملا کہ صحت کی دعا کرنا

---

(۱) سنن النسائی ۵٤/۳ (۱۳۰۵) مكتبة المطبوعات الاسلامية، وصحيح ابن حبان ۳۰٤/۵ (۱۹۷۱)۔

سنت ہے، دوسرا سبق یہ ملا کہ ایسے انداز سے دعا نہ کرے جس میں شکوہ و شکایت کا انداز ہو، تیسرا سبق یہ ملا کہ تکلیف کی شدت کی وجہ سے یا بیماری کے طول کی وجہ سے یہ دعا کرنا کہ مجھے موت آجائے، یہ دعا کرنا درست نہیں۔ دعا وہ کرے جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی کہ یا اللہ! جب تک زندگی بہتر ہو، اس وقت تک زندہ رکھئے اور جب میرے حق میں موت بہتر ہو، اس وقت موت عطا فرمادیجیے یا پھر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مانگی ہوئی یہ دعا کرے:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ تَعْجِيْلَ عَافِيَتِكَ وَصَبْرًا عَلٰى بَلِيَّتِكَ وَخُرُوْجًا مِنَ الدُّنْيَا اِلٰى رَحْمَتِكَ"۔(۱)

اے اللہ! میں آپ سے عافیت کی جلدی اور مصیبت پر صبر اور دنیا سے آپ کی رحمت کی طرف خروج کا سوال کرتا ہوں۔

لہٰذا یہ دعا کرنی چاہیے اور براہِ راست موت کی دعا نہیں کرنی چاہیے۔

اپنی طرف سے تجویز مت کرو

بہرحال! ان صاحب نے خط میں یہ لکھا تھا کہ رنج اس بات کا ہے کہ آنکھ جاتی رہی، اب تلاوت نہیں کرسکتا، مواعظ نہیں پڑھ سکتا، اس کا بڑا سخت رنج ہے۔ اس کے جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ "تلاوت اور کتب بینی میں

---

(۱) المعجم الاوسط للطبرانی ۲۹۳/۱ (۹۶۹) والمستدرك على الصحيحين للحاكم ۷۰۳/۱ (۱۹۱۷) قال الحاكم هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه، ووافقه الذهبي في "التلخيص".

ثواب اور رضا منحصر نہیں، تم نے اپنی طرف سے تجویز کرلیا کہ مجھے تو ثواب تلاوتِ قرآنِ کریم ہی کے ذریعے حاصل ہوگا اور چونکہ اب آنکھیں نہ رہیں تو اب میں ثواب سے محروم ہوگیا۔ ارے یہ تو اللہ جل شانہ کے ساتھ بدگمانی ہے، یہ بدگمانی مت کرو، البتہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی رہو، اسی پر اللہ تعالیٰ اجر عطا فرمائیں گے۔

حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

بڑے قاری صاحب حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ساری عمر مجسّم تلاوت تھے، روئیں روئیں میں قرآنِ کریم بسا ہوا تھا، ان کی کیفیت بالکل اس دعا کے مطابق تھی:

''اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ بَصَرِيْ وَجِلَاءَ حُزْنِيْ وَذَهَابَ هَمِّيْ''(۱)

اے اللہ! قرآن عظیم کو میرے دل کی تازگی، میری آنکھوں کے لیے نور، میرے غم اور پریشانی کو دور کرنے کا سبب بنادیجیے۔

اگر قاری صاحب کو دیکھا نہ ہوتا تو یقین نہ آتا کہ ایسا انسان بھی دنیا میں ہوسکتا ہے، قرآنِ کریم ان کی زندگی میں رچا بسا ہوا تھا اور رگ وپے میں سرایت

(۱) مسند احمد ۲۴۶/۶ (۳۷۱۲) ومسند ابی یعلی ۱۹۸/۹ (۵۲۹۷) وقال الهیثمی فی ''مجمع الزوائد'' ۱۳۶/۱۰ (۱۷۱۲۹) رواه احمد وابو یعلی والبزار الا انه قال ''وذهاب غمی'' مکان ''همی'' والطبرانی ورجال احمد وابی یعلی رجال الصحیح غیر ابی سلمة الجهنی وقد وثقه ابن حبان.

کیا ہوا تھا، ہر وقت سراپا تلاوت تھے، کوئی لمحہ تلاوت سے خالی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن آخر میں فالج کا حملہ ہوا اور زبان بند ہوگئی، اب وہ شخص جس کی زبان ہر وقت تلاوت سے تر رہتی تھی، اس کی زبان بند ہوگئی، جب ان کو اس حالت میں دیکھتا تو کبھی کبھی بڑا دل دکھتا اور صدمہ ہوتا کہ یا اللہ! جس نے ساری عمر تلاوتِ قرآن میں گزاری، اب اس کی زبان بند ہوگئی، یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ اب آخری وقت میں لیٹے لیٹے تلاوت ہی کرتے رہیں۔ بہرحال! ان کو دیکھ کر بڑی حسرت ہوتی تھی، لیکن فوراً میرے دل میں دوسرا خیال آیا کہ درحقیقت اللہ جل شانہ اس کے ذریعے یہی تو دکھانا چاہتے ہیں کہ نہ تلاوت میں کچھ رکھا ہے اور نہ ترکِ تلاوت میں کچھ رکھا ہے، ہم جس حالت میں رکھیں، بندے کے لیے اسی میں خیر ہے، جب ان کو تلاوت کا ذوق تھا اور زبان سے ہر وقت تلاوت جاری تھی، اس وقت اللہ تعالیٰ تلاوت کے ذریعے ان کے درجات بلند فرمارہے تھے اور اب جبکہ تلاوت جزوِ زندگی بن گئی تو ان کی زبان بند کردی گئی، اب ان کو اس خاموشی پر اور زبان بندی پر وہی اجر مل رہا ہے جو تلاوت پر مل رہا تھا، بلکہ شاید تلاوت سے زیادہ اب اجر مل رہا ہے، اس لیے کہ تلاوت میں تو ان کو لذت آنے لگی تھی اور اب تو تلاوت کے لیے زبان بند کردی گئی، اب تلاوت کے لیے دل چاہ رہا ہے اور حسرت ہورہی ہے، مگر زبان نہیں کھلتی، تو اب تلاوت کا ثواب ان کو الگ مل رہا ہے اور تلاوت نہ کرنے پر حسرت کا ثواب الگ مل رہا ہے، اس طرح ہم نے ان کے درجات کی بلندی کا ڈبل سامان کردیا۔ یہ سب کام اللہ تعالیٰ کی حکمتوں سے ہورہے ہیں، کون اس میں دخل دے سکتا ہے۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چونکہ برمیخت ببندد بستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش

یعنی جب اللہ تعالیٰ تمہیں کہیں باندھ کر ڈال دیں، تو بندھے پڑے رہو، تمہاری عبادت یہی ہے، اس لیے کہ یہ ان کی طرف سے ہے اور جب کھول دیں تو چھلانگیں لگاؤ۔

ہمارا حکم اور ہمارا فیصلہ ہی سب کچھ ہے

لہٰذا تمہارے دل میں یہ جو خیال پیدا ہو رہا ہے کہ مجھ سے تلاوت نہیں ہو رہی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا شوق پورا نہیں ہو رہا ہے، اس لیے اس کا صدمہ ہو رہا ہے۔ ارے اگر مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، تو پھر تلاوت بند ہونے کے وقت بھی وہی رضا حاصل ہوگی جو رضا تلاوت کے وقت حاصل تھی، اس لیے یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کس عمل سے خوش ہیں۔ حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے واقعے میں بڑی عبرت ہے، میں ان کو دیکھ کر یہ سوچتا کہ یہ شخص جس نے ساری عمر قرآن کی تلاوت میں گزاری، لیکن آج اللہ تعالیٰ یہ جلوہ دکھا رہے ہیں کہ دیکھو! وہ شخص جو ہمارے کلام کا ایسا عاشق تھا، ہم نے اس کی زبان بند کردی کہ قرآن کا ایک لفظ نہ پڑھ سکے۔ یہ سب اس لیے کیا، تاکہ دنیا کو دکھا دیں کہ کسی چیز میں کچھ نہیں رکھا، سب کچھ ہمارے حکم اور ہمارے فیصلے میں ہے، ہم جو فیصلہ کریں اور جو حکم دیں حقیقت میں وہ دین ہے۔

بیماری میں سابقہ عمل کا ثواب ملتا رہتا ہے

آگے فرمایا:

''اول تو صحت کی حالت میں تطوع پر مداومت کرنے والے کو مرض میں بدون عمل کیے بھی ثواب عمل سابق کا ملتا رہتا ہے، دوسرے بعض اوقات صبر کا اجر عمل کے اجر سے بڑھ جاتا ہے۔''

یعنی ایک شخص صحت کی حالت میں ایک نفلی عبادت کا عادی ہے، مثلاً وہ روزانہ ایک پارہ تلاوت قرآن کرتا ہے، اب بیمار ہوگیا اور بیماری کی وجہ سے تلاوت نہیں کرسکتا، تو جتنے دن بیماری کی وجہ سے تلاوت نہیں کرے گا، تو اس کو روزانہ ایک پارہ تلاوت کرنے کا ثواب ملتا رہے گا، دوسرے بعض اوقات صبر کا اجر عمل کے اجر سے بڑھ جاتا ہے، مثلاً ایک شخص عمل کرنے کا اتنا عادی ہوگیا کہ وہ عمل اس کی زندگی کا جز بن گیا کہ اس کی رگ وپے میں سما گیا، اب اللہ تعالیٰ نے کوئی مجبوری ایسی پیدا کردی کہ اب وہ اس عمل کو نہیں کرسکتا، تو اب وہ شخص عمل نہ ہوسکنے پر جو صبر کررہا ہے، اس صبر کا اجر اصل عمل کے اجر سے بڑھ جاتا ہے، چنانچہ خود تلاوت کرنے پر اس کا اتنا اجر نہ ملتا جتنا اس کو صبر کرنے پر مل رہا ہے۔

بینائی کی دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ ''البتہ بینائی کی دعا خود رائی نہیں'' یعنی یہ دعا کرنا کہ یا اللہ! بینائی عطا فرمادیجیے، اس میں کوئی حرج نہیں، اس کی اجازت ہے۔ لہٰذا دعا مانگے اور دل سے مانگے اور ساتھ میں یہ سمجھے کہ اگر اس کے خلاف واقع ہوا وہ بھی خیر ہے، اس پر بھی راضی رہے، یعنی دعا کرنے کے

باوجود بینائی نہ ملی، تو یہ سمجھے کہ میرے لیے بہتر اسی میں ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور فہم دین

اللہ تعالیٰ نے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دین کی جو فہم عطا فرمائی تھی، جس کے نتیجے میں انہوں نے دین کی ایک ایک بات واضح فرمادی، حقیقت یہ ہے کہ اب ان جیسی فہم کا آدمی نظر نہیں آتا، انہوں نے تجزیہ کرکے، چھان پھٹک کر ایک ایک چیز الگ کردی اور دودھ کا دودھ کا پانی کا پانی الگ کرکے چلے گئے اور صدیوں کے لیے راستہ واضح کردیا۔ اب اسی ملفوظ کے اندر دیکھیے کہ ایک چھوٹی سے بات تھی، لیکن اس میں کتنے سبق سکھادیے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

بدعات حرام کیوں؟

(اصلاحی خطبات ج۱۶ ص۲۲۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بدعات حرام کیوں؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا إِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ① [1]

---

(۱) سورۃ الحجرات، آیت (۱).

آمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ
النبی الکریم، ونحن علی ذالک من الشاھدین
والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! ''سورۂ حجرات'' کی ابتدائی آیات کا بیان گزشتہ جمعہ کو شروع کیا تھا، پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو! اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔ اس آیت سے کئی احکام نکلتے ہیں، جن میں سے تین احکام کا بیان گذشتہ جمعہ کو ہو چکا ہے۔

دین میں اضافہ کرنا

اس آیت سے چوتھا حکم یہ نکل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے واسطے سے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے، وہ کامل اور مکمل دین ہے، جس کی صراحت قرآنِ کریم نے دوسری جگہ اس طرح بیان فرمائی:

''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ'' (۱)

یعنی آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تمہارے اوپر کامل کر دیا، لہٰذا کوئی بھی ایسا عمل جو حقیقت میں دین نہیں ہے اور جو عمل حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں نہیں تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کی تلقین نہیں فرمائی تھی اور قرآنِ کریم میں اس کا حکم نہیں آیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

(۱) سورۃ المائدۃ آیت (۳).

نے اس کو اختیار نہیں کیا تھا، ایسے نئے عمل کو ہم دین کا حصہ سمجھ کر شروع کر دیں اور اس عمل کو واجب یا سنت قرار دیں یا اس عمل کے ترک کرنے والے پر ملامت شروع کر دیں، یہ طرزِ عمل بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آگے بڑھنے کے مرادف ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے۔

ان چیزوں کا استعمال جائز ہے

دیکھیے! بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں نہیں تھیں، نہ ان کا رواج تھا، لیکن زمانے کے حالات کی تبدیلی کی وجہ سے وہ چیزیں وجود میں آئیں اور لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ مثلاً حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بجلی نہیں تھی، آج ہمارا بجلی کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں پنکھے نہیں تھے، آج ہمارا پنکھے کے بغیر گزارا نہیں، اس زمانے میں گھوڑے اور اونٹوں پر سفر ہوتا تھا، آج موٹروں کی، بسوں کی، ریلوں اور ہوائی جہاز کی بھر مار ہے، ان کے بغیر گزارا نہیں، لیکن یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ کوئی ان کو دین کا حصہ نہیں سمجھتا، مثلاً کوئی شخص یہ نہیں کہتا ہے کہ پنکھا چلانا سنت ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہتا ہے کہ ریل میں سفر کرنا سنت یا مستحب ہے یا واجب ہے، لہٰذا کوئی بھی ان چیزوں کو دین کا حصہ نہیں سمجھتا، بلکہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئے نئے طریقے وجود میں آتے رہتے ہیں، اس لیے شریعت نے بھی ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی، ان سب چیزوں کو استعمال کرنا شرعاً جائز ہے۔

ہر بدعت گمراہی ہے

البتہ اگر کوئی نیا کام انسان اس خیال سے شروع کرے کہ یہ دین کا حصہ ہے یا یہ سوچے کہ یہ کام واجب ہے یا سنت ہے یا فرض ہے یا مستحب ہے یا یہ ثواب کا کام ہے، حالانکہ وہ کام نہ تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا، نہ آپ نے اس کا حکم دیا اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ کام کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں ہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں استغفراللہ۔ شریعت میں اسی کا نام ''بدعت'' ہے۔ ''بدعت'' کے لفظی معنی ہیں ''نئی چیز'' لہٰذا لغت کے اعتبار سے تو یہ پنکھا بھی بدعت ہے، یہ بجلی بھی بدعت ہے، یہ ٹائلز اور ماربل بھی بدعت ہے، یہ کاریں یہ بسیں اور یہ ہوائی جہاز بھی بدعت ہے، لیکن شریعت کی اصطلاح میں ''بدعت'' اس نئے کام کو کہا جاتا ہے جس کا حکم نہ قرآنِ کریم نے دیا ہو اور نہ ہی سنت سے اس کا ثبوت ہو اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل کیا ہو اور نہ ہی اس کی تلقین کی ہو، ایسے کام کو شریعت کی اصطلاح میں ''بدعت'' کہا جاتا ہے۔ بدعت کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ''(۱)

یعنی ہر وہ نیا کام جو دین میں پہلے داخل نہیں تھا اور نہ دین کا حصہ تھا، آج اس کو دین میں داخل کر دیا گیا، وہ ''بدعت'' ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔

---

(۱) سنن ابی داود ٤/٢٠٠ (٤٦٠٧) وسنن النسائی ٣/١٨٨ (١٥٧٨) وسنن ابن ماجه ١/٧٤ (٤٦). وأصله فی صحیح مسلم ٢/٥٩٢ (٨٦٧).

بدعت گمراہی کیوں ہے؟

''بدعت'' گمراہی کیوں ہے؟ اس لیے کہ بدعت میں اگر غور کیا جائے، تو یہ نظر آئے گا کہ جو شخص بدعت اختیار کرنے والا ہے وہ درحقیقت یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے جو دین ہمیں دیا تھا وہ ادھورا اور ناقص تھا، آج میں نے اس عمل کا اضافہ کر کے اس کو مکمل کر دیا۔ گویا کہ آدمی عملی طور پر بدعت کے ذریعے یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے آگے نکل جاؤں۔ جو چیز دین میں داخل کی جاتی ہے بظاہر دیکھنے میں وہ ثواب کا کام معلوم ہوتی ہے، عبادت لگتی ہے، لیکن چونکہ وہ عبادت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہوتی، اس لیے وہ عبادت بدعت ہے اور بدعت گمراہی ہے۔ جتنی بدعات ہوتی ہیں ان میں براہِ راست گناہ کا کام نہیں ہوتا، لیکن چونکہ اس عمل کو کسی اتھارٹی کے بغیر دین کے اندر شامل کر دیا گیا، اس عمل کے بارے میں ہمارے پاس قرآن کی اور سنت کی کوئی اتھارٹی نہیں تھی، بلکہ ہم نے اپنی طرف سے اس کو دین میں داخل کر دیا، اس لیے وہ بدعت بن گئی۔

شبِ براءت میں سو رکعت نفل پڑھنا

مثلاً بعض لوگوں نے ۱۵/ شعبان کی رات یعنی شبِ براءت میں لوگوں کے لیے نماز کا ایک خاص طریقہ مقرر کر دیا، وہ یہ کہ ایک ہی تحریمہ اور ایک سلام کے ساتھ سو رکعتیں نفل پڑھیں اور ہر رکعت میں خاص خاص سورتوں کا پڑھنا مقرر کر دیا کہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ، دوسری میں فلاں سورۃ، تیسری میں فلاں سورۃ وغیرہ۔ ایک زمانے میں یہ طریقہ اتنی شہرت اختیار کر گیا تھا کہ جگہ جگہ

باقاعدہ جماعت کے ساتھ سو رکعتیں پڑھی جا رہی تھیں، اگر کوئی شخص یہ سو رکعتیں نہیں پڑھتا، تو اس کو برا کہا جاتا کہ اس نے شبِ براءت نہیں منائی۔ اب آپ دیکھیں کہ جو شخص شبِ براءت میں سو رکعتیں پڑھ رہا ہے، کیا وہ کوئی چوری کر رہا ہے یا ڈاکہ ڈال رہا ہے یا وہ بدکاری کر رہا ہے، نہیں، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر اللہ کا ذکر کر رہا ہے، رکوع، سجدے کر رہا ہے، لیکن تمام علماءِ امت نے فرمایا کہ یہ عمل گناہ ہے اور بدعت ہے، ناجائز ہے، اس لیے کہ اس نے اپنی طرف سے دین میں ایک چیز کا اضافہ کر دیا، جو دین کا حصہ نہیں تھا، لہٰذا یہ عمل بدعت ہو گیا اور گناہ ہو گیا۔

ہم کوئی گناہ کا کام نہیں کر رہے

اگر ان سے پوچھا جائے کہ بھائی تم یہ جو عمل کر رہے ہو، اس کا نہ تو قرآنِ کریم میں کہیں ذکر ہے، نہ حدیث میں اس کا کہیں ذکر ہے، یہ عمل تو بدعت ہے، یہ کیسے جائز ہو گیا؟ وہ لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم لوگ کوئی گناہ کر رہے ہیں یا ہم چوری ڈاکہ ڈال رہے ہیں؟ بلکہ قرآنِ کریم پڑھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدے کر رہے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہے ہیں، کوئی گناہ کا کام نہیں کر رہے ہیں۔
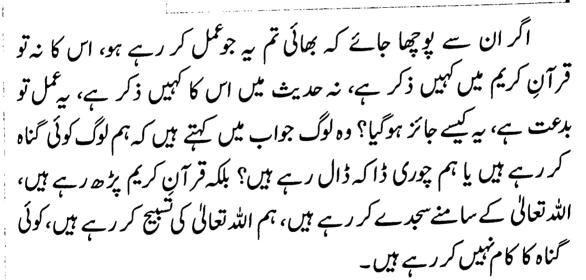
مغرب کی تین کے بجائے چار رکعت پڑھیں تو کیا نقصان

خوب سمجھ لیجیے کہ کوئی بھی عبادت اس وقت تک عبادت کہلانے کی مستحق نہیں جب تک اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی سند موجود نہ ہو، ورنہ وہ عبادت بدعت ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر

پانچ نمازیں فرض فرمائی ہیں اور ہر نماز کی رکعتوں کی تعداد متعین فرمائی ہے کہ فجر میں دو رکعتیں فرض پڑھو، ظہر، عصر اور عشاء میں چار چار رکعت پڑھو اور مغرب میں تین رکعت پڑھو، اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ تین رکعتوں کی تعداد تو اچھی معلوم نہیں ہوتی لہٰذا مغرب میں تین کے بجائے چار رکعت پڑھ لے، تو کیا اس نے کوئی ڈاکہ ڈالا، کوئی چوری کی، کیا اس نے بدکاری کی؟ کیا اس نے شراب پی لی؟ نہیں، بلکہ اس نے تو ایک رکعت زیادہ پڑھ لی، اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی، ایک رکوع زیادہ کیا، دو سجدے زیادہ کیے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح زیادہ کی، لیکن اس شخص نے جو چوتھی رکعت اپنی طرف سے زیادہ پڑھ لی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ثواب زیادہ ملنے کے بجائے یہ ایک رکعت پہلی تین رکعتوں کو بھی لے ڈوبے گی اور اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مغرب کی نماز کا جو طریقہ بتایا گیا تھا، اس طریقے سے ہٹ کر اس نے اپنے طریقے پر نماز پڑھ لی اور اس طریقے کو دین کا حصہ سمجھ کر اس کو دین میں داخل کرلیا، اسی کا نام ''بدعت'' ہے۔

افطار کرنے میں جلدی کیوں؟

یاد رکھیے! دین نام ہے اس بات کا اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس کام کا جس درجہ میں حکم دیا ہے، بس اسی درجے میں اس کی اتباع کی جائے اور اس پر عمل کیا جائے، اگر اس سے آگے یا پیچھے ہٹو گے، تو وہ دین نہیں اور اگر دین سمجھ کر اس کو اختیار کر رہے ہو، تو وہ ''بدعت'' ہے۔ جیسے رمضان میں ہم روزہ رکھتے ہیں، روزے کے لیے صبح سحری کھاتے ہیں، سارا دن بھوکے رہتے ہیں اور جب آفتاب غروب ہوجاتا ہے تو افطار کر لیتے ہیں۔ شریعت کا حکم یہ

ہے کہ جب آفتاب غروب ہوجائے، تو افطار کرنے میں جلدی کرو، افطار کرنے میں دیر مت کرو، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افطار کرنے میں جلدی کیوں کریں؟ جب دن بھر اللہ کے لیے بھوکے پیاسے رہے، تو اب اگر ایک گھنٹہ مزید بھوکے پیاسے رہ جائیں گے، تو اس میں کیا قیامت آجائے گی؟ اور کیا خرابی پیدا ہوجائے گی؟ بظاہر تو اس میں کوئی گناہ کی بات نظر نہیں آتی، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ آفتاب غروب ہونے تک بھوکا پیاسا رہنا ہے، اب آفتاب غروب ہونے کے بعد روزہ نہیں ہے۔ اب اگر تم اس روزے کو آگے بڑھاؤ گے اور یہ سوچو گے کہ ایک گھنٹے کے بعد افطار کروں گا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روزے کی جو میعاد اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقرر کی تھی، اس میں تم نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا، یہ اتباع نہیں ہوئی، اتباع تو یہ ہے کہ جب وہ کہیں کہ مت کھاؤ، تو نہ کھانا عبادت ہے اور جب وہ کہیں کہ کھاؤ، تو اب کھانا واجب ہے، اگر نہیں کھاؤ گے تو گنہگار ہوگے۔

عید کے دن روزہ رکھنے پر گناہ کیوں؟

مثلاً روزہ رکھتے ہوئے رمضان المبارک کا پورا مہینہ گزر گیا اور روزے رکھنے کی اتنی فضیلت ہے کہ جو شخص رمضان المبارک کے روزے رکھے، اللہ تعالیٰ اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیتے ہیں (۱) اور روزے کی یہ فضیلت ہے کہ روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کے منہ سے جو بدبو آرہی ہے، اللہ تعالیٰ کو وہ بو مشک وعنبر سے زیادہ پسندیدہ ہے (۲) لیکن جب عید کا دن آگیا اور اب اگر کسی نے روزہ رکھ لیا تو وہی روزہ جو رمضان میں بڑے اجر و

(۱) صحیح البخاری ۴۵/۳ (۲۰۱۴).
(۲) صحیح البخاری ۲۶/۳ (۱۹۰۴).

ثواب کا موجب تھا، اب الٹا عذاب کا موجب بن جائے گا،[1] حالانکہ اگر کوئی شخص عید کے دن روزہ رکھ لے، تو بظاہر تو کوئی گناہ نظر نہیں آتا، کیونکہ وہ روزہ رکھ کر ایک عبادت ہی انجام دے رہا ہے، لیکن چونکہ وہ شخص اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف عبادت کر رہا ہے، لہذا وہ عبادت نہیں، بلکہ وہ گناہ ہے، اس پر عذاب ہوگا، تو دین نام ہے "اتباع" کا، اب اگر کوئی شخص دین میں کوئی نیا طریقہ جاری کرکے اس کا نام "عبادت" رکھ دے اور اس کو دین کا حصہ قرار دے دے اور اس کو "سنت" کہے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے اور اگر کوئی شخص اس پر عمل نہ کرے تو اس پر لعنت وملامت کرے اور یہ کہے کہ یہ شخص بے دین ہے، یہ طرزِ عمل اس کو "بدعت" بنا دیتا ہے اور بدعت ہونے کے نتیجے میں وہ ثواب کا کام ہونے کے بجائے الٹا گناہ کا کام بن جاتا ہے، اس لیے کہ وہ شخص دین میں اپنی طرف سے اضافہ کرکے گویا کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، جبکہ قرآنِ کریم کا حکم یہ ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ①"[2]

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ یقیناً سب کچھ سنتا سب جانتا ہے۔

جس حد پر انہوں نے رہنے کے لیے کہا ہے، اسی حد پر رہو، اس سے

(۱) ملاحظہ ہو مسند الطیالسی ۲/۵۲۹ (۲۲۱۹) طبع دار الکتب العلمیة. ومسند البزار ۱۵/۱۳۵ (۸٤٤٥).
(۲) سورۃ الحجرات آیت (۱).

آگے نہ بڑھو، اگر آگے بڑھو گے، توتم بدعت کے مرتکب ہو گے۔

سفر میں چار رکعت پڑھنا گناہ کیوں؟

مثلاً سفر کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے رکعتوں کی تعداد کم فرمادی اور یہ حکم دیا کہ شرعی سفر کے دوران چار فرضوں کے بجائے دو فرض پڑھو(۱)۔ اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے بے شک میرے لیے رکعتوں کی تعداد کم کر دی ہے، لیکن میرا دل نہیں مان رہا ہے، میں تو پوری نماز چار رکعت ہی پڑھوں گا۔ ایسا کرنا اس کے لیے جائز نہیں، حالانکہ اگر وہ شخص دو رکعتیں زائد پڑھ رہا ہے، تو وہ کوئی گناہ نہیں کر رہا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اضافہ کر رہا ہے، لیکن چونکہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کر رہا ہے، اس وجہ سے ناجائز اور گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر پکڑ ہو جائے گی کہ ہم نے تم سے دو رکعتیں پڑھنے کو کہا تھا، تم نے چار کیوں پڑھیں؟ معلوم ہوا کہ دین نام ہے ''اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع'' کا وہ جب کم پڑھنے کا حکم دیں، تو کم پڑھو، وہ جب زیادہ کا حکم دیں، تو زیادہ پڑھو، لیکن اپنی طرف سے اس کے اندر کمی زیادتی تمہارے لیے جائز نہیں۔

یہ نکتہ اس لیے سمجھنا ضروری ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں بے شمار طریقے دین کے نام پر جاری کر دیئے گئے ہیں کہ گویا کہ وہ دین کا لازمی حصہ ہیں، اگر کوئی شخص وہ کام نہ کرے، تو وہ ملامتی ہے، اس پر لعنت و ملامت کی جاتی ہے، اس طرح طعن و تشنیع کی جاتی ہے، اس کو برا سمجھا جاتا ہے اور اس کو ایک طرح سے مسلمانوں کی برادری سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ وہ تمام طریقے

(۱) قال اللہ تعالی: '' وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ'' سورہ النساء آیت (۱۰۱).

جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہیں اور ان کو دین کا حصہ بنایا گیا ہے۔ وہ سب ''بدعات'' کی فہرست میں شامل ہیں اور یہ آیت کریمہ جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی یہ ان کی ممانعت کر رہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔

شبِ براءت میں حلوہ گناہ کیوں؟

مثلاً شبِ براءت میں حلوہ پکنا چاہیے اور یہ حلوہ شب براءت کا لازمی حصہ بن گیا ہے، اگر حلوہ نہیں پکا، تو شبِ براءت ہی نہیں ہوئی۔ یا مثلاً رجب میں کونڈے ہوتے ہیں، اگر کوئی شخص کونڈے نہ کرے، تو ملامتی ہے، وہ وہابی ہے، اس پر طرح طرح کی طعن وتشنیع کی جاتی ہے۔ اب اگر ان سے پوچھا جائے کہ کیا کونڈے کا حکم قرآنِ کریم میں کہیں آیا ہے؟ یا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا؟ یا صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا تھا؟ کوئی ثبوت نہیں، بس اپنی طرف سے ایک طریقہ جاری کر کے اس کو اس طرح لازمی قرار دے دیا گیا کہ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ یہ عمل تو ''بدعت'' ہے، تو جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم کوئی گناہ کا کام نہیں کر رہے ہیں؟ ہم کوئی چوری نہیں کر رہے ہیں؟ بلکہ اپنے گھر کے ہی آٹے سے یہ پوریاں بنائیں اور یہ حلوہ بنایا اور اس کو محلہ میں تقسیم کر دیا، اس میں گناہ کی کیا بات ہوئی؟ ارے بھائی! تم روزانہ پوری بناؤ، روزانہ حلوہ بناؤ اور اس کو تقسیم کرو، کوئی گناہ کی بات نہیں، لیکن اس کو دین کا لازمی حصہ قرار دینا اور یہ کہنا کہ جو شخص یہ کام نہیں کر رہا، وہ ملامت کا مستحق ہے، تمہارا یہ طرزِ عمل اس کام کو ''بدعت'' بنا دیتا ہے، جس کے بارے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ"(۱)

اور جو شخص اس عمل کو اتھارٹی کے بغیر دین کا حصہ بناتا ہے، وہ شخص اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔

ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ

یا مثلاً شریعت نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر کسی شخص کا انتقال ہوجائے، تو اس کے عزیز و اقارب اس کے لیے ایصالِ ثواب کریں، کوئی بھی نیک عمل کرکے اس کا ثواب اس کو پہنچائیں، اتنی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہے۔ مثلاً تلاوت قرآنِ کریم کے ذریعے کسی کو ثواب پہنچائیں، نفلیں پڑھ کر پہنچائیں، تسبیحات پڑھ کر پہنچائیں، حج کرکے ثواب پہنچائیں، روزہ رکھ کر پہنچائیں، طواف کرکے ثواب پہنچائیں، عمرہ کرکے ثواب پہنچائیں، یہ سب جائز ہیں اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح ایصال کرنا ثابت ہے(۲) لیکن اس ایصالِ ثواب کے لیے شریعت نے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں

---

(۱) سنن ابی داود ٤/٢٠٠ (٤٦٠٧)۔ وأصله فی صحیح مسلم ٢/٥٩٢ (٨٦٧)

(۲) ایصال ثواب کا ثبوت درج ذیل احادیث سے ہے:

(آ) حدیث عائشة رضی اللہ عنہا عند البخاری ٢/١٠٢ (١٣٨٨) و مسلم ٢/٦٩٦ (١٠٠٤)۔

(ب) حدیث عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما عند البخاری ٤/٧ (٢٧٥٦) و ٤/٩ (٢٧٦٢)۔

(ج) حدیث ابی هریرة رضی اللہ عنہ عند مسلم ٣/١٢٥٤ (١٦٣٠-١٦٣١)۔

(د) حدیث عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما عند ابی داود ٣/١١٨ (٢٨٨٣) قال المناوی فی "التیسیر" ٢/٣١١ اسناده حسن۔

کیا کہ بس اسی طریقے سے کرنا ہوگا، بلکہ سہولت کے ساتھ آدمی کو جس عبادت کا موقع ہو، اس عبادت کے ذریعے ایصالِ ثواب کردے، مثلاً کسی کو تلاوت کے ذریعے ایصالِ ثواب کرنے کا موقع ہے، وہ تلاوت کے ذریعے ایصال کردے، اگر نفلیں پڑھ کر ایصال ثواب کرنے کا موقع ہو، تو نفلیں پڑھ کر ایصال ثواب کر دے۔ بس اخلاص کے ساتھ ایصالِ ثواب کردے، شرعاً ایصالِ ثواب کے لیے نہ تو دن مقرر ہے نہ وقت مقرر ہے، نہ اس کے لیے کوئی طریقہ مقرر ہے، نہ تقریب مقرر ہے۔

تیجہ کرنا گناہ کیوں؟

لیکن لوگوں نے یہ طریقہ اپنی طرف سے مقرر کرلیا کہ مرنے کے تیسرے دن سب کا جمع ہونا ضروری ہے، اس دن سب مل کر قرآن خوانی کریں گے اور جس جگہ ''تیجہ'' ہوگا، وہاں کھانے کی دعوت ہوگی۔ اگر ویسے ہی پہلے دن یا دوسرے دن یا تیسرے دن قرآن شریف اکیلے پڑھ لیتے، لوگوں کے آنے کی وجہ سے جمع ہوکر پڑھ لیتے، تو یہ طریقہ اصلاً جائز تھا، لیکن یہ تخصیص کرنا کہ تیسرے دن ہی قرآن خوانی ہوگی اور سب مل کر ہی کریں گے اور اس میں دعوت ضروری ہوگی اور جو ایسا نہ کرے وہ ''وہابی'' ہے، جب اس مخصوص طریقے کو دین کا لازمی حصہ قرار دیدیا کہ اس کے بغیر دین مکمل نہیں اور اگر کوئی یہ عمل نہ کرے، تو عمل نہ کرنے کے نتیجے میں اس کو مطعون کیا جائے، اس کو گناہ گار قرار دیا جائے، تو یہی چیز اس عمل کو بدعت بنا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی میت کا تیجہ نہ ہوا، تو کہنے والے اس میت کو طعنہ دیتے ہیں کہ

مر گیا مردود، نہ فاتحہ نہ درود

اس طرح اس میت پر طعنہ ہو رہا ہے، جو بے چارہ دنیا سے چلا گیا۔ بس لازمی سمجھنے اور طعنہ دینے نے اس عمل کو بدعت بنا دیا، ورنہ ضروری سمجھے بغیر جس دن چاہو ایصالِ ثواب کر لو، پہلے دن کرلو، دوسرے دن کر لو، تیسرے دن کر لو، چوتھے دن کر لو، پانچویں دن کر لو، مگر یہ تیجہ، دسواں، چالیسواں یہ سب بدعت ہیں۔

عید کے دن گلے ملنا بدعت کیوں؟

اسی طرح ہمارے یہاں یہ عام دستور ہے کہ عید کے دن عید کی نماز کے بعد آپس میں گلے ملتے ہیں اور معانقہ کرتے ہیں۔ اب معانقہ کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں، جائز ہے، لیکن گلے ملنا اس وقت سنت ہے جب کوئی شخص سفر سے آیا ہے اور اس سے پہلی ملاقات ہورہی ہے، تو اس وقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ اس سے گلے ملا جائے اور معانقہ کیا جائے[1]، عام حالات میں معانقہ کرنا سنت بھی نہیں اور گناہ بھی نہیں، مثلاً ایک مسلمان بھائی آپ سے ملنے کے لیے آیا، آپ کا دل چاہا کہ اس سے گلے ملو، آپ نے اسے گلے لگا لیا، تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس میں نہ تو کوئی گناہ ہے اور نہ یہ عمل سنت ہے، اگر کوئی یہ سمجھے عید کے روز عید کی نماز کے بعد گلے ملنا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے یا یہ عمل دین کا حصہ ہے یا اگر گلے نہ ملے، تو گویا کہ عید ہی نہ ہوئی یا گناہ کا ارتکاب ہوگیا یا دین میں خلل واقع ہوگیا، اگر اس عقیدے کی وجہ سے

---

(۱) سنن الترمذی ٤/٤٥٠ (٢٧٣٢) وقال هذا حديث حسن غريب لا نعرفه من حديث الزهری الا من هذا الوجه. وشرح مشكل الآثار ٣/٤١٥ (١٣٨٢) طبع الرسالة.

کوئی شخص عید کے دن گلے مل رہا ہے، تو گلے ملنا بھی بدعت ہے اور ناجائز ہے، اگر سادہ طریقے سے صرف اپنی خوشی کے اظہار کے لیے گلے مل رہا ہے، تو ٹھیک ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو سنت سمجھنا اور اس کو عید کا لازمی حصہ قرار دینا اس عمل کو بدعت بنا دیتا ہے۔

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کا حکم

اسی طرح فرض نماز کے بعد دعا کرنا نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے بعد یہ دعا فرمایا کرتے تھے (۱)، لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہدِ مبارک میں دعا اس طرح ہوتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے طور پر دعا فرما رہے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے طور پر دعا فرما رہے ہیں۔ آج کل دعا کا جو طریقہ رائج ہوگیا ہے کہ امام دعا کے الفاظ کہتا ہے اور باقی لوگ اس پر آمین کہتے ہیں، یہ طریقہ روایات میں کہیں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں، لیکن یہ طریقہ ناجائز بھی نہیں، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ناجائز بھی نہیں کیا، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ طریقہ اختیار کرے، تو کوئی گناہ نہیں، لیکن اگر کوئی شخص دعا کے اس طریقے کو لازمی قرار دے دے اور اس کو نماز کا ضروری حصہ بنا دے اور اس طریقے پر دعا نہ کرنے والے پر طعن و تشنیع کرے، تو اس صورت میں یہ عمل ''بدعت'' ہوجائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ حضرات نے یہاں دیکھا ہوگا کہ میں جمعہ کی نماز کے بعد کبھی اجتماعی دعا کراتا ہوں اور کبھی چھوڑ دیتا ہوں، جب پہلی مرتبہ میں نے دعا نہیں کرائی، تو بہت سے لوگوں

---

(۱) ملاحظہ ہو صحیح البخاری ۱/۱۶۸ (۸۴۴).

نے سوال کیا کہ حضرت! آپ نے دعا چھوڑ دی؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے اس لیے چھوڑی کہ لوگوں کے دلوں میں اس دعا کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ یہ دعا نماز کا لازمی حصہ ہے اور جب دعا چھوڑ دی، تو لوگوں کو اشکال ہوگیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ اجتماعی دعا کے بغیر نماز نامکمل ہے۔ بس یہ خیال اس کو ''بدعت'' بنا دیتا ہے، اس لیے کبھی دعا کر لینی چاہیے اور کبھی چھوڑ دینی چاہیے۔

پھر یہ عمل جائز ہے

جب لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ''تیجہ'' کرنا بدعت ہے ''چالیسواں'' کرنا بدعت ہے، تو جواب میں عام طور پر لوگ یہی کہتے ہیں کہ کوئی گناہ کا کام نہیں کررہے، بلکہ قرآن شریف پڑھ رہے ہیں اور لوگوں کی دعوت کر رہے ہیں اور نہ قرآن شریف پڑھنا گناہ ہے اور نہ لوگوں کی دعوت کرنا گناہ ہے۔ بے شک یہ دونوں گناہ نہیں، بشرطیکہ ان کو لازم مت سمجھو اور اگر کوئی شخص اس میں شریک نہ ہو، تو اس کو طعنہ مت دو اور اس عمل کو دین کا حصہ مت سمجھو، تو پھر یہ عمل بے شک جائز ہے۔ جو آیتِ کریمہ میں نے تلاوت کی، اس کے معنی یہ ہیں کہ ''اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو'' اس مفہوم میں یہ سب بدعات بھی داخل ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی طریقہ گھڑ کر اس کو لازمی قرار دے دیا جائے اور جو شخص وہ طریقہ اختیار نہ کرے، اس کو مطعون کیا جائے۔

قبروں پر پھول کی چادر چڑھانا

اسی طرح قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانا ''بدعت'' میں داخل ہے،

دیکھیے! ویسے ہی آپ کا دل چاہا کہ میں اپنے باپ کی قبر پر چادر چڑھاؤں، چنانچہ اس کو دین کا حصہ اور ثواب سمجھے بغیر آپ نے قبر پر چادر چڑھادی، تو یہ جائز ہے، لیکن اس کو دین کا حصہ قرار دینا اور باعثِ اجر وثواب قرار دینا اور اگر کوئی شخص نہ چڑھائے، تو اس پر طعنہ دینا اور کہنا کہ اس نے میت کی تعظیم میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے، یہ چیزیں اس عمل کو بدعت بنا دیتی ہیں۔ جو چیز جس حد میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مقرر فرمائی ہے، اس کو اس کی حد سے آگے بڑھانا۔ مثلاً جو عمل مستحب ہے، اس کو سنت کا درجہ دینا اور جو عمل سنت ہے، اس کو واجب کا درجہ دینا، یہ سب بدعت میں داخل ہے اور اس آیت ''لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ'' کی ممانعت کے تحت داخل ہے۔

خلاصہ

یہ ''بدعت'' کا مختصر مفہوم ہے، جس کا حکم اس آیتِ کریمہ سے نکل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمارے دلوں میں صحیح بات اتار دے اور دین کا صحیح مطلب ہماری سمجھ میں آجائے، دین کی صحیح تشریح اور تعبیر ہماری سمجھ میں آجائے اور ہماری زندگی اپنی رضا کے مطابق قبول فرمالے، آمین۔ خوب سمجھ لیں کہ اس بیان کے ذریعے کسی پر اعتراض کرنا مقصود نہیں، کسی پر ملامت کرنا مقصود نہیں، ہم سب کو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے، ہم سب کو اپنی اپنی قبروں میں سونا ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے، لہٰذا کسی بات پر ڈٹنے اور اڑنے کی بات نہیں کہ یہ طریقہ تو ہمارے باپ دادا سے چلا آرہا ہے، لہٰذا اس کو کیسے چھوڑیں؟ اللہ تعالیٰ ہمارے دل میں یہ بات ڈال دے کہ دین

جو کچھ ہے وہ جناب محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، اس سے آگے بڑھ کر جو کام کیا جا رہا ہے، وہ دین نہیں ہوسکتا، چاہے اس کا رواج صدیوں سے چلا آ رہا ہو اور وہ کام قابلِ ترک ہے اور چھوڑنے کے قابل ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

بدعت ایک سنگین گناہ

(اصلاحی خطبات ج ۱ ص ۷ ۲۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بدعت ایک سنگین گناہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّآ إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!
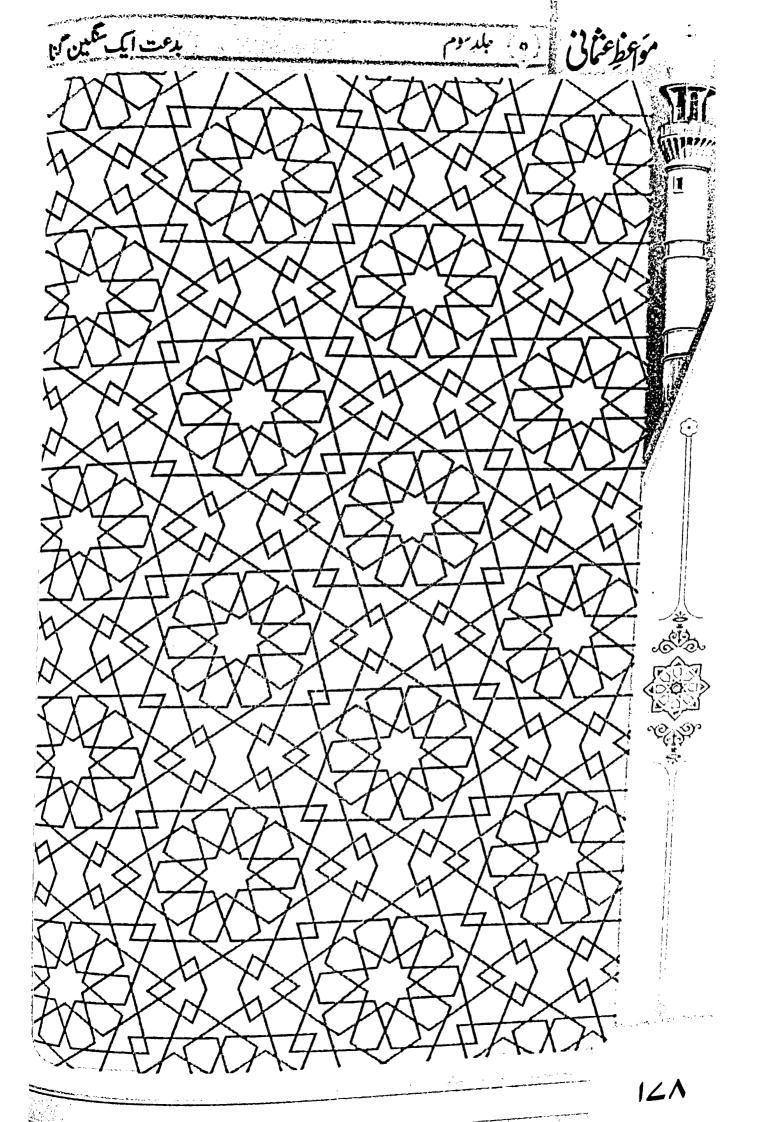
عن جابر بن عبد الله رضى الله عنهما، قال: كان رسول الله ﷺ إذَا خَطَبَ احْمَرَّتْ عَيْنَاهُ، وَعَلاَ صَوْتُهُ، وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ، حتّٰى كَأَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ يقولُ: «صَبَّحَكُمْ وَمَسَّاكُمْ»، ويقولُ: «بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ»، وَيَقْرُنُ بَيْنَ إِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةِ، وَالْوُسْطٰى، ويقولُ: «أَمَّا

بَعْـدُ، فإنَّ خَيرَ الحَديثِ كِتابُ اللهِ، وَخَيْرُ الهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَشَرُّ الأُمُورِ مُحْدَثاتُها، وَكُلُّ بدْعَةٍ ضَلالَةٌ» ثُمَّ يقولُ: «أَنَا أَوْلَى بكُلِّ مُؤْمِنٍ مِن نَفْسِهِ، مَن تَرَكَ مَالًا فلأَهْلِهِ، وَمَن تَرَكَ دَيْنًا، أَوْ ضَياعًا فَإِلَيَّ وَعَلَيَّ». (۱)

لفظ ''جابر'' اور ''جبّار'' کے معنی

یہ حدیث حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخصوص صحابہ کرام میں سے ہیں اور انصاری صحابی ہیں۔ مدینہ طیبہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام ''جابر'' ہے، بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ ''جابر'' تو ظالم آدمی کو کہتے ہیں، تو پھر ان صحابی کا نام ''جابر'' کیسے رکھ دیا گیا؟ اور اللہ تعالیٰ کے نام گرامی ''جبّار'' کے بارے میں بھی یہی شبہ ہوتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء الحسنیٰ میں سے ایک نام ''جبّار'' بھی ہے اور اردو میں ''جبّار'' کے معنی ہیں بہت ظلم کرنے والا۔ اس لیے عام طور پر لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ''جبّار'' کا لفظ کیسے استعمال کیا گیا؟

اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں ''جابر'' کے وہ معنی نہیں ہیں جو اردو میں ہیں۔ اردو میں ''جابر'' کے معنی ظالم کے آتے ہیں، لیکن عربی میں ''جابر'' کہتے ہیں ٹوٹی ہوئی چیز کو جوڑنے والا۔ ٹوٹی ہڈی جوڑنے کو ''جبر'' کہتے ہیں اور جو شخص ٹوٹی ہڈی کو جوڑے اس کو ''جابر'' کہتے ہیں، تو ''جابر'' کے معنی ٹوٹی ہوئی چیز کو جوڑنے والا اور یہ کوئی غلط معنی نہیں ہیں، بلکہ بہت اچھے معنی

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۵۹۲ (۸۶۷)۔

ہیں۔ اسی طرح ''جبّار'' کے معنی ہوئے بہت زیادہ ٹوٹی ہوئی چیزوں کو جوڑنے والا، تو اللہ تعالیٰ کا جو نام ''جبّار'' ہے اس کے معنی معاذ اللہ ظلم کرنے والے یا عذاب دینے والے کے نہیں ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو چیز ٹوٹ گئی ہو اس کو اللہ تعالیٰ جوڑنے والے ہیں۔ (۱)

ٹوٹی ہڈی جوڑنے والی ذات صرف ایک ہے

اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو بہت سی دعائیں تلقین فرمائی ہیں، ان میں سے ایک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس نام سے پکارا گیا ہے:

''یاجابر العظم الکسیر''(۲)

اے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے والے۔

اس نام سے خاص طور پر اس لیے پکارا کہ دنیا کے تمام اطباء معالج اور ڈاکٹر اس بات پر متفق ہیں کہ اگر ہڈی ٹوٹ جائے، تو کوئی دوا اور کوئی علاج ایسا نہیں ہے جو اس کو جوڑ سکے، انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو اس کی صحیح پوزیشن پر رکھ دے، لیکن کوئی مرہم کوئی لوشن، کوئی دوا، کوئی معجون ایسی نہیں ہے، جو ٹوٹی ہڈی پر لگادی جائے اور وہ جُڑ جائے، جوڑنے والی ذات، تو صرف وہی ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کو ''جبّار'' کہا جاتا ہے نہ کہ اس معنی میں جیسا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔

---

(۱) ملاحظہ ہو: تاج العروس للزبیدی ۳۴۷/۱۰ مادہ جبر طبع دار الهداية. ولسان العرب للافريقي ۱۱۳/٤ مادہ جبر طبع دار صادر بيروت.

(۲) زهر الفردوس ۳۵۱/۲ (٦١٩) طبع جمعية دار البر.

لفظ ''قہار'' کے معنی

اسی طرح باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ایک نام ''قہار'' ہے۔ اردو کی اصطلاح میں ''قہار'' اس کو کہتے ہیں جو لوگوں پر بہت قہر کرے، غصہ کرے اور لوگوں کو بہت تکلیف پہنچائے، لیکن باری تعالیٰ کے اسمائے گرامی جو لفظ ''قہار'' ہے وہ عربی زبان والا قہار ہے اردو زبان کا نہیں ہے اور عربی زبان میں ''قہار'' کے معنی ہیں غلبہ پانے والا، غالب، جو ہر چیز پر غالب ہو۔ اس کو ''قہار'' کہتے ہیں یعنی وہ ذات جس کے سامنے ہر چیز مغلوب ہے اور وہ سب پر غالب ہے۔(۱)

اللہ تعالیٰ کا کوئی نام عذاب پر دلالت نہیں کرتا

بلکہ باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں کوئی ایسا نام نہیں ہے جو عذاب پر دلالت کرتا ہو، سارے اسمائے گرامی یا رحمت پر دلالت کرتے ہیں یا ربوبیت پر دلالت کرتے ہیں یا قدرت پر دلالت کرتے ہیں، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے اسمائے حسنیٰ میں کوئی نام ایسا نہیں ہے جو عذاب پر دلالت کرنے والا ہو اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اصل صفت رحمت کی ہے، وہ اپنے بندوں پر رحیم ہے، وہ رحمن ہے، وہ کریم ہے۔ ہاں! جب بندے حد سے گزر جائیں، تو پھر بے شک اس کا غضب بھی نازل ہوتا ہے، اس کا عذاب بھی برحق ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات میں بیان ہوا ہے، لیکن باری تعالیٰ کی جو صفات بیان کی گئی ہیں اور جو اسمائے حسنیٰ سے موسوم ہیں، ان میں عذاب کا ذکر صراحۃً موجود نہیں ہے۔

---

(۱) لسان العرب ۱۲۰/۵ مادہ قہر۔ تاج العروس ۴۹۵/۱۳ مادہ ق ہ ر۔

خطبے کے وقت آپ ﷺ کی کیفیت

بہر حال! حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

"كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا خَطَبَ احْمَرَّتْ عَيْنَاهُ وَعَلَا صَوْتُهُ وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ"

جب نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے خطاب فرماتے تھے، تو بکثرت آپ ﷺ کی مبارک آنکھیں سرخ ہوجاتی تھیں اور آواز بلند ہوجاتی تھی، یہ اس لیے ہوتا تھا کہ جو بات کہتے تھے وہ دل کی آواز تھی اور دل میں یہ جذبہ تھا کہ کسی طرح سننے والے کے دل میں اُتر جائے اور اس کو سمجھ لے اور اس پر عمل کرنا شروع کردے، اس جذبے کے تحت کبھی کبھی آپ ﷺ کی مبارک آنکھیں سرخ ہوجاتیں اور آپ ﷺ کی آواز بلند ہوجاتی اور آپ ﷺ کا جوش زیادہ ہوجاتا تھا۔

آپ ﷺ کا اندازِ تبلیغ

"حَتّٰى كَأَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ يَقُوْلُ صَبَّحَكُمْ وَمَسَّاكُمْ"

بعض اوقات ایسا لگتا تھا کہ آپ ﷺ لوگوں کو کسی آنے والے لشکر سے ڈرا رہے ہیں کہ بھائی تمہارے اوپر دشمن کا لشکر حملہ آور ہونے والا ہے، خدا کے لیے اس سے بچنے کا کوئی سامان کرو اور یہ فرماتے تھے کہ وہ لشکر صبح پہنچا یا شام

پہنچا، یعنی وہ لشکر عنقریب پہنچنے والا ہے اس کے پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں ہے، لہٰذا تم اس لشکر سے بچاؤ کا سامان کرو۔

اس لشکر سے مراد ہے قیامت کا دن اور حساب و کتاب اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے جواب دہی اور اس جواب دہی کے نتیجے میں عذابِ جہنم۔ اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے۔ اس سے ڈراتے تھے کہ یہ وقت صبح یا شام کسی بھی وقت آسکتا ہے اس سے ڈرو اور اس سے بچنے کی کوشش کرو۔

آپ حضرات نے سنا ہوگا کہ سب سے پہلے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قوم کو جبلِ صفا پر چڑھ کر دین کی دعوت دی، جتنے خاندان مکہ میں تھے ان سب کا نام لے کر پکارا اور ان کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر چھپا بیٹھا ہے اور وہ تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے، تو کیا تم میری اس بات کی تصدیق کروگے یا نہیں؟ سب نے یک زبان ہوکر کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہم آپ کی اس بات کی تصدیق کریں گے، اس لیے کہ آپ نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی غلط بات نہیں کی اور کبھی جھوٹ نہیں بولا، آپ ''صادق'' اور ''امین'' کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ آخرت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا بہت سخت عذاب تمہارا انتظار کررہا ہے، اس عذاب سے اگر بچنا چاہتے ہو، تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لاؤ[1]۔

---

(۱) صحیح البخاری ۱۱۱/٦ (٤٧٧٠) وصحیح مسلم ۱۹۳/۱ (۲۰۸).

اہلِ عرب کا مانوس عنوان

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبات میں یہ تصور بکثرت پایا جاتا ہے کہ "میں تم کو دشمن کے لشکر سے ڈرانے والا ہوں، جو تم پر حملہ آور ہونے والا ہے۔" ڈرانے کے لیے یہ تعبیر اور یہ عنوان اہلِ عرب کے لیے بڑا مانوس تھا۔ کیونکہ عرب لوگ آپس میں ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، ایک قبیلہ دوسرے پر حملہ کر رہا ہے، دوسرا تیسرے پر حملہ کر رہا ہے، دن رات یہی سلسلہ رہتا تھا، جو شخص ان کو آ کر یہ بتادے کہ فلاں دشمن تمہاری گھات میں ہے اور تمہارے اوپر حملہ کرنے والا ہے، وہ خبر دینے والا بڑا ہم درد سمجھا جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ جیسے تم کو کوئی شخص دشمن کے لشکر سے باخبر کرتا ہے، ایسے ہی میں تم کو باخبر کر رہا ہوں کہ ایک بہت بڑا عذاب تمہارا انتظار کر رہا ہے، وہ عذاب صبح پہنچا یا شام۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور قربِ قیامت

پھر آگے فرمایا:

"بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ وَيَقْرُنُ بَيْنَ اُصْبَعَيْهِ؛ السَّبَابَةِ وَالْوُسْطٰى"

میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں جیسے شہادت کی اُنگلی اور بیچ کی اُنگلی اور دونوں انگلیاں اُٹھا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس طرح ان دونوں اُنگلیوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں، بلکہ دونوں ملی ملی ہیں، اسی طرح میں

اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں کہ دونوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں، وہ قیامت بہت جلد آنے والی ہے، بلکہ حضور ﷺ سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں، انبیاء علیہم السلام لوگوں کو قیامت سے ڈراتے تھے، تو قیامت کی ایک بہت بڑی علامت نبی کریم ﷺ کی بعثت کا ذکر فرماتے تھے کہ قیامت کی ایک علامت یہ ہے کہ آخری دور میں نبی کریم سرورِ دوعالم ﷺ تشریف لانے والے ہیں۔ (۱)

ایک اشکال کا جواب

اب لوگوں کو اشکال ہوتا ہے کہ چودہ سو سال تو حضورِ اقدس ﷺ کو گزر گئے اب تک تو قیامت آئی نہیں، بات دراصل یہ ہے کہ ساری دنیا کی عمر کے لحاظ سے اگر دیکھو گے اور جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اس کا لحاظ کر کے اگر دیکھو گے، تو ہزار دو ہزار سال کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: میرے اور قیامت کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے، وہ قیامت بہت قریب آنے والی ہے۔

ہر انسان کی موت اس کی قیامت ہے

لیکن ہر انسان کی قیامت، تو قریب ہے، کیونکہ:

---

(۱) عن الحسن فی قوله تعالی: "فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا" قال: محمد صلی الله علیه وسلم من اشراطها. تفسیر ابن ابی حاتم ۳۲۹۸/۱۰ (۱۸۵۸۶) طبع مکتبة نزار مصطفی الباز السعودية وتفسير البغوی ۲۱۴/۴ طبع دار احیاء التراث العربی.

"مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ"(۱)

جو مرگیا اور جس کو موت آ گئی، اس کی قیامت تو اُسی دن قائم ہوگئی۔

اس واسطے جب قیامت آنے والی ہے خواہ وہ مجموعی قیامت ہو یا انفرادی اور اس کے بعد خدا جانے کیا معاملہ ہونے والا ہے، اس لیے میں تم کو ڈرا رہا ہوں کہ وہ وقت آنے سے پہلے تیاری کرلو اور اس وقت کے آنے سے پہلے ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے آپ کو عذابِ جہنم اور عذابِ قبر سے بچالو۔

بہترین کلام اور بہترین طرزِ زندگی

پھر فرمایا:

"فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ"

اس روئے زمین پر بہترین کلام اور سب سے اچھا کلام اللہ کی کتاب ہے۔ اس سے بڑھ کر، اس سے اعلیٰ، اس سے زیادہ افضل، اس سے زیادہ بہترین کلام کوئی نہیں اور زندگی گزارنے کے جتنے طریقے ہیں، جتنے طرزِ زندگی ہیں، ان میں سب سے بہترین طرزِ زندگی محمد ﷺ کا طرزِ زندگی ہے۔ یہ بات حضور ﷺ اپنے بارے میں خود فرما رہے ہیں۔ کوئی بھی شخص اپنے

(۱) عن انس بن مالك رضى الله عنه عن النبى ﷺ انه قال الموت القيامة من مات فقد قامت قيامته۔ مجموعة رسائل ابن ابى الدنيا۵/۴۴۷(۱۷۳) كتاب ذكر الموت/الخوف من الله تعالى۔ طبع المكتبة العصرية بيروت۔ وذكره العراقى فى "تخريج احاديث الاحياء" ۲/۱۲۳۱ وقال باسناد ضعيف۔ طبع المكتبة الطبرية الرياض۔

بارے میں یہ نہیں کہتا کہ میرا طریقہ سب سے اعلیٰ ہے، مجھ سے زیادہ بہتر کوئی نہیں، لیکن چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو بھیجا ہی اس لیے ہے کہ لوگوں کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمونہ ہوں، زندگی گزارنی ہے تو اس طرح گزارو، اگر زندگی گزارنے کا طریقہ اختیار کرنا ہے تو یہ طریقہ اختیار کرو، اس واسطے دعوت و تبلیغ کی ضرورت کے تحت ارشاد فرمارہے ہیں کہ بہتر طریقہ وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے واسطے چھوڑا ہے۔ اُٹھنے بیٹھنے میں، کھانے پینے میں، سونے جاگنے میں، دوسروں کے ساتھ معاملات کرنے میں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں جو طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمادیا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہوسکتا۔

بدعت بدترین گناہ ہے

پھر آگے جن چیزوں سے گمراہی کے امکانات ہوسکتے تھے، ان کی جڑیں بتادیں، فرمایا:

''شَرُّ الاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ''

اس روئے زمین پر بدترین کام وہ ہیں جو نئے طریقے دین میں ایجاد کیے جائیں، حدیث میں ''بدترین کام'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ بدعت ایک ایسی چیز ہے جو ایک لحاظ سے ظاہری گناہوں سے بھی بدتر ہے، اس لیے کہ ظاہری فسق و فجور اور گناہ وہ ہیں کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا وہ ان کو بُرا سمجھے گا، کوئی مسلمان اگر کسی گناہ میں مبتلا ہے، مثلاً شراب پیتا ہے، بدکاری کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، غیبت کرتا ہے، اس سے اگر پوچھا

جائے کہ یہ کام تمہارے خیال میں کیسے ہیں؟ جواب میں یہی کہے گا یہ کام ہیں تو بُرے لیکن میں کیا کروں، میں مبتلا ہوں۔ لہٰذا ان برائیوں کو کرنے والا بُرا سمجھے گا اور جب بُرا سمجھے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو کبھی نہ کبھی توبہ کی توفیق بھی عطا فرما دیں گے۔

لیکن بدعت، یعنی جو چیز دین میں نئی ایجاد کی گئی ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ حقیقت وہ گناہ ہوتی ہے، لیکن جو شخص اس بدعت کو کر رہا ہوتا ہے، وہ اس کو بُرا نہیں سمجھتا یہ سمجھتا ہے کہ یہ تو بہت اچھا عمل ہے اور دوسرا کوئی اگر اس سے یہ کہے کہ یہ بُری بات ہے، تو بحث کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور اس سے مناظرہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے، کہ اس میں کیا خرابی اور کیا حرج ہے؟ اور جب ایک شخص گناہ کو گناہ سمجھتا ہی نہیں ہے اور برائی کو برائی سمجھتا ہی نہیں ہے، تو اس کے نتیجے میں وہ گمراہی میں اور زیادہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ”شَرُّ الْاُمُوْر“ جس کے معنی یہ ہیں کہ جتنے بُرے کام ہیں ان میں سب سے بدتر کام بدعت ہے۔ جو دین میں ایسا نیا طریقہ ایجاد کرے جو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے طریقے سے مختلف ہو اور پھر آگے اس کی وجہ بھی بتادی کہ ہر بدعت گمراہی ہے، لہٰذا جو شخص کسی بدعت کے اندر مبتلا ہے، وہ لازماً گمراہی کے اندر مبتلا ہے۔

⑤ بدعت، اعتقادی گمراہی ہے

ایک ہوتی ہے عملی کوتاہی، یعنی ایک شخص کسی عملی کوتاہی کے اندر مبتلا ہے اس سے غلطیاں ہو رہی ہیں، گناہ سرزد ہو رہے ہیں اور ایک ہوتی ہے اعتقادی گمراہی کہ کوئی شخص کسی ناحق بات کو حق سمجھ رہا ہے اور گناہ کو ثواب سمجھ رہا ہے،

کفر کو ایمان سمجھ رہا ہے، پہلی چیز یعنی عملی کوتاہی کا مداوا تو آسان ہے کہ کبھی نہ کبھی توبہ کرلے گا، تو معاف ہوجائے گی، لیکن جو شخص گناہ کو ثواب سمجھ رہا ہے، اس کی ہدایت بہت مشکل ہے اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ بدترین گناہ بدعت کا گناہ ہے، اسی لیے حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بدعت سے اتنا بھاگتے تھے کہ کوئی حد نہیں۔

بدعت کی سب سے بڑی خرابی

بدعت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ آدمی خود دین کا مُوجِد بن جاتا ہے۔ حالانکہ دین کا موجد کون ہے؟ صرف اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے جو دین بنایا وہ ہمارے لیے قابلِ اتباع ہے، لیکن بدعت کرنے والا خود دین کا مُوجِد بن جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دین کا راستہ میں بنارہا ہوں اور درپردہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ جو میں کہوں وہ دین ہے اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دین کا جو راستہ بتایا اور جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے عمل کیا، میں ان سے بڑھ کر دین دار ہوں، میں دین کو ان سے زیادہ جانتا ہوں، تو یہ شریعت کی اتباع نہیں ہے، بلکہ اپنی خواہشِ نفس کی اتباع ہے۔

دنیا میں بھی خسارہ اور آخرت میں بھی خسارہ

ہندو مذہب میں کتنے لوگ گنگا کے کنارے اللہ کو راضی کرنے کے لیے ایسی ایسی ریاضتیں اور ایسی ایسی محنتیں کرتے ہیں جن کو دیکھ کر انسان حیران ہوجاتا ہے، کوئی آدمی اپنا ہاتھ بلند کرکے سالہا سال تک اسی طرح کھڑا ہے،

ہاتھ نیچے بھی نہیں کرتا۔ کسی آدمی نے سانس کھینچا ہوا ہے اور گھنٹوں سانس نہیں لے رہا ہے اور حبسِ دم کررہا ہے، اس سے اگر پوچھا جائے تو یہ کام کیوں کررہا ہے؟ تو جواب دے گا کہ یہ میں اس لیے کررہا ہوں کہ میرا اللہ راضی ہوجائے، اب چاہے وہ اللہ کو بھگوان کا نام دے یا کچھ اور کہے، لیکن بتائیے اس کے اس عمل کی کوئی قیمت ہے؟ حالانکہ اس کی نیت بظاہر درست معلوم ہوتی ہے لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں، اس لیے کہ اللہ کو راضی کرنے کا جو طریقہ اس نے اختیار کیا ہے وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا نہیں ہے، بلکہ وہ طریقہ اس نے اپنے دل و دماغ سے گھڑ لیا ہے۔ اس واسطے اللہ کے یہاں اس کا کوئی عمل مقبول نہیں۔ ایسے اعمال کے بارے میں قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

”وَ قَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾“(۱)

جو لوگ ایسے عمل کرتے ہیں ہم ان کے عمل کو اس طرح اُڑا دیتے ہیں جیسے ہوا میں اُڑائی ہوئی مٹی اور گرد و غبار۔

عمل کیا، لیکن اکارت گیا۔ محنت بھی کی، لیکن بے کار گئی اور دوسری جگہ پر کتنے پیارے اور شفقت بھرے انداز سے قرآنِ کریم نے فرمایا:

”قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ

---

(۱) سورۃ الفرقان آیت (۲۳).

يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (۱)"(۱)

قرآنِ کریم نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ لوگوں سے کہیں! کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس دنیا میں سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟ پھر فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا عمل اس دنیا میں اکارت ہوگیا اور دل میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کررہے ہیں۔ یہ لوگ اس لیے خسارے میں ہیں کہ جو فاسق و فاجر تھا یا جو کافر تھا، اس نے کم از کم دنیا میں عیش کرلیے، آخرت اگرچہ تباہ ہوئی، لیکن دنیا میں عیش کرگیا اور یہ شخص تو اپنی دنیا کے عیش و آرام بھی خراب کررہا ہے اور محنت بھی اُٹھارہا ہے اور آخرت بھی بگاڑ رہا ہے، اس واسطے کہ اس نے عبادت کا وہ طریقہ اختیار کیا ہوا ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتایا۔ اسی لیے بدعت کے بارے میں فرمایا: "شر الامور" سارے کاموں میں بدترین کام بدعت ہے۔ اس لیے کہ آدمی محنت تو کرتا ہے، لیکن حاصل کچھ نہیں۔

دین نام ہے اتباع کا

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمارے اور آپ کے دلوں میں یہ بات بٹھا دے کہ دین اصل میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا نام ہے۔ اپنی طرف سے کوئی بات گھڑنے کا نام دین نہیں ہے؟ عربی زبان میں دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک اتباع اور ایک ابتداع، اتباع کے معنی ہیں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پیروی کرنا اور ابتداع کے معنی ہیں اپنی طرف سے کوئی چیز ایجاد کرکے اس کے پیچھے چل پڑنا۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

(۱) سورۃ الکہف آیت (۱۰۳-۱۰۴).

خلیفہ بنے، تو سب سے پہلا جو خطبہ دیا، اس میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

"اِنَّمَا اَنَا مُتَّبِعٌ وَلَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ"[1]

میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کا متبع ہوں، مبتدع نہیں۔ یعنی کوئی نیا راستہ ایجاد کرنے والا نہیں ہوں، لہٰذا ساری قیمت اللہ کے حکم کے آگے سر جھکانے کی ہے، اپنی طرف سے جو بات کی جائے اس کا کوئی وزن کوئی قدر و قیمت نہیں۔

ایک عجیب واقعہ

ایک واقعہ آپ نے بکثرت سنا ہوگا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کبھی رات کے وقت مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حالات دیکھنے کے لیے نکلتے تھے کہ کون کیا کر رہا ہے، ایک مرتبہ تہجد کے وقت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر سے نکلے اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ وہ عاجزی کے ساتھ نہایت آہستہ آواز سے تہجد کی نماز میں تلاوت کر رہے ہیں۔ آگے جا کر دیکھا کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ تہجد پڑھ رہے تھے اور اس میں بلند آواز سے قرآنِ کریم کی تلاوت کر رہے ہیں اور ان کی تلاوت کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ خیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دیکھتے ہوئے واپس تشریف لے آئے۔

بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صدیقِ اکبر اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما دونوں کو اپنے پاس بلایا اور پہلے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میں رات کو تہجد

(۱) الاموال لابی عبید قاسم بن سلام ص ۱۲ (۸) طبع دار الفکر. والطبقات الکبری لابن سعد ۱۸۲/۳ طبع دار صادر بیروت.

کے وقت تمہارے پاس سے گزرا، تو تم بہت آہستہ آہستہ آواز میں تلاوت کرر ہے تھے۔ آپ اتنی آہستہ آواز سے کیوں تلاوت کرر ہے تھے؟ اس کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا:

"أَسْمَعْتُ مَنْ نَاجَيْتُ"

یارسول اللہ! جس ذات سے میں مناجات کرر ہا تھا، جس سے تعلق قائم کیا تھا، جس ذات کو میں سنانا چاہتا تھا، اس کو تو سنادیا اب آواز بلند کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے میں آہستہ تلاوت کرر ہا تھا۔

پھر حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم زور زور سے تلاوت کرر ہے تھے اس کی کیا وجہ تھی؟ انہوں نے جواب میں فرمایا:

"اِنِّیْ اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاُطْرِدُ الشَّیْطَانَ"

میں زور سے اس لیے تلاوت کرر ہا تھا تا کہ جو لوگ پڑے سور ہے ہیں وہ بیدار ہو جائیں اور شیطان بھاگ جائے، اس لیے جتنی زور سے تلاوت کروں گا شیطان بھاگے گا، اس لیے میں زور سے تلاوت کرر ہا تھا۔

اب ذرا دیکھیے کہ دونوں کی باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بات بھی صحیح کہ اللہ تعالیٰ کو سنار ہا ہوں، کسی دوسرے کو سنانے کی کیا ضرورت؟ اور حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی بات بھی درست ہے کہ میں سونے والوں کو جگار ہا تھا شیطان کو بھگار ہا تھا، لیکن اس کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے ابوبکر! تم نے اپنی سمجھ سے یہ راستہ اختیار کیا کہ بہت آہستہ تلاوت کرنی چاہیے اور اے عمر! تم نے اپنی سمجھ

سے یہ راستہ اختیار کیا کہ زور سے تلاوت کرنی چاہیے، لیکن تم دونوں نے چونکہ اپنی اپنی سمجھ سے یہ راستہ اختیار کیا تھا اس لیے یہ پسندیدہ نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ نہ زیادہ زور سے تلاوت کرو اور نہ زیادہ آہستہ تلاوت کرو، بلکہ معتدل آواز سے تلاوت کرو، اس میں زیادہ نور اور برکت ہے اور اسی میں زیادہ فائدہ ہے، اس کو اختیار کرو(۱)۔

معلوم ہوا کہ عبادت کے اندر اپنی طرف سے کوئی راستہ اختیار کر لینا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ نہیں، جتنا اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بتایا ہوا راستہ پسندیدہ ہے۔ بس جو راستہ ہم نے بتایا ہے وہ راستہ اختیار کرو، اس میں جو نور اور فائدہ ہے وہ کسی اور میں نہیں۔

دین کی ساری روح یہ ہے کہ طاعت اور عبادت اللہ کے حکم اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کرنی ہے، اپنی طرف سے کوئی طریقہ گھڑ لینا درست نہیں۔

ایک بزرگ کا آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں بیان کیا کہ ان کے قریب کے زمانے میں ایک بزرگ تھے، وہ جب نماز پڑھا کرتے تھے، تو آنکھیں بند کر کے نماز پڑھتے تھے اور فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ نماز میں ویسے تو آنکھ

---

(۱) سنن ابی داود ۲/۳۷ (۱۳۲۹) وسنن الترمذی ۱/۴۶۵ (۴۴۷) وقال ھذا حدیث غریب. والمستدرك للحاكم ۱/۴۵٤ (۱۱۶۸) وقال ھذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین.

بند کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر کسی شخص کو اس کے بغیر خشوع حاصل نہ ہوتا ہو تو اس کے لیے آنکھ بند کر کے نماز پڑھنا جائز ہے، کوئی گناہ نہیں ہے۔ تو وہ بزرگ نماز بہت اچھی پڑھتے تھے تمام ارکان میں سنت کی رعایت کے ساتھ پڑھتے تھے، لیکن آنکھ بند کر کے نماز پڑھتے تھے اور لوگوں میں ان کی نماز مشہور تھی کیونکہ نہایت خشوع و خضوع اور نہایت عاجزی کے ساتھ نماز پڑھتے تھے وہ بزرگ صاحبِ کشف بھی تھے۔

ایک مرتبہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی یا اللہ! میں یہ جو نماز پڑھتا ہوں میں اس کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے یہاں میری نماز قبول ہے یا نہیں؟ اور کس درجہ میں قبول ہے اور اس کی صورت کیا ہے؟ وہ مجھے دکھادیں اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی اور ایک نہایت حسین وجمیل عورت سامنے لائی گئی جس کے سر سے لے کر پاؤں تک تمام اعضاء میں نہایت تناسب اور توازن تھا، لیکن اس کی آنکھیں نہیں تھی، بلکہ اندھی تھی اور ان سے کہا گیا یہ ہے تمہاری نماز۔ ان بزرگ نے پوچھا کہ یا اللہ! یہ اتنے اعلیٰ درجے کی حسن و جمال والی خاتون ہے، مگر اس کی آنکھیں کہاں ہے؟ جواب میں فرمایا کہ تم نماز پڑھتے ہو وہ آنکھیں بند کر کے پڑھتے ہو، اس واسطے تمہاری نماز ایک اندھی عورت کی شکل میں دکھائی گئی ہے۔

نماز میں آنکھ بند کرنے کا حکم

یہ واقعہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے بیان فرمایا اور حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بات دراصل یہ تھی کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھنے کا جو سنت طریقہ

بتایا، وہ یہ تھا کہ آنکھیں کھول کر نماز پڑھو، سجدہ کی جگہ پر نگاہ ہونی چاہیے، یہ ہمارا بتایا ہوا طریقہ ہے، اگرچہ دوسرا طریقہ جائز ہے گناہ نہیں ہے، لیکن سنت کا نور اس میں حاصل نہیں ہوسکتا، اگرچہ فقہائے کرام نے یہ فرمایا کہ اگر نماز میں خیالات بہت آتے ہیں اور خشوع حاصل کرنے کے لیے اور خیالات کو دفع کرنے کے لیے کوئی شخص آنکھیں بند کرکے نماز پڑھتا ہے، تو کوئی گناہ نہیں۔ جائز ہے مگر پھر بھی خلافِ سنت ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساری عمر کبھی کوئی نماز آنکھیں بند کرکے نہیں پڑھی، اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے کبھی کوئی نماز آنکھ بند کرکے نہیں پڑھی، اس لیے فرمایا کہ ایسی نماز میں سنت کا نور نہیں ہوگا۔

"لَمْ يَكُنْ مِنْ هَدْيِهِ ﷺ تَغْمِيضُ عَيْنَيْهِ فِي الصَّلٰوةِ"(۱)

نماز میں وساوس اور خیالات

اور یہ جو خیال ہو رہا ہے کہ چونکہ نماز میں خیالات و وساوس بہت آتے ہیں، اس لیے آنکھ بند کرکے نماز پڑھ لو، تو بھائی اگر خیالات غیر اختیاری طور پر

---

(۱) زاد المعاد لابن القيم ۲۸۳/۱ فصل فى كراهة تغميض العينين فى الصلاة طبع الرسالة. وقد ورد فى الحديث عند الطبرانى فى "معجمه الكبير" ۳٤/۱۱ (۱۰۹۵٦). عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: "إذا قام أحدكم فى الصلاة فلا يغمض عينيه" (طبع مكتبة ابن تيمية) وقال الهيثمى فى "مجمع الزوائد" ۲۳۸/۲ (۲٤٥۰) رواه الطبرانى فى الثلاثة وفيه ليث بن ابى سليم وهو مدلس وقد عنعنه (طبع دار الفكر). وروى الديلمى عن انس مرفوعا كما فى "زهر الفردوس" ۱۷۱/۷ (۱۷٤۲) بلفظ "لا تغمضوا اعينكم فى الصلاة فانه من فعل اليهود".

آتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر کوئی مواخذہ کوئی پکڑ نہیں، وہ نماز جو آنکھیں کھول کر اتباعِ سنت میں پڑھی جارہی ہے اور اس میں غیر اختیاری خیالات آرہے ہیں، وہ نماز پھر بھی اس نماز سے اچھی ہے جو آنکھ بند کرکے پڑھی جارہی ہے اور اس میں خیالات بھی نہیں آرہے ہیں، اس لیے کہ وہ نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں ادا کی جارہی ہے اور یہ دوسری نماز اتباعِ رسول میں نہیں ہے۔

بھائی! یہ سارا معاملہ اتباع کا ہے اپنی طرف سے کوئی طریقہ گھڑنے کا نہیں، اسی کا نام دین ہے۔ اب ہم نے جو سوچ لیا ہے کہ فلاں عبادت اس طرح ہوگی اور فلاں عبادات اس طرح ہوگی، تو یہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاں غیر مقبول ہے، اس لیے فرمادیا کہ ”كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ“ کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

بدعت کی صحیح تعریف اور تشریح

ایک بات اور عرض کردوں جس کے بارے میں لوگ بکثرت پوچھا کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب ہر نئی بات گمراہی ہے، تو یہ پنکھا بھی گمراہی ہے، یہ ٹیوب لائٹ بھی گمراہی ہے۔ یہ بس بھی، یہ موٹر بھی گمراہی ہے۔ اس لیے کہ یہ چیزیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھیں، بعد میں پیدا ہوئی ہیں ان کے استعمال کو بدعت کیوں نہیں کہتے؟

خوب سمجھ لیجیے! اللہ تعالیٰ نے بدعت کو جو ناجائز اور حرام قرار دیا یہ وہ بدعت ہے جو دین کے اندر کوئی نئی بات نکالی جائے، دین کا جز اور دین کا حصہ بنالیا جائے کہ یہ بھی دین کا حصہ ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ ایصالِ ثواب اس طرح

ہوگا، جس طرح ہم نے بتادیا یعنی تیسرے دن تیجہ ہوگا۔ پھر دسواں ہوگا، پھر چہلم ہوگا اور جو اس طریقے سے ایصالِ ثواب نہ کرے وہ مردود ہے۔

میّت کے گھر میں کھانا بنا کر بھیجو

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ اگر کسی کے گھر میں صدمہ ہو، تو دوسرے لوگوں کو چاہیے کہ اس کے گھر میں کھانا تیار کرکے بھیجیں۔ حضرت جعفر طیار بن ابی طالب رضی اللہ عنہ غزوۂ موتہ کے موقع پر شہید ہوئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے گھر والوں سے فرمایا:

"اِصْنَعُوْا لِاٰلِ اَبِیْ جَعْفَرَ طَعَامًا فَاِنَّهٗ قَدْ اَتَاهُمْ اَمْرٌ شَغَلَهُمْ"[1]

جعفر (رضی اللہ عنہ) کے گھر والوں کے لیے کھانا بنا کر بھیجو، اس لیے کہ وہ بے چارے مشغول ہیں اور صدمے کے اندر ہیں۔

تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ اس کے لیے کھانا بناؤ جس کے گھر صدمہ ہوگیا تاکہ وہ کھانا پکانے میں مشغول نہ ہو ان کو صدمہ ہے۔

آج کل کی اُلٹی گنگا

آج کل اُلٹی گنگا یہ بہتی ہے کہ جس کے گھر صدمہ ہے، وہ کھانا تیار کرے اور نہ صرف یہ کہ کھانا تیار کرے، بلکہ دعوت کرے، شامیانے لگائے، دیگیں
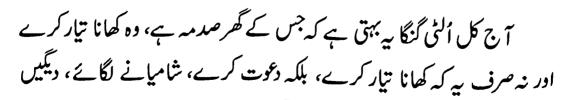
(۱) سنن ابی داود ۱۹۵/۳ (۳۱۳۲) وسنن الترمذی ۳۱۲/۲ (۹۹۸) وقال ہذا حدیث حسن والمستدرك للحاکم ۵۲۷/۱ (۱۳۷۷) وقال ہذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ.

چڑھائے اور اگر دعوت نہیں دے گا، تو برادری میں ناک کٹ جائے گی۔ یہاں تک سننے میں آیا ہے کہ بے چارہ مرگیا ہے، اس کو بھی نہیں بخشتے۔ اس کو بھی بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے:

مرگیا مردود نہ فاتحہ نہ درود

اگر مرنے والے کے گھر میں دعوت نہ ہوئی، تو پھر اس کی بخشش نہ ہوگی، معاذ اللہ! اور پھر وہ دعوت بھی مرنے والے کے ترکے سے ہوگی۔ جس میں اب سارے ورثاء کا حق ہوگیا۔ ان میں نابالغ بھی ہوتے ہیں اور نابالغ کے مال کو ذرّہ برابر چھونا شرعاً حرام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ پھر بھی یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور جو شخص یہ سب نہ کرے وہ مردود ہے۔

دین کا حصہ بنانا بدعت ہے

لٰہذا دین کا حصہ بنا کر لازمی اور ضروری قرار دے کر دین میں کوئی چیز ایجاد کی جائے وہ بدعت ہے، ہاں! اگر کوئی چیز دین کا حصہ نہیں ہے، بلکہ کسی نے اپنے استعمال اور آرام کے لیے کوئی چیز اختیار کر لی، مثلاً ہوا حاصل کرنے کے لیے پنکھا بنا لیا، روشنی حاصل کرنے کے لیے بجلی استعمال کر لی، سفر کرنے کے لیے کار استعمال کر لی، یہ کوئی بدعت نہیں۔ کیونکہ دنیا کے کاموں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کھلی چھوٹ دے رکھی ہے کہ مباحات کے دائرے میں رہتے ہوئے جو چاہو کرو، لیکن دین کا حصہ بنا کر، یا کسی غیر مستحب کو مستحب قرار دے کر یا کسی غیر سنت کو سنت کہہ کر یا کسی غیر واجب کو واجب کہہ کر جب کوئی چیز ایجاد کی جائے گی تو وہ بدعت ہوگی اور حرام ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بدعت سے بھاگنا
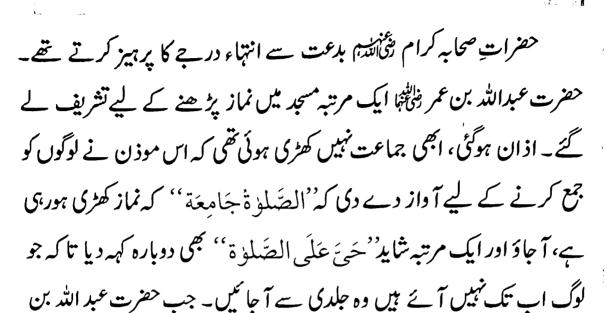
حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بدعت سے انتہاء درجے کا پرہیز کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ اذان ہوگئی، ابھی جماعت نہیں کھڑی ہوئی تھی کہ اس موذن نے لوگوں کو جمع کرنے کے لیے آواز دے دی کہ ''اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃ'' کہ نماز کھڑی ہورہی ہے، آجاؤ اور ایک مرتبہ شاید ''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ'' بھی دوبارہ کہہ دیا تاکہ جو لوگ اب تک نہیں آئے ہیں وہ جلدی سے آجائیں۔ جب حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ الفاظ سنے تو فوراً اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

''اُخْرُجْ بِنَا مِنْ عِنْدَ ھٰذَا الْمُبْتَدِعِ''(۱)

مجھے اس بدعتی کے پاس سے نکالو، اس لیے کہ یہ شخص بدعت کررہا ہے، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو اذان کا طریقہ بتایا تھا ایک مرتبہ ہوتی ہے اور وہ ہوچکی، دوبارہ اعلان کرنا یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ نہیں ہے، یہ طریقہ بدعت ہے، لہٰذا مجھے اس مسجد سے نکالو میں جارہا ہوں۔

قیامت اور بدعت دونوں ڈرنے کی چیزیں ہیں

لہٰذا سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حدیث کے اندر جہاں اپنی اُمت کو اس بات سے ڈرا رہے ہیں کہ ایک لشکر صبح وشام کے وقت تم پر حملہ آور ہونے والا

---

(۱) مصنف عبدالرزاق ۱/۴۷۵ (۱۸۳۲) طبع المکتب الاسلامی. وسنن الترمذی ۱/۲۳۸ معلقا بعد الحدیث (۱۹۸)۔

ہے، وہاں ساتھ ساتھ آئندہ آنے والی گمراہیوں سے بچانے کے لیے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ بدترین چیزیں وہ ہیں جو انسانوں نے اپنی طرف سے گھڑ لی ہیں اور ان کو دین کا حصہ بنادیا ہے، جبکہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کا وہ طریقہ نہیں بتایا، اس سے پرہیز کرو، ورنہ وہ تمہیں گمراہی کی طرف لے جائے گی۔

ہمارے حق میں سب سے زیادہ خیرخواہ کون؟

پھر اگلا جملہ ارشاد فرمایا:

"أَنَا أَوْلٰی بِکُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهٖ"

میں ہر مؤمن سے اس کی جان سے زیادہ قریب ہوں۔

یعنی انسان خود اپنی جان کا اتنا خیرخواہ نہیں ہوسکتا جتنا میں تمہارا خیرخواہ ہوں، جیسے باپ اپنے بچے پر شفقت کرتا ہے کہ وہ اپنے اوپر مشقت جھیل لے گا، محنت اُٹھالے گا، لیکن اولاد کی تکلیف برداشت نہیں کرسکتا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہارے لیے تمہاری جان سے زیادہ قریب ہوں، جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں وہ کوئی اپنے مفاد کی خاطر نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ تمہارے فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں، اس لیے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ کہیں یہ قوم گمراہی میں مبتلا ہوکر اپنے کو جہنم کا مستحق نہ بنالے۔ آگے فرمایا:

"مَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِأَهْلِهٖ، وَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا، أَوْ ضَيَاعًا فَإِلَيَّ وَعَلَيَّ"

یعنی آخرت میں تمہارا خیرخواہ ہوں ہی، دنیا کے اندر بھی یہ معاملہ ہے کہ

اگر کوئی شخص کچھ مال بطورِ ترکہ کر کے چھوڑ کر گیا ہے، تو وہ میراث اس کے گھر والوں کے لیے ہے، شریعت کے مطابق وہ میراث آپس میں تقسیم کرلیں، لیکن اگر کوئی شخص اپنے اوپر قرضہ چھوڑ کر گیا ہے اور ترکہ میں اتنا مال نہیں ہے کہ اس سے قرضہ ادا کیا جا سکے یا ایسی اولاد چھوڑ گیا جس کی کوئی کفالت کرنے والا نہیں ہے، تو وہ قرضے اور وہ اولاد میرے پاس لے آؤ، میں زندگی بھر ان کی کفالت کروں گا، یہ سب اس لیے فرمایا تاکہ یہ یقین ہو جائے کہ مجھے تمہاری خیر خواہی مطلوب ہے۔ تمہارا روپیہ پیسہ مطلوب نہیں ہے، جیسا کہ پچھلی حدیث[1] میں فرمایا: میں تمہیں کمریں پکڑ پکڑ کر جہنم سے روکنا چاہتا ہوں اور تم اس میں گرے جا رہے ہو اور میں تمہیں بچا رہا ہوں کہ خدا کے لیے ان گناہوں سے رُک جاؤ، خدا کے لیے ان بدعتوں سے باز آ جاؤ، تاکہ اس عذابِ جہنم سے نجات پا جاؤ۔

صحابہ کی زندگیوں میں انقلاب کہاں سے آیا؟

یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ باتیں تھیں جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی زندگی میں انقلاب برپا کیا اور ایسی تبدیلیاں لائیں کہ ایک ایک صحابی کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ جب بات دل سے نکلتی تھی، دل پر اثر کرتی تھی اس لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ایک جملے نے لوگوں کی زندگیاں بدل دیں، آج ہم گھنٹوں تقریر کرتے ہیں، گھنٹوں دین کی باتیں کرتے ہیں، لیکن کوئی تبدیلی اور انقلاب نہیں آتا کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا، اس لیے کہ بسا اوقات کہنے والا خود

---

(۱) صحیح البخاری ۱۰۲/۸ (۶٤۸۳) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے انا آخذ بحجز کم عن النار وانتم تقتحمون فیھا۔

اس پر کار بند نہیں ہوتا اور ہمارے دل میں وہ جذبہ اور درد نہیں جس کی وجہ سے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں سے صحابہ کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوا، آج بھی جتنا اثر براہِ راست کتاب اللہ کے کلمات میں ہے اور براہِ راست نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلمات میں ہے، کتنی لچھے دار تقریریں کرلو، اس میں وہ اثر نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو اس کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

بدعت کیا ہے؟

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بدعت کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک بدعتِ حسنہ اور ایک بدعت سیئہ۔ یعنی بعض کام بدعت تو ہوتے ہیں، لیکن اچھے ہوتے ہیں اور بعض کام بدعت بھی ہیں اور بُرے بھی ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی اچھا کام شروع کیا جائے، تو اس کو بدعت حسنہ کہا جائے گا اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

بدعت کے لغوی معنی

خوب سمجھ لیجیے کہ بدعت کوئی اچھی نہیں ہوتی، جتنی بدعتیں ہیں وہ سب بُری ہیں، اصل بات یہ ہے کہ بدعت کے دو معنی ہیں: ایک لغوی اور ایک اصطلاحی۔ اگر آپ لغت اور ڈکشنری میں بدعت کے معنی دیکھیں، تو آپ کو نظر آئے گا کہ لغت میں اس کے معنی نئی چیز کے ہیں، لہٰذا جو بھی نئی چیز ہے اس کو لغوی اعتبار سے بدعت کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً یہ پنکھا، یہ بجلی، یہ ٹرین اور ہوائی جہاز وغیرہ لغت اور ڈکشنری کے اعتبار سے سب بدعت ہیں کیونکہ یہ چیزیں ہمارے دور کی ہی پیدوار ہیں، مسلمانوں کے اوّلین دور میں ان کا وجود نہ تھا، یہ

سب نئی چیزیں ہیں (۱)۔

لیکن شریعت کی اصطلاح میں ہر نئی چیز کو بدعت نہیں کہتے، بلکہ بدعت کے معنی یہ ہیں کہ دین میں کوئی نیا طریقہ نکالنا اور اس طریقہ کو از خود مستحب یا لازم یا مسنون قرار دینا، جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدین نے مسنون قرار نہیں دیا، اس کو بدعت کہیں گے۔ اس اصطلاحی معنی کے لحاظ سے جن چیزوں کو بدعت کہا گیا ہے، ان میں سے کوئی بدعت اچھی نہیں ہوتی اور ایسی کوئی بدعت ''حسنہ'' نہیں ہے، بلکہ ہر بدعت بُری ہی ہے۔

شریعت کی دی ہوئی آزادی کو کسی قید کا پابند بنانا جائز نہیں

البتہ کچھ چیزیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مباح قرار دی ہیں یا کچھ چیزیں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسنون اور اجر وثواب کا موجب تو قرار دی ہیں، لیکن ان چیزوں میں شریعت نے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا کہ اس طرح کروگے، تو ثواب زیادہ ملے گا اور اس طرح کروگے، تو ثواب کم ملے گا، ایسے کاموں کو جس طریقے سے بھی انجام دے لیا جائے، وہ موجبِ ثواب ہوتا ہے۔

ایصالِ ثواب کا طریقہ

مثلاً کسی مردہ کو ایصالِ ثواب کرنا بڑی فضیلت کی چیز ہے، جو شخص کسی مرنے والے کو ایصالِ ثواب کرے، تو اس کو دوگنا ثواب ملتا ہے، ایک اس عمل

(۱) لسان العرب ۶/۸ مادہ بدع والنہایۃ فی غریب الحدیث والاثر ۱/۱۰۶ مادہ بدع۔

کے کرنے کا ثواب اور دوسرے ایک مسلمان کے ساتھ ہمدردی کرنے کا ثواب، لیکن شریعت نے ایصالِ ثواب کے لیے کوئی طریقہ مقرر نہیں کیا کہ ایصالِ ثواب صرف قرآن شریف پڑھ کر ہی کرو یا صدقہ کر کے کرو یا نماز پڑھ کر کرو، بلکہ جس وقت جس نیک کام کی توفیق ہوجائے اس نیک کام کا ایصالِ ثواب جائز ہے۔ تلاوتِ کلام پاک کا ایصالِ ثواب کر سکتے ہیں، صدقہ کا بھی کر سکتے ہیں، نفلی نماز پڑھ کر اس کا ایصالِ ثواب کر سکتے ہیں۔ ذکر و تسبیح کا بھی کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کوئی کتاب لکھی ہے اور کوئی تصنیف و تالیف کی ہے اس کا بھی ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے، اگر کوئی وعظ و نصیحت کی ہے، تو اس کا بھی ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے۔ غرض یہ کہ جتنے بھی نیک کام ہیں سب کا ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح شریعت نے ایصالِ ثواب کے لیے کوئی دن مقرر نہیں کیا کہ فلاں دن کرو اور فلاں دن نہ کرو، بلکہ جس وقت اس شخص کا انتقال ہوا ہے، اس کے بعد جس وقت چاہیں ایصالِ ثواب کر سکتے ہیں، چاہے پہلے دن کرے، چاہے دوسرے دن کرے، چاہے تیسرے دن کرے، جب چاہے کرے، کوئی دن مقرر نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایصالِ ثواب کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے، تو اس میں کوئی خرابی نہیں۔

کتاب تصنیف کر کے اس کا ایصالِ ثواب کر سکتے ہیں

مثلاً میں نے عام مسلمانوں کے فائدے کے لیے ایک کتاب لکھی اور کتاب لکھنے کا مقصد تبلیغ و دعوت ہے اور کتاب لکھنے کے بعد دعا کرتا ہوں کہ

یا اللہ! کتاب لکھنے کا ثواب فلاں شخص کو پہنچادیجیے، تو یہ ایصالِ ثواب درست ہے۔ حالانکہ کتاب لکھ کر ایصالِ ثواب کرنے کا عمل نہ تو کبھی حضورِ اقدس ﷺ نے کیا اور نہ صحابہ کرام نے کیا۔ اس لیے کہ حضورِ اقدس ﷺ اور صحابہ کرام نے کوئی کتاب لکھی ہی نہیں، لیکن آپ نے ایصالِ ثواب کرنے کی فضیلت بیان فرمائی۔ لہٰذا یہ جو میں ایصالِ ثواب کر رہا ہوں یہ بدعت نہیں، لیکن اگر میں یہ کہوں کہ کتاب لکھ کر ایصالِ ثواب کرنے کا طریقہ دوسرے طریقوں سے افضل اور بہتر ہے اور یہی طریقہ سنت ہے، اس صورت میں میرا یہی عمل جو موجبِ اجر و ثواب تھا، بدعت ہوجائے گا، اس لیے کہ میں نے اپنی طرف سے دین میں ایک ایسی چیز داخل کردی جو دین کا حصہ نہیں تھی۔

تیسرا دن لازم کرلینا بدعت ہے

اسی طرح ہر دن ایصالِ ثواب کرنا جائز تھا، پہلے دن بھی، دوسرے دن بھی اور تیسرے دن بھی۔ فرض کرو کہ ایک شخص تیسرے دن گھر پر بیٹھے ایصالِ ثواب کر رہا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں جائز ہے، لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ یہ تیسرا دن خاص طور پر ایصالِ ثواب کے لیے مقرر ہے اور اس تیسرے دن میں ایصالِ ثواب کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے یا یہ سنت ہے یا یہ کہے کہ اگر کوئی شخص تیسرے دن ایصالِ ثواب نہیں کرے گا، تو اس کو ناواقفوں کی لعنت و ملامت کا شکار ہونا پڑے گا، اب یہ ایصالِ ثواب بدعت ہوجائے گا کہ اس عمل کو اپنی طرف سے ایک خاص دن میں لازم اور ضروری قرار دے دیا۔

جمعہ کے دن روزہ کی ممانعت فرمادی

حضورِ اقدس ﷺ نے جمعہ کے دن کی کتنی فضیلت بیان فرمائی ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''قَلَّ مَا كَانَ يُفْطِرُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ'' (۱)

یعنی بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ جمعہ کے روز آپ نے روزہ نہ رکھا ہو، بلکہ اکثر جمعہ کے دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ اس لیے کہ یہ فضیلت والا دن روزے کے ساتھ گزرے تو اچھا ہے، لیکن آپ کو دیکھ کر رفتہ رفتہ لوگوں نے بھی جمعہ کے دن روزہ رکھنا شروع کردیا اور جمعہ کے دن کو روزے کے ساتھ اس طرح مخصوص کردیا جس طرح یہودی لوگ ہفتہ کے دن کو مخصوص کرتے ہیں، اس لیے یہودیوں کے یہاں ہفتہ کے دن روزہ رکھا جاتا تھا اور ان کے ذہنوں میں ہفتہ کے دن روزہ رکھنے کی خاص فضیلت اور اہمیت تھی۔ چنانچہ جب حضورِ اقدس ﷺ نے یہ دیکھا، تو آپ نے جمعہ کے دن روزہ رکھنے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو منع فرمادیا اور باقاعدہ حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جمعے کے روز کوئی شخص روزہ نہ رکھے۔ یہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس دن کو اللہ تعالیٰ نے روزے کے لیے متعین نہیں کیا لوگ اس کو اپنی طرف سے متعین کردیں اور وہ عمل دوسروں کی نظر میں ضروری سمجھا جانے لگے۔ اس لیے آپ نے روزے کے لیے جمعہ کی تعیین کرلینے سے منع فرمادیا، کیونکہ خود

(۱) سنن الترمذی ۱۱۰/۲ (۷۴۲) وقال وفی الباب عن ابن عمر وابی ہریرۃ وحدیث عبداللہ حدیث حسن غریب.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو ضروری اور لازمی نہیں سمجھتے تھے، نہ دوسروں کے لیے اس طرح کا کوئی اہتمام والتزام جاری کرانا چاہتے تھے[1]۔

تیجہ، دسواں، چالیسواں کیا ہیں؟

بہرحال! میں یہ جو عرض کر رہا تھا کہ یہ تیجہ، دسواں، بیسواں اور چالیسواں جائز نہیں ہے، یہ اس لیے کہ لوگوں نے ان دنوں کو ایصالِ ثواب کے لیے مخصوص کر دیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایصالِ ثواب کے لیے کوئی دن مخصوص نہ کرے، بلکہ اتفاقاً وہ تیسرے دن ایصالِ ثواب کر لے، تو اس میں بھی کوئی خرابی نہیں، البتہ چونکہ آج کل تیسرے ہی دن کو بعض لوگوں نے لازم سمجھ رکھا ہے، اس لیے ان کی مشابہت سے بچنے کے لیے بطورِ خاص تیسرے دن یہ کام نہ کرے تو زیادہ بہتر ہے۔

انگوٹھے چومنا کیوں بدعت ہے؟

آپ نے مسجد سے اذان کی آواز سنی اور اذان میں جب "اشھد ان محمداً رسول اللہ" سنا، آپ کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا داعیہ پیدا ہوا اور محبت سے بے اختیار ہو کر آپ نے انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگائے، تو بذاتِ خود یہ عمل کوئی گناہ اور بدعت نہیں اس لیے کہ اس نے یہ عمل بے اختیار سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں کیا اور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور عظمت ایک قابلِ تعریف چیز ہے اور ایمان کی علامت ہے اور ان شاء اللہ اسی محبت پر اجر وثواب ملے گا، لیکن اگر کوئی ساری دنیا کے لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے

---

(۱) صحیح البخاری ۴۲/۳ (۱۹۸۵) وصحیح مسلم ۸۰۱/۲ (۱۱۴۴)۔

کہ جب کبھی اذان میں ''اشهد ان محمداً رسول الله'' پڑھا جائے، توتم سب اس وقت اپنے انگوٹھوں کو چوما کرو، اس وقت انگوٹھوں کو چومنا مستحب یا سنت ہے اور جو شخص انگوٹھوں کو نہ چومے، وہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والا نہیں ہے، تو وہی عمل جو محبت کے جذبے سے بالکل جائز تھا اب بدعت بن گیا۔ اس میں باریک فرق یہ ہے کہ اگر یہ جائز عمل صحیح جذبے سے کیا جارہا ہے اور اس میں خود ساختہ کوئی قید نہیں ہے، تو وہ بدعت نہیں ہے اور جب اسی عمل کو اپنے اوپر لازم کرلیا یا اس کو سنت سمجھ لیا اور اگر کوئی دوسرا شخص وہ عمل نہ کرے تو اس کو مطعون کرنا شروع کردیا۔ بس وہی عمل بدعت بن جائے گا۔

یارسول اللہ! کہنا کب بدعت ہے؟

یہاں تک کہتا ہوں کہ ایک شخص کے سامنے کسی مجلس میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ گرامی آیا اور اس کو بے اختیار یہ تصور آیا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سامنے موجود ہیں اور اس نے یہ تصور کرکے کہہ دیا کہ ''الصلوٰة والسلام علیك یارسول الله'' اور حاظر ناظر کا عقیدہ اس کے دل میں نہیں تھا، بلکہ جس طرح ایک آدمی غائب چیز کا تصور کرلیتا ہے کہ یہ چیز میرے سامنے موجود ہے، تو اس تصور کرنے میں اور یہ الفاظ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ الفاظ اس عقیدے کے ساتھ کہے کہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پر اس طرح حاضر و ناظر ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں، تو یہ شرک ہوجائے گا - معاذ اللہ - اور اگر اس عقیدے کے ساتھ تو نہیں کہے، لیکن یہ سوچا کہ ''الصلوٰة والسلام علیك یارسول

اللہ'' کہنا سنت ہے اور اس طرح درود شریف پڑھنا ضروری ہے اور جو شخص اس طرح یہ الفاظ نہ کہے گویا اس کے دل میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں ہے تو پھر یہی عمل بدعت، ضلالت اور گمراہی ہے۔

عمل کا ذرا سا فرق

لٰہذا عقیدے اور عمل کے ذرا سے فرق سے ایک جائز چیز ناجائز اور بدعت بن جاتی ہے۔ آپ جتنی بدعتیں دیکھیں گے، ان میں سے اکثر ایسی ہیں جو بذاتِ خود مباح تھیں اور جائز تھیں، لیکن جب اسے فرض کی طرح لازم کر لیا گیا تو اس سے وہ بدعت بن گئیں۔

عید کے روز گلے ملنا کب بدعت ہے؟

عید کے دن آپ نے عید کی نماز پڑھی اور عید کی نماز کے بعد دو مسلمان بھائیوں نے خوشی کے جذبے میں آکر آپس میں ایک دوسرے سے گلے مل لیے تو اصلاً گلے ملنا کوئی ناجائز فعل نہیں یا مثلاً ابھی آپ یہاں مجلس سے اُٹھیں اور کسی سے گلے مل لیں، تو کوئی گناہ کی بات نہیں، جائز ہے، لیکن اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ عید کی نماز کے بعد گلے ملنا عید کی سنت ہے اور یہ بھی عید کی نماز کا حصہ ہے اور جب تک گلے نہیں ملیں گے اس وقت تک عید نہیں ہوگی، تو یہی عمل اس وقت بدعت بن جائے گا، اس لیے کہ ایک ایسی چیز کو سنت قرار دیا جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت قرار نہیں دیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو نہ سنت قرار دیا اور نہ اس کی پابندی کی۔ اب اگر کوئی شخص گلے ملنے سے انکار کر دے

کہ میں تو نہیں ملتا اور آپ اس سے کہیں کہ آج عید کا دن ہے، کیوں گلے نہیں ملتے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے عید کے دن گلے ملنے کو لازمی قرار دے دیا اور ازخود لازمی قرار دے لینا ہی اس کو بدعت بنادیتا ہے، لیکن ویسے ہی اتفاقی طور پر گلے ملنے کو دل چاہا اور گلے مل لیے، تو یہ بذاتِ خود بدعت نہیں۔ بہرحال! کسی بھی مباح عمل کو لازم قرار دینے یا اس کو سنت یا واجب قرار دینے سے وہ بدعت بن جاتی ہے۔

کیا ''تبلیغی نصاب'' پڑھنا بدعت ہے؟

ایک صاحب مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ تبلیغی جماعت والے تبلیغی نصاب پڑھتے ہیں اور لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اور صحابہ کرام کے زمانے میں تبلیغی نصاب کون پڑھتا تھا اور خلفائے راشدین کے زمانے میں کون پڑھتا تھا؟ لہٰذا یہ تبلیغی نصاب پڑھنا بھی بدعت ہوگیا، لیکن میں نے آپ کے سامنے جو تفصیل بیان کی اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ علم اور دین کی بات کہنا اور اس کی تبلیغ کرنا ہر وقت اور ہر آن جائز ہے۔ مثلاً ہم اور آپ جمعہ کے روز عصر کے بعد یہاں جمع ہوتے ہیں اور دین کی بات سنتے اور سناتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا کہ لوگ خاص طور پر جمعہ کے روز عصر کے بعد جمع ہوتے ہوں اور پھر ان کے سامنے دین کی بات کی جاتی ہو، لہٰذا یہ ہمارا جمع ہونا بھی بدعت ہے۔

خوب سمجھ لیجیے کہ یہ اس لیے بدعت نہیں کہ دین کی تعلیم وتبلیغ ہر وقت اور ہر آن جائز ہے، لیکن اگر ہم میں سے کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ جمعہ کے دن عصر

کے بعد مسجد بیت المکرم ہی میں یہ اجتماع مسنون ہے اور اگر کوئی شخص اس اجتماع میں شریک نہ ہوا، تو اس کو تو دین کا شوق نہیں ہے اس کے دل میں دین کی عظمت اور محبت نہیں ہے۔ اس لیے کہ بیت المکرم میں جمعہ کے دن نہیں آتا، تو اس صورت میں یہی اجتماع کا عمل جو ہم اور آپ کر رہے ہیں، بدعت بن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ اب ایک آدمی یہاں آنے کے بجائے کسی دوسری جگہ پر چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر دین کی باتیں سن لیتا ہے، تو وہ بھی ثواب کا کام کر رہا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ بیت المکرم ہی میں دین کی باتیں سننے کے لیے آئے اور جمعہ کے دن ہی آئے اور عصر کے بعد ہی آئے اور بیان بھی فلاں شخص ہی کا ہو، تو اس صورت میں یہی عمل بدعت بن جائے گا۔

اسی طرح لوگ تبلیغی نصاب پڑھتے ہیں اور دینی اعمال کی فضیلتیں سناتے ہیں، یہ بڑے ثواب کا کام ہے۔ اب اگر کوئی اس کو متعین کرے کہ تبلیغی نصاب ہی پڑھنا ضروری ہے اور یہی سنت ہے اور اس کے علاوہ اگر کوئی دوسری کتاب پڑھی جائے گی تو وہ مقبول نہیں، تو اس صورت میں یہ تبلیغی نصاب پڑھنا بھی بدعت بن جائے گا۔ لہٰذا کسی بھی عملِ مباح کا یا اجر و ثواب والے عمل کو خاص وقت اور خاص حالات کے ساتھ مربوط کر کے لازم قرار دے دیا جائے، تو وہی بدعت بنا دیتا ہے۔

سیرت کے بیان کے لیے خاص طریقہ مقرر کرنا

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت بیان کرنا کتنے اجر و فضیلت کا کام ہے۔ وہ

لمحات جن میں حضور اقدس ﷺ کا ذکر کسی بھی حیثیت سے ہو، وہ حاصل زندگی ہیں

اوقات ہمہ بود کہ با یار بسر شد

حقیقت میں قابلِ قدر اوقات تو وہی ہیں جو آپ ﷺ کے ذکر مبارک میں صرف ہوجائیں، لیکن اگر کوئی شخص اس کے لیے کوئی خاص طریقہ متعین کردے، خاص دن متعین کرے یا خاص مجلس متعین کرلے اور یہ کہے کہ اسی خاص دن اور صورت ہی میں اجر وثواب منحصر ہے، تو یہی قیودات اس جائز اور مبارک عمل کو بدعت بنادیں گے۔

درود شریف پڑھنا بھی بدعت بن جائے گا

اس کی آسان سی مثال سمجھیے کہ ہمیں نماز میں التحیات پڑھنے کے بعد درود شریف پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی إِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی آلِ إِبْرَاهِیْمَ إِنَّكَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ ○ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی إِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی آلِ إِبْرَاهِیْمَ إِنَّكَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ۔ یہ درود شریف پڑھنا حضور ﷺ نے ہمیں سکھادیا اس کو پڑھنا جائز اور مسنون ہے۔ اب اگر کوئی شخص دوسرا درود شریف پڑھے جس کے الفاظ اس سے مختلف ہوں۔ مثلاً اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَعَلٰی آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ پڑھے، تو یہ بھی جائز ہے۔ کوئی گناہ نہیں اور درود شریف پڑھنے کی سنت ادا ہوجائے گی، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ درود شریف نہ پڑھو، بلکہ یہ دوسرا والا درود شریف پڑھو اور یہی پڑھنا سنت ہے، تو اس صورت میں درود شریف پڑھنا جو بڑی فضیلت والا عمل تھا بدعت بن جائے گا۔

دنیا کی کوئی طاقت اس کو سنت نہیں قرار دے سکتی

خوب سمجھ لیجیے کہ لوگوں نے جو بدعت کی قسمیں نکال لیں ہیں کہ ایک بدعتِ حسنہ ہوتی ہے اور ایک بدعتِ سیئہ ہوتی ہے۔ ایک اچھی ہوتی ہے اور ایک بُری ہوتی ہے۔ یاد رکھو! بدعت کوئی حسنہ نہیں کوئی بدعت اچھی نہیں۔ جو طریقہ نبیِ کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور حضراتِ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ضروری قرار نہیں دیا اور سنت قرار نہیں دیا، مستحب قرار نہیں دیا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کو واجب، سنت اور مستحب قرار نہیں دے سکتی۔ اگر کوئی ایسا کرے گا، تو وہ ضلالت اور گمراہی ہوگی، اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صحابہ کرام دین کو اتنا نہیں سمجھتے تھے جتنا ہم سمجھتے ہیں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ بعض نئی چیزیں، تو وہ ہوتی ہیں جن کو کوئی بھی شخص دین کا حصہ نہیں سمجھتا مثلاً یہ پنکھا، یہ لائٹ، ٹرین، ہوائی جہاز وغیر۔ یہ چیزیں اس لیے بدعت نہیں ہیں کہ ان کو کوئی بھی دین کا حصہ اور لازم اور ضروری نہیں سمجھتا اور دین کے جن کاموں کو انجام دینے کا اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی خاص طریقہ نہیں بتلایا، ان کاموں کو جس طرح چاہیں انجام دے سکتے ہیں، لیکن اگر ان کاموں کے لیے اپنی طرف سے کوئی خاص طریقہ مقرر کرلیا جائے اور اسی طریقے کو لازم اور ضروری قرار دے دیا جائے، تو وہ بدعت بن جائے گا۔ یہ بات اگر ذہن میں رہے، تو اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے تمام شبہات دور

ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بدعت سے اجتناب کی توفیق عطا فرمائے اور دین کی صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین
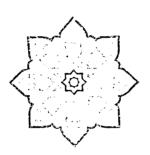
خاص وضع اختیار کرنا تکبر ہے

(اصلاحی مجالس ج ۲ ص ۶۱)
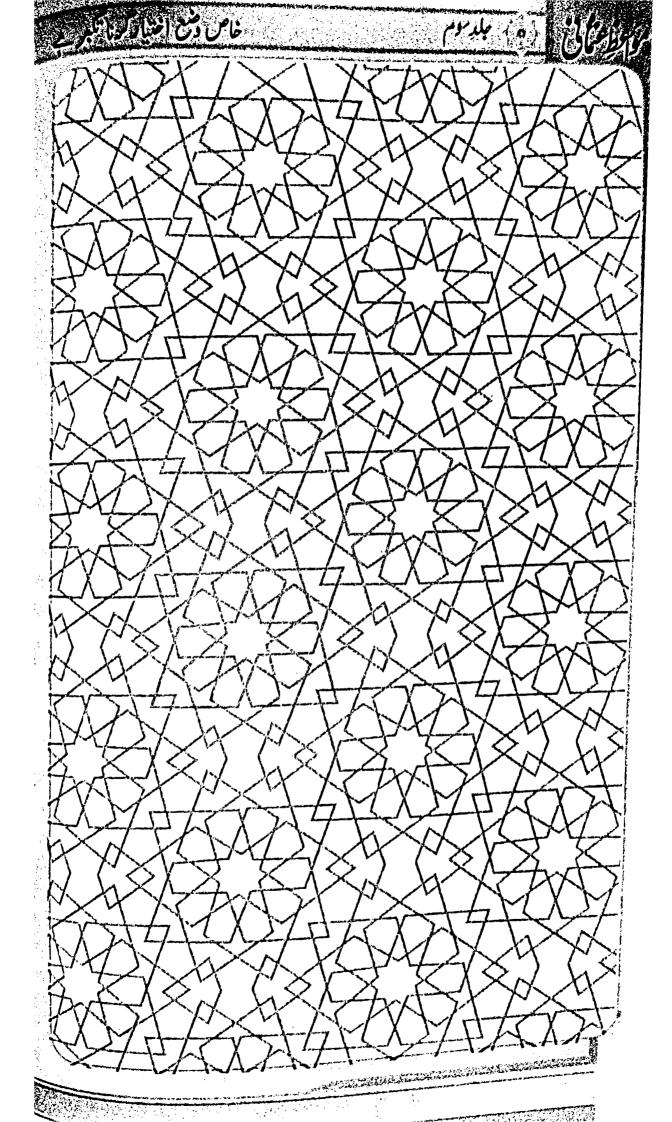
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاص وضع اختیار کرنا تکبر ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔ اما بعد!

وضع داری میں غلو بھی کبر ہے

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''وضع داری میں غلو بھی کبر ہے، وضع کیا چیز ہے؟ قطع کیا چیز ہے؟ اور آن کیا چیز ہے؟ یہ سب شیطانی دھندے ہیں، اپنے آپ کو اتنا بڑا ہی کیوں سمجھے کہ اس کے لیے خاص وضع مقرر ہو، بندہ کا حق، تو یہ ہے کہ جس وردی اور جس وضع میں سرکار رکھیں اسی میں رہے، اپنی رائے اور ارادے کو بالکل فنا کردے۔'' (انفاسِ عیسیٰ ص ۱۵۷)

بعض لوگوں کا یہ مذاق ہوتا ہے کہ لوگوں میں اپنا امتیاز ظاہر کرنے کے

لیے خاص وضع بنالیتے ہیں، مثلاً ایک شخص نے اپنا خاص لباس مقرر کرلیا، اب جب ملاقات کریں گے، تو اسی لباس میں، جب باہر نکلیں گے تو اسی لباس میں، اور ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے اپنا ایک امتیاز پیدا ہو اور لوگوں میں یہ شہرت ہوجائے کہ یہ آدمی ہمیشہ یہ لباس پہنتا ہے۔

حضرتِ والا فرماتے ہیں کہ یہ بھی کبر کا ایک شعبہ ہے۔

خاص لباس کا اہتمام نہ کریں

دیکھیے! بغیر اہتمام کے کوئی خاص لباس آدمی پہنتا رہے، تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، لیکن یہ اہتمام کہ جب بھی کپڑے پہنوں، تو ایسا ہی لباس ہو، دوسرا نہ ہو، ٹوپی جب بھی پہنوں تو ایسی ہو، میرا حلیہ ہمیشہ ایسا ہی ہو، وضع کے اس اہتمام کا منشا بسا اوقات کبر ہوتا ہے اور یہ منشا ہوتا ہے کہ میں اوروں سے ممتاز نظر آؤں۔ ارے بھائی! کہاں کا امتیاز؟ کہاں کی وضع قطع؟ ہونا یہ چاہیے کہ ؏

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

کون سی صورت کبر میں داخل ہے؟

اسی لیے ہمارے بزرگوں نے کسی خاص لباس کا اہتمام نہیں فرمایا، بلکہ کبھی کچھ پہن لیا، کبھی کچھ پہن لیا تاکہ یہ کبر میں شامل نہ ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی خاص لباس کا اہتمام کرنا ہمیشہ کبر ہوتا ہے، اس لیے کہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو کسی خاص اہتمام کے بغیر ایک لباس پہننے کی عادت پڑی ہوئی ہے اور وہ پہنتا چلا جارہا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن ایسا کرنا کہ اس کے

خلاف ہی نہ ہو اور اس کے خلاف ہونے کو اپنی توہین سمجھے، تو یہ صورت کبر کے اندر داخل ہوجاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بے تکلف رہو، کسی خاص لباس پہننے کا تکلف نہ کرو، بلکہ اگر بے تکلفی میں ایک لباس پہن رہے ہو تو پہنتے رہو، بے تکلفی میں دوسرا لباس مل گیا تو وہ پہن لیا، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لہٰذا ایک لباس کا اہتمام کرنا یہ تکبر میں داخل ہوجاتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سادہ لباس پہنتے تھے، مگر وہ لباس قاعدے کا ہوتا تھا اور آپ خوش پوش تھے اور عام طور پر سفید لباس پہنتے تھے۔ حضرتِ والا کی بڑی اہلیہ حضرت سے بہت محبت کرتی تھیں، ایک مرتبہ رمضان المبارک میں انہوں نے حضرتِ والا کے لیے ایک اچکن سیا، چونکہ شوقین تھیں، اس لیے انہوں نے اچکن کے لیے بہت شوخ قسم کے کپڑے کا انتخاب کیا، جس پر پھول بوٹے بھی بنے ہوئے تھے، پورے رمضان اس کو خود سیتی رہیں اور حضرتِ والا کو خبر بھی نہ ہونے دی۔ بس عید سے ذرا پہلے اس کو تیار کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ یہ اچکن میں نے آپ کے لیے سیا ہے، حضرتِ والا دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ ایسا شوخ کپڑا تو میں نے آج تک کبھی نہیں پہنا، لیکن حضرتِ والا نے ان پر کچھ ظاہر نہیں کیا، بلکہ ان کی تعریف کی کہ تم نے تو ماشاء اللہ بہت اچھا سیا ہے اور بڑی محنت سے سیا ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے۔ اہلیہ نے کہا کہ میں نے یہ اس لیے سیا ہے کہ آپ اس کو پہن کر عیدگاہ جائیں۔ حضرتِ والا نے فرمایا کہ میں نے سوچا کہ اب اس کو پہن کر عیدگاہ جاؤں تو مشکل نہ پہنوں تو

مشکل۔ اگر پہن کر جاؤں، تو لوگ باتیں بنائیں گے کہ مولانا صاحب کو دیکھیے کیسا شوخ لباس پہن کر عید گاہ میں آ گئے اور اگر نہ پہنوں تو ان کا دل ٹوٹے گا۔ اس لیے کہ انہوں نے سارا رمضان بڑی محنت سے اس کو سیا ہے۔ آخر میں حضرت نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کا دل توڑنا مناسب نہیں، اگر میں اس کو پہن کر عید گاہ جاؤں گا اور لوگ بُرا سمجھیں گے تو سمجھتے رہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ لوگ باتیں کریں گے کہ مولانا صاحب کیسا شوخ لباس پہن کر آ گئے، چلو کہنے دو، چنانچہ آپ اس کو پہن کر عید گاہ تشریف لے گئے، جب عید کی نماز سے فارغ ہوئے، تو ایک صاحب نے کہا کہ حضرت! یہ اچکن تو آپ پر زیب نہیں دیتا۔ حضرت نے فرمایا ہاں بھائی! تم صحیح کہتے ہو، اچھا ایسا کرو کہ تم ہی اس کو لے جاؤ۔ چنانچہ وہ اُتار کر اُس کو دے دیا۔

عبدیت کے پیکر تھے

اب آپ اندازہ لگائیں کہ اتنے بڑے آدمی کو اپنی طبیعت کے خلاف لباس پہن کر اتنے بڑے مجمع میں جانا پڑ جائے تو اس پر کیا گزرے گی؟ لیکن آپ نے دل شکنی سے بچنے کے لیے یہ سب گوارہ کرلیا۔ اگر کوئی ہم جیسا وضع قطع کا پابند ہوتا، تو وہ اپنی اہلیہ کو جواب دیتا کہ تمہاری محنت اکارت جائے یہ پہن کر نہیں جاؤں گا، میں لوگوں کے سامنے ذلیل و خوار ہو جاؤں گا، لیکن چونکہ آپ نے اپنے نفس کو اللہ کے لیے مٹایا ہوا تھا اور اپنے آپ کو فنا کیا ہوا تھا اور عبدیت کا پیکر بنایا ہوا تھا، اس لیے ان کے نزدیک عام کپڑا پہننا اور شوخ لباس پہننا سب برابر تھا۔ بہر حال! کسی بھی خاص وضع پر آدمی کو نہ تو اتنا اہتمام ہو اور نہ اصرار ہو کہ آدمی اس وضع کا غلام بن جائے۔

تکبر کا علمی علاج

حضرت نے تکبر کا علمی علاج بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

"تکبر کا علمی علاج تو یہ ہے کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور یوں سمجھے کہ مجھے، تو اپنے عیوب کا یقین کے ساتھ علم ہے اور دوسرے کے عیوب کا ظن کے ساتھ علم ہے اور جو شخص معیوبِ یقینی ہو وہ معیوبِ ظنی سے بدتر ہے۔ اس لیے مجھے اپنے کو سب سے کمتر سمجھنا چاہیے۔" (انفاسِ عیسیٰ ص ۱۵۸)

انسان کو اپنے عیوب کا تو سو فیصد یقین کے ساتھ علم ہے اس میں تو کوئی شبہ نہیں، دوسرے کے عیب کے بارے میں جو علم ہوگا، وہ ظنی ہوگا، اگرچہ ظن غالب ہی سہی۔ اب یہ دیکھیں کہ معیوبِ یقینی بدتر ہے یا معیوبِ ظنی؟ ظاہر ہے کہ معیوبِ یقینی بدتر ہے، اس لیے متکبر اپنے بارے میں یہ سوچ کہ میں معیوبِ یقینی ہوں۔ لہٰذا میں اس سے بدتر ہوا، اس لیے مجھے اپنے کو دوسروں سے کمتر سمجھنا چاہیے۔ یہ تو ہے علمی علاج۔

تکبر کا عملی علاج

اور عملی علاج یہ ہے کہ جس کو تم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہو، اس کے ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آؤ اور یہ عملی علاج جزوِ اعظم ہے۔ اس کے بغیر تنہا علمی علاج کافی نہیں، تجربے سے یہ ثابت ہو کہ جب تک عملی علاج نہ کیا جائے گا، تکبر دور نہ ہوگا۔ (ایضاً)

آپ کے دل میں دوسرے شخص کی ناقدری ہے، جس کی وجہ سے اس کو تم کم تر سمجھ رہے ہو، لہٰذا اب تم بہ تکلف اس کے ساتھ تعظیم وتکریم کا معاملہ کرو، اس سے تکبر دور ہوگا۔ ایک صاحب کے خط کے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو لکھا کہ تم مسافروں کے پیر دبایا کرو، اس سے تمہارا تکبر زائل ہوگا۔

بزرگوں کی مختلف ادائیں

ہمارے بزرگوں کی ادائیں بھی عجیب تھیں اور ان کے رنگ بھی مختلف تھے۔ حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ بہت خوش پوشاک تھے، صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہنتے تھے، بقولِ شخصے کہ حضرت تو دولہا بنے رہتے تھے۔ جبکہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر فنائیت کا رنگ غالب تھا، وہ کپڑوں کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا کرتے تھے۔ کبھی دوپلّی پہن لی، کبھی پاجامہ پہن لیا، کبھی تہبند باندھ لیا۔ یہاں تک کہ کوئی آپ کو پہچان نہیں سکتا تھا کہ آپ شیخ الہند ہیں۔

حضرت شیخ الہند کی تواضع

رمضان المبارک میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ساری رات تراویح پڑھنے کا معمول تھا، بیس رکعت تراویح میں ساری رات گزارتے تھے، دس پارے روزانہ پڑھے جاتے اور ہر تیسرے دن قرآن شریف ختم ہوتا تھا، مختلف حفاظ تراویح میں سنایا کرتے تھے، ان حفاظ میں ایک حافظ مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ حضرتِ والا کو ان کی تلاوت بہت پسند تھی۔ اس لیے اکثر ان کو کھڑا کردیا کرتے تھے۔

ایک دن مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت خراب ہوگئی، اس لیے انہوں نے معذرت کردی، کہ آج میں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے تراویح نہیں پڑھاسکوں گا، اس روز تراویح مختصر ہوئی اور تراویح کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے نفلیں پڑھنی شروع کردیں۔ مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسجد کے ساتھ ایک حجرہ تھا، میں اس میں جاکر لیٹ گیا، رات کو میں نے اچانک محسوس کیا کہ کوئی میری ٹانگیں دبا رہا ہے، میں نے سوچا کہ شاید کسی طالب علم کو خیال آ گیا ہوگا کہ یہ بیمار ہے، چلو ان کی ٹانگیں دبا کر ان کی کچھ خدمت کرلیں اور مجھے ٹانگیں دبوانا اچھا لگا۔ اس لیے میں چپ چاپ لیٹا رہا اور مڑکرنہیں دیکھا کہ کون دبا رہا ہے، جب کچھ دیر گزر گئی، تو میں نے مڑ کر دیکھا کہ کون ہے، تو دیکھا کہ پاؤں دبانے والے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ان کو دیکھ کر میرے اوپر بجلی سی گری اور میں نے کہا کہ حضرت یہ کیا؟ فرمایا کہ اس میں کیا حرج ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، میں نے سوچا کہ ذرا ٹانگیں دبادوں، اس سے تمہیں آرام آجائے گا۔ حالانکہ مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔

یہ دارالعلوم دیوبند ویسے ہی مشہورنہیں ہوگیا اور یہ اکابر دیوبند ویسے ہی ''اکابرِ دیوبند'' نہیں بن گئے، بلکہ انہوں نے صحابہ کے زمانے کی یادیں تازہ کی ہیں۔ آج لوگ ''مسلکِ دیوبند'' کا مطلب ہی نہیں سمجھتے کہ ''مسلکِ دیوبند'' کیا ہے؟

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور تواضع

''ارواحِ ثلاثہ'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہمارے سیّد الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگردوں سے علاج کی خاطر ان سے کہتے کہ جوتے اُٹھاؤ، لیکن جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ وہ متواضع ہے اور اس کے اندر تکبر نہیں ہے، تو اس طالبِ علم کے جوتے خود اُٹھا لیتے۔ ایک مرتبہ سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش شروع ہوگئی، تو طلبہ اپنی اپنی کتابیں اُٹھا کر اندر جانے لگے، تو حضرتِ والا طلبہ کے جوتے سمیٹ کر اندر لے گئے۔ بے نفسی اور تواضع میں ان حضرات نے صحابہ کرام کی یادیں تازہ کردی تھیں اور اپنے آپ کو مٹایا ہوا تھا۔

ہمارے دماغوں میں کبر کا، علم کا، دولت کا، صحت کا، اوصاف میں کمال کا جو خنّاس بھرا ہوا ہے، اس نے سارا معاملہ خراب کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ خنّاس ہمارے اندر سے نکال دے۔ آمین۔

اتحاد قائم نہ ہونے کی وجہ تکبر ہے

آج ہمارے اندر اتفاق اور اتحاد قائم نہیں ہوتا جبکہ ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ اتحاد ہوجائے لیکن اتحاد ہوکر نہیں دیتا اور اگر اتحاد ہو بھی جاتا ہے، تو چند روز کے بعد ہی چوراہے پر ہنڈیا پھوٹ جاتی ہے اور سارا اتحاد پارہ پارہ ہوجاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اتحاد قائم ہونے کی دو شرطیں ہیں، جب تک یہ

دونوں شرطیں نہیں پائی جائیں گی، اس وقت تک اتحاد قائم نہیں ہوسکتا، ایک اخلاص، دوسرے تواضع، لہٰذا دو متکبروں میں کبھی اتحاد نہیں ہوسکتا، اگر اتحاد ہوگا، تو وہ وقتی ہوگا اور ذاتی مفادات کے لیے ہوگا، جب وہ مفادات پورے ہوجائیں گے بس پھر اتحاد ختم ہوجائے گا۔

دو متکبروں میں اتحاد کی مثال

میرے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دو متکبروں کے درمیان جو ذاتی مفادات کے لیے اتحاد قائم ہوتا ہے اس کی مثال ''گدھا کھجاور'' جیسی ہے، جب گدھے کی کمر میں خارش ہوتی ہے، تو وہ خود سے تو اپنا جسم کھجا نہیں سکتا، اس لیے وہ دوسرے گدھے سے کہتا ہے کہ تیری کمر میں بھی کھجلی ہورہی ہے اور میری کمر میں بھی کھجلی ہورہی ہے، اس لیے تو میرے قریب آ جا، پھر ہم دونوں آپس میں مل کر کمر سے کمر رگڑتے ہیں، اس کو ''گدھا کھجاور'' کہتے ہیں۔ اسی طرح دو متکبروں کے درمیان اتحاد بھی درحقیقت ''گدھا کھجاور'' ہے اس لیے کہ یہ اپنے ذاتی اور وقتی مفاد کی خاطر اتحاد کرلیتے ہیں۔ جب اپنا مفاد پورا ہوجاتا ہے، تو ایک دوسرے کو لات مار کر الگ ہوجاتے ہیں اور حقیقی اتحاد اخلاص اور تواضع کے بغیر قائم ہو ہی نہیں سکتا اور سارے جھگڑوں کی بنیاد بھی یہی تکبر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل سے ہم سب کو اس سے نجات عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تبرکات شریعت کی نظر میں

(انعام الباری ج ۳ ص ۲۵۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تبرکات شریعت کی نظر میں

بسم الله الرحمن الرحيم

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ أَبِي بَكْرٍ الْمُقَدَّمِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا فُضَيْلُ بْنُ سُلَيْمَانَ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ عُقْبَةَ، قَالَ: رَأَيْتُ سَالِمَ بْنَ عَبْدِ اللهِ يَتَحَرَّى أَمَاكِنَ مِنَ الطَّرِيقِ فَيُصَلِّي فِيهَا، وَيُحَدِّثُ أَنَّ أَبَاهُ كَانَ يُصَلِّي فِيهَا وَأَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي فِي تِلْكَ الأَمْكِنَةِ. وَحَدَّثَنِي نَافِعٌ، عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ كَانَ يُصَلِّي فِي تِلْكَ الأَمْكِنَةِ، وَسَأَلْتُ سَالِمًا، فَلاَ أَعْلَمُهُ إِلَّا وَافَقَ نَافِعًا فِي الأَمْكِنَةِ كُلِّهَا إِلَّا أَنَّهُمَا اخْتَلَفَا فِي مَسْجِدٍ بِشَرَفِ الرَّوْحَاءِ[1]

(۱) صحیح البخاری ۱۰٤/۱ (٤٨٣) باب المساجد التی علی طرق المدینۃ والمواضع التی صلی فیھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

روایتِ باب سے مقصودِ بخاری

امامِ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب ان مساجد کے بیان میں قائم کیا ہے جو مدینہ منورہ کے راستے میں واقع ہیں اور ان مواضع کا بیان جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی تھی اور اس میں آگے حضرتِ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے طویل حدیث روایت کی ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان سفر کرتے تھے، تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان مقامات پر نماز پڑھتے تھے جہاں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سفر کے دوران نماز پڑھی تھی اور ان مواقع کو نہ صرف خود تلاش کر کے نماز پڑھتے تھے، بلکہ لوگوں کو بتلاتے بھی تھے کہ دیکھو یہ جگہ ہے جہاں نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سفر کے دوران نماز پڑھی تھی، یہاں تک کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک جگہ کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بتلایا کہ دیکھو یہاں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشاب کیا تھا اور اسی تحری کے نتیجہ میں انہوں نے اپنے تمام شاگردون کو ان تمام مواضع کی تفصیل بتا دی تھی کہ کون سی جگہ ہے جہاں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی تھی۔

اگرچہ تفصیل ایسی تھی کہ اس کی مدد سے آج کوئی آدمی وہاں نہیں پہنچ سکتا کیونکہ وہ تفصیل انہوں نے اپنے زمانے کے اعتبار سے بتائی تھی کہ دیکھو فلاں جگہ پر فلاں درخت ہے، فلاں جگہ پر گھاٹی ہے، فلاں جگہ پر پہاڑ ہے، فلاں جگہ پر بستی ہے، ظاہر ہے کہ مرورِ زمانہ کی وجہ سے اب وہ نشانیاں مٹ چکی ہیں۔ یہاں تک کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں، یعنی آٹھویں صدی میں کہہ رہے ہیں کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جو مقامات بیان فرمائے ہیں ان میں سے صرف دو باقی رہ گئے ہیں، ایک روحاء کا مقام اور ایک ذو الحلیفہ باقی

سارے مقامات اب دستیاب نہیں ہیں، اگرچہ بہت سی جگہیں اب تک ایسی ہیں جن کے نام اب تک وہی ہیں جو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائے تھے، لیکن جو تفصیل حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی تھی کہ بائیں مڑو اور دائیں مڑو، وہ تفصیل اب نہیں رہی ہے، صرف روحاء ایک ایسی جگہ ہے، جہاں سعودی حکومت کے ہاتھ نہیں پہنچے، کیونکہ اب تک وہاں کوئی عمارت نہیں بنی تھی۔

چند سال پہلے میں گیا تھا، تو وہاں وہ کنواں (بئر روحاء) اب بھی موجود ہے اور اس کے قریب جو ایک جگہ بتائی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔ وہ جگہ بھی محفوظ ہے۔ باقی جتنے مقامات بتائے ہیں، یہاں تک کہ ذو الحلیفہ کی وہ جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی تھی، اب وہاں بہت عالی شان، لمبی چوڑی مسجد بنا دی گئی ہے، اس جگہ کو خاص طور پر محفوظ نہیں رکھا گیا ہے، وہ جگہ اس مسجد کے اندر آ گئی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ علمائے نجد کا کہنا یہ ہے کہ اس قسم کے مقامات کو خاص طور پر محفوظ رکھنا ناجائز ہے اور شرکِ مآثر میں ہونے کی وجہ سے منع ہے، چنانچہ انہوں نے مدینہ منورہ میں کوئی ایسی نشانی نہیں چھوڑی جسے نہ مٹایا ہو، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو مآثر تھے ایک ایک کر کے مٹا دیے اور چُن چُن کر ختم کر دیے۔

لمحۂ فکریہ

افسوس اور ستم ظریفی کا پہلو یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں کعب بن اشرف کا قلعہ برقرار ہے اور اس پر بورڈ لگایا ہوا ہے کہ یہ آثارِ قدیمہ میں سے ہے، خبردار کوئی شخص اس کو نقصان نہ پہنچائے، تو کعب بن اشرف کا قلعہ تو محفوظ ہے، نہ

صرف محفوظ بلکہ اس کی حفاظت کے لیے بورڈ لگایا ہوا ہے اور مدینہ منورہ کے جتنے آپ ﷺ کی ذات سے متعلق آثر تھے، ایک ایک کر کے، چُن چُن کر سب ختم کر دیے ہیں، جس پر بس چلا اسے اٹھا کر ختم کر دیا، وہاں کبھی ہم جایا کرتے تھے اور وہاں پر حاضری ہو جایا کرتی تھی، ایک آخری چیز باقی رہ گئی تھی اور وہ مسجدِ قبا کے برابر حضرت اسعد بن زرارۃ رضی اللہ عنہ کا وہ مکان تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں حضور ﷺ نے چودہ دن قیام فرمایا تھا، اب تین چار سال پہلے جب میں حاضر ہوا، تو اس کو بھی ڈھا دیا گیا اور وہ بھی ختم کر دیا گیا۔

اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مآثر کو برقرار رکھنا اور مآثر انبیاء اور مآثر صلحاء سے تبرک حاصل کرنا شعب من شعب الشرک ہے یہ شرک ہے، لہٰذا اس کو ختم کرنا ضروری ہے۔

استدلال حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے دور کے ایک واقعہ سے ہے جو سننِ سعید بن منصور میں مروی ہے کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ حج کے لیے تشریف لے گئے، دیکھا کہ لوگ حج کے بعد ایک درخت کی طرف کثرت سے جا رہے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے لوگوں نے بتایا کہ وہ مسجد ہے جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی، اس واسطے لوگ چاہتے ہیں کہ وہاں جا کر نماز پڑھیں، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ تم سے پہلی امتیں اس لیے ہلاک ہوئی تھی کہ انہوں نے اپنے انبیاء کے مشاہد کو مساجد بنا دیا تھا اور ان کے اندر نماز پڑھنی شروع کر دی اور ثواب کی چیز بنا دیا اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر کسی نماز کا وقت ہے تو

پڑھ لے اور اگر نہیں تو چلا جائے۔

"مَنْ عَرَضَتْ لَهُ صَلَاةٌ فَلْيُصَلِّ وَمَنْ لَّا فَلْيَمْضِ"(۱)

تبرک بآثار الانبیاء علیہم السلام جائز ہے

کہتے ہیں کہ دیکھو حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے ان جگہوں پر نماز پڑھنے سے منع کیا، اب یہ حدیث حضرتِ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے جس میں حضور کی تمام جگہوں پر نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔ اسی سے سارے علماء یہ کہتے ہیں کہ حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام کے مآثر سے تبرک جائز ہے، جو فتح الباری میں ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے۔(۲)

لیکن ابھی حال میں سعودی عرب میں وہاں کے علماء کی نگرانی میں یہ کام ہوا ہے کہ وہاں کے جدید نسخوں میں جہاں جہاں یہ بات لکھی ہوئی ہے وہاں پر ایک حاشیہ لکھ دیا جاتا ہے کہ: هذا خطأ و هذا فيه نظر اورو هو اعلم بهذا الشأن من ابنه رضی اللہ عنہما کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی زیادہ اقتداء کرنی چاہیے بنسبت ان کے بیٹے کے اور کہیں ایسا ہو کہ حدیث صحیح بخاری کی ہو اور ایک حدیث سعید بن منصور کی ہو، تو پھر کہا جاتا ہے کہ صاحب، بخاری کا سعید بن منصور کی روایت سے کیا مقابلہ؟ سعید بن منصور کی روایت کہاں اور بخاری

---

(۱) سنن سعید بن منصور کی یہ روایت ابن تیمیہ نے اقتضاء الصراط المستقیم ۲/۲۷۳ (طبع دار عالم الکتب) میں ذکر کی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو مصنف عبد الرزاق ۲/۱۱۸ (۲۷۳٤) ومصنف ابن ابی شیبۃ ۵/۱۸۳ (۷۶۳۲) طبع دار القبلۃ۔ والبدع لابن وضاح ۲/۸۷ (۱۰۱) مکتبۃ ابن تیمیۃ القاهرة۔ عنایت

(۲) فتح الباری ۲/۱۲۶ طبع مکتبۃ الرشد الریاض۔

کی روایت کہاں؟ لیکن یہاں پر بخاری کی روایت کی کوئی قیمت نہ رہی اور سعید بن منصور کی روایت کی بنیاد پر ہی کہہ دیا کہ ایسا کرنا شرک ہے۔

تبرک بآثار الانبیاء علیہم السلام کا انکار غلو اور مکابرہ ہے

درحقیقت یہ بالکل غلو اور دلائلِ شرعیہ سے ناواقفیت پر مبنی ہے، احادیث میں آثارِ انبیاء سے تبرک حاصل کرنے کے اتنے دلائل اور اتنے واقعات ہیں کہ ان کا انکار سوائے مکابرہ کے اور کچھ نہیں، ایک حدیث تو آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح حضرتِ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جُز رسی سے یہ بتایا کہ یہاں پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی تھی، لہٰذا پڑھو اور یہ واقعات آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اطہر سے کوئی تھوک یا ریزش نہیں گرتی تھی یہاں تک کہ لوگ اسے اپنے جسموں پر مل لیتے تھے[1]، اب کہہ دو کہ یہ بھی شرک تھا؟

دلائلِ جوازِ تبرک

حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم سے مس کی ہوئی چیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اپنے جسموں پر مل رہے ہیں یہ تبرک نہیں، تو اور کیا تھا؟ پھر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ریشِ مبارک کے بال صحابہ میں تقسیم کیے تھے،[2] تو اس تقسیم کرنے

(۱) صحیح البخاری ۳/۱۹۳ (۲۷۳۱)۔

(۲) مسند احمد ۲۶/۳۹۵ (۱۶٤۷٤) وقال الهيثمی فی "مجمع الزوائد" ٤/۱۹ (۵۹۵۰-۵۹۵۱): رواه احمد ورجاله رجال الصحيح. وصحيح ابن خزيمه ٤/۳۰۰ (۲۹۳۱)۔ والمستدرك للحاكم ۱/٦٤۸ (۱۷٤٤) قال الحاكم هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه. ووافقه الذهبی فی "التلخيص".

کا مقصد کیا تھا؟ اگر تبرک بآثار الانبیاء جائز نہیں ہوتا تو خود آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کیوں تقسیم فرماتے، نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان تبرکات کا ایسا تحفظ فرمایا کہ وہ پانی جس میں آپ نے کلی فرمائی تھی وہ تقسیم فرمارہے تھے، ام سلمہ رضی اللہ عنہا (جن کا ذکر پیچھے گزرا ہے) نے ان سے فرمایا کہ اپنی ماں کے واسطے کچھ بچا کے رکھنا۔(۱)

وہی ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک موئے مبارک ایک شیشی کے اندر محفوظ رکھا ہوا تھا اور اس میں پانی ڈالا ہوا تھا، بخاری شریف کتاب اللباس میں یہ روایت ہے، جب سارے شہر میں کوئی بیمار ہوتا، تو وہ اپنے ایک پیالے میں پانی رکھ کر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بھیجتے اور ان سے درخواست کرتے کہ آپ اس موئے مبارک کو ہمارے پانی میں بھی ڈال دیجیے، تو وہ پانی جو شیشی میں ہوتا جس میں موئے مبارک تھا، وہ اس پیالے میں ڈال دیتی اور وہ لے جا کر اس مریض کو استشفاءً پلاتے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باقاعدہ ان کے پاس بھیج رہے ہیں اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا یہ تبرک استشفاء کے لیے کرتی تھیں(۲)۔

حضرتِ ام سلیم رضی اللہ عنہا حضرتِ انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں ان کی روایت بخاری کی کتاب الاستیذان کے اندر آئے گی، وہ فرماتی ہیں ایک مرتبہ نبیِ کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوئے ہوئے تھے گرمی کا موسم تھا، تو آپ کے جسمِ اطہر سے پسینہ بہنے لگا، تو میں جلدی سے ایک شیشی لے کر آئی اور جو پسینہ آپ کے جسمِ اطہر سے بہہ رہا تھا اس کو میں نے شیشی کے اندر جمع کر کے محفوظ کر لیا تو

---

(۱) صحیح البخاری ۱۵۷/۵ (۴۳۲۸)۔

(۲) صحیح البخاری ۱۶۰/۷ (۵۸۹۶-۵۸۹۷)۔

جتنی بہتر سے بہتر خوشبو کسی عطر میں ہو سکتی ہے وہ اس پسینہ مبارک میں تھی اور لوگ مجھ سے کہتے تھے کہ ہم اپنی حنوط کو اس کے ساتھ مس کر لیں اور لوگ لے جایا کرتے تھے (۱)۔

مسلم شریف کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدار ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ یہ کیا کر رہی ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ

"نَرْجُو بَرَكَتَهُ لِصِبْيَانِنَا" (۲)

کہ یہ میں اپنے بچوں کے واسطے تبرک جمع کر رہی ہوں۔

فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَصَبْتَ

(أو كما قال عليه الصلاة والسلام)

آپ نے اس کی تصویب فرمائی، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تقریر بھی ثابت ہوگئی، فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ موئے مبارک تقسیم فرما رہے تھے، تو اس وقت انہوں نے ان سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی کے چند بال لے لیے تھے جو انہوں نے اپنی ٹوپی سے لگا لیے تھے اور اس ٹوپی کو پہن کر جنگوں میں شریک ہوتے اور فتح یاب ہوتے، جنگِ یمامہ میں وہ ٹوپی گر گئی، تو حضرتِ خالد رضی اللہ عنہ نے اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنی

---

(۱) صحيح البخاری ٦٣/٨ (٦٢٨١)۔

(۲) صحيح مسلم ١٨١٥/٤ (٢٣٣١) كتاب الفضائل/باب طيب عرق النبی صلى الله عليه وسلم والتبرك به.

جان کو خطرے میں ڈال کر نہایت زور دار حملہ کیا (۱)، اپنی جان کو اس خطرے میں ڈالنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان پر اعتراض کیا، تو انہوں نے جواب دیا:

"اِنّي لَمْ اَفْعَلْ ذٰلِكَ لِقِيمَةِ الْقَلَنْسُوَةِ لٰكِنْ كَرِهْتُ اَنْ تَقَعَ بِأَيْدِي الْمُشْرِكِيْنَ وَفِيْهَا شَعْرُ النَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَام"(۲)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا، جو کتاب الاشربہ میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ثقیفہ بنی ساعدہ میں تشریف فرما تھے، تو آپ نے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ بھائی ذرا پانی پلاؤ۔ وہ ایک پیالہ لے کر آئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پانی پلایا، تو آپ نے اس پیالے کو اٹھا کر محفوظ کر دیا، حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد جب حدیث سنائی، تو وہ کہتے ہیں کہ میں وہ پیالہ نکال کر لایا کہ دیکھو یہ پیالہ ہے میں نے جس میں نبی کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پانی پلایا تھا، تو سب نے کہا کہ ہم بھی اس میں پییں گے، تو سب نے اس میں پانی پیا اور اس پیالے کو باقاعدہ اہتمام کے ساتھ صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین نے محفوظ رکھا، یہ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کو واقعہ ہے۔(۳)

---

(۱) مسند ابی یعلی ۱۳/۱۳۸ (۷۱۸۳) والمعجم الکبیر للطبرانی ۴/۱۰۴ (۳۸۰۴) قال الهیثمی فی "مجمع الزوائد" ۹/۳۴۹ (۱۵۸۸۲) رواہ الطبرانی وابو یعلی بنحوہ ورجالهما رجال الصحیح وجعفر سمع من جماعة من الصحابة فلا ادری سمع من خالد ام لا؟ والمستدرك للحاكم ۳/۳۳۸ (۵۲۹۹) ودلائل النبوة للبیهقی ۶/۲۴۹۔

(۲) عمدة القاری ۳/۳۷ طبع دار احیاء التراث العربی۔

(۳) صحیح البخاری ۷/۱۱۳ (۵۶۳۷) وصحیح مسلم ۳/۱۵۹۱ (۲۰۰۷)۔

حضرتِ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی پیا تھا، تو وہ ٹوٹنے لگا، تو اس کو زنجیر سے باندھ کر یعنی اس میں تکے لگا کر اس کو محفوظ رکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی باقاعدہ اس کے تکے لگا لگا کر محفوظ رکھا (۱)۔

یہ ایک دو واقعات نہیں بے شمار واقعات ہیں۔

حضرتِ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے (جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اذان سکھائی تھی) ساری عمر اپنے بال نہیں منڈوائے، اس واسطے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک نے ان کو مس کیا تھا (۲)۔

یہ عشق کی باتیں ہیں یہ خشک مزاج لوگوں کی عقل میں نہیں آتیں اور یہ تفصیلات احادیث کے اندر موجود ہیں، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو آپ دیکھ رہے ہیں، عمر بن شبہ نے اخبارِ مدینہ میں روایت نقل کی ہے کہ حضرتِ عمر بن عبد العزیز نے سارے مدینہ اور اس کے ارد گرد جتنی مسجدیں تھیں، جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نماز پڑھنا ثابت ہے، ایک ایک آدمی سے پوچھ کر تحقیق کر کے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی تھی، اس کے اوپر پتھر لگوائے تھے کہ یہ مسجد ہے، جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی ہے۔ (۳)

---

(۱) صحیح البخاری ٨٣/٤ (٣١٠٩) و ١١٣/٧ (٥٦٣٨)۔

(۲) المستدرك للحاكم ٥٨٩/٣ (٦١٨١) سكت عنه الحاكم والذهبي۔ والمعجم الكبير للطبراني ١٧٦/٧ (٦٧٤٦) قال الهيثمي في "مجمع الزوائد" ١٦٥/٥ (٨٨٣٢) وفيه ايوب بن ثابت المكي قال ابو حاتم لا يحمد حديثه۔

کیا یہ سب کام بے کار اور مشرکانہ تھے؟ اور کیا وہ سب شرک کا ارتکاب کرتے تھے؟

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے منع کرنے کی وجہ

اب یہ بات کہ حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے منع کیا تھا، تو بھائی منع کرنے کے اسباب ہوتے ہیں۔ حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے منع اس لیے کیا تھا کہ اہلِ کتاب کے طریقے پر کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ان اماکن ہی کو نافع وضار سمجھنے لگیں یا ان کے اندر نماز پڑھنے کو واجب سمجھیں اور فرائض کو ترک کر کے اس کی طرف زیادہ متوجہ ہو جائیں، یہ بے شک شرک ہے[1]۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نفسِ تبرک بالمآثر کے منکر نہیں تھے

حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کی جہاں یہ بات ہے وہاں ایک اور بات بھی ہے جو کتاب المغازی میں مذکور ہے کہ حضرتِ زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نیزہ تھا جس سے ابو ذات الکرش کو قتل کیا تھا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وہ نیزہ رہا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا، تو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اٹھا کر اپنے پاس رکھا، جب حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا، تو حضرتِ زبیر رضی اللہ عنہ وہ نیزہ لے گئے، تو حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمہارے پاس وہ نیزہ ہے جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھا ہوا تھا، تو انہوں نے کہا کہ جی ہاں، تو حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے دے دو، میں اپنے پاس رکھوں گا، تو امیر المومنین

---

(۱) عمدة القاری شـرح صحـيح البخاری ٢٦٩/٤ طبع دار احياء التـراث العربی بيروت.

حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے وہ نیزہ ساری عمر اپنے پاس رکھا اور جب ان کا وصال ہوا، تو حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ نیزہ مانگا۔(۱)

تو یہ نیزہ ہی تو تھا لیکن اس کی اتنی حفاظت اور اتنا تحفظ؟ حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جیسا آدمی اس کی حفاظت کر رہا ہے، تو وہ کیوں؟ عنزہ کا لفظ آتا ہے اور حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے وہ اٹھا کر رکھا، تو معلوم ہوا کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ بھی نفسِ تبرک بالمآثر کے منکر نہ تھے، وہ وہی عنزہ اٹھا کر کیوں رکھتے؟ دنیا میں اس نام کے ہزاروں عنزے تھے۔ ہمارے یہاں بھی ایک میزائل کا نام عنزہ رکھا ہوا ہے، یہ اسی کے نام پر رکھا ہوا ہے، تو درحقیقت وہ عنزہ چونکہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس رہا تھا، اسی وجہ سے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اس کو اپنے پاس رکھنے میں سعادت سمجھتے تھے۔

شجرۂ بیعتِ رضوان کو کٹوانے کی وجہ

دوسرا واقعہ جو ان کا مشہور ہے وہ یہ کہ انہوں نے شجرۂ حدیبیہ (بیعتِ رضوان جس کے نیچے ہوئی تھی) کو کٹوا دیا تھا، اس میں پہلی بات تو یہ ہے جو امامِ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ درحقیقت جس درخت کو لوگ شجرۂ رضوان سمجھ رہے تھے، اس کے شجرۂ رضوان ہونے میں شک تھا، بخاری کی روایتِ مغازی میں ہے، جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "ہمیں تو پتا نہیں ہے، تم جانتے ہو تو بتاؤ" مطلب یہ ہے کہ ہمیں تعیین کے ساتھ وہ درخت یاد نہیں ہے تمہیں معلوم ہو، تو بتاؤ کہ کون سا درخت ہے؟ (۲)

---

(۱) صحیح البخاری ۸۱/۵ (۳۹۹۸)۔
(۲) صحیح البخاری ۱۲۵/۵ (۴۱۶۲ تا ۴۱۶۵)۔

اور لوگ تعیین کے ساتھ اس کو شجرۂ رضوان سمجھ رہے تھے اس لیے سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کو کٹوا دیا۔[1]

اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اندیشہ ہوا کہ لوگ اس کو باقاعدہ عرس کی جگہ نہ بنا لیں، تو اس واسطے انہوں نے کٹوا دیا، لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ کسی بھی آثر کو باقی نہ رکھا جائے۔

آپ نے دیکھا کہ جو روایتیں میں نے پیش کی ہیں، یہ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ تبرك بآثار الانبیاء و الصالحین بھی جائز اور ثابت ہے۔

○ آثر انبیاء علیہم السلام کے تبرکات کا مقصد

ان مشاہد اور تبرکات کا حاصل صرف اتنا ہے کہ آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت رکھنے والی چیز کے ساتھ ایک محبت کا اظہار کرے اور اس سے تبرک حاصل کرے، لیکن اس کو معبود سمجھ لے ۔العیاذ باللہ۔ یا اس کی عبادت شروع کر دے یا اس کے ساتھ مس کو واجب سمجھ لے، یہ حدود سے تجاوز کرنا ہے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو بعد میں لوگ ایسا کرنے لگیں، اس لیے انہوں نے منع کر دیا، لیکن منع کا یہ مطلب نہیں کہ تبرکات کی کوئی سرے سے حیثیت ہی نہیں۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے تو حجرِ اسود کو بھی کہہ دیا تھا کہ میں جانتا ہو کہ تو صرف پتھر ہی ہے، نہ تیرے اندر نفع پہنچانے کی طاقت ہے اور نہ تیرے اندر نقصان پہنچانے کی طاقت ہے، لیکن

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ۱۷۹/۵ (۷۶۲۷) طبع دار القبلة۔ والطبقات الکبری لابن سعد ۱۰۰/۲۔ طبع دار الصادر۔

"اَمَا وَاللهِ اِنِّیْ لَأَعْلَمُ اَنَّكَ حَجَرٌ، لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ لَوْ لَا اَنِّیْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يُقَبِّلُكَ لَمْ أُقَبِّلْكَ"(۱)

فرمایا۔ان کی نگاہ اس پر گئی کہ کہیں لوگ دوسری طرف غلو میں مبتلا نہ ہوجائیں، اس واسطے انہوں نے اس کو روکا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے نزدیک تبرکات کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

تبرکات مٹاؤ والے موقف کی حقیقت

لہٰذا جو موقف اختیار کیا ہے کہ تبرکات کو مٹاؤ، یہ بالکل غلو اور تشدّد فی الدّین ہے اور دلائلِ واضحہ کے خلاف اور مکابرہ ہے، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ یہ تبرک تبرک ہی کی حد میں رہنا چاہیے، اس سے آگے بڑھ کر عبادت نہ سمجھا جائے کہ تبرک کو عبادت بنالیں اور آدمی اسی کو نافع اور ضار سمجھنے لگے اور تعظیم ایسی کرنے لگے کہ عبادت کے ساتھ مشابہ ہو جائے، تو یہ باتیں منع ہیں اور غلو ہیں اور بعض جگہ شرک کی حد تک پہنچ جاتی ہیں، تو اس وجہ سے جہاں اس بات کا خطرہ ہو اور وہاں ممکن ہو، تو اس جگہ لوگوں کو ایسا کرنے سے روک لیں، بس حد میں رہنے کا پابند بنایا جائے اور جہاں ممکن نہ ہو، تو وہاں سدّ ذریعہ کے طور پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بالکل رک جاؤ، یہ وہاں ہے جہاں لوگ حدود کے پابند نہیں رہیں گے، لیکن اس کو مطلق شرک قرار دینا اور مآثر کو جان بوجھ کر مٹانا، یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مآثر کو ایک ایک کر مٹایا جا رہا ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری ۱۴۹/۲ (۱۵۹۷) وصحیح مسلم ۹۲۵/۲ (۱۲۷۰)۔

روضۂ اقدس پر بھی لوگ شرک کرتے تھے، وہاں جا کر بدعات کرتے تھے، لیکن حکومتِ سعودیہ نے آدمی کھڑے کر دیے، مجال ہے کہ آدمی ہاتھ باندھ کر بھی کھڑا ہو جائے، اس کی بھی اجازت نہیں دیتے، تو جو پابندی وہاں کی ہے دوسرے مآثر پر بھی کی جا سکتی ہے، لیکن مآثر کو ضائع کرنا اور باقاعدہ ختم کرنا اور اس کو مشن بنا لینا یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے۔

چودہ صدیوں سے امت نے نبی کریم ﷺ کے ایک ایک مآثر کو محفوظ رکھا، ایک ایک یادگار کو اپنے سینے سے لگا کر رکھا کہ کوئی آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، کوئی دوسری قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی تھی، خوخہ ابو بکر کو محفوظ رکھا، یہ نہیں کہ شرک کی وجہ سے، ارے عشق بھی کوئی چیز ہوتی ہے، محبت بھی ہوتی ہے، تعلقِ خاطر بھی ہوتا ہے، آدمی جب ان یادگاروں کو دیکھتا ہے تو ان واقعات کو یاد کرتا اور نبی کریم ﷺ اور ان کی سیرتِ طیبہ کو یاد کرتا ہے اس سے استحضار ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اللہ جل جلالہ رسولِ کریم ﷺ کی محبت میں اضافہ فرماتے ہیں۔

چودہ صدیوں تک جن چیزوں کو محفوظ رکھا گیا ان کو یک لخت اٹھا کر ختم کر دیا، جب سے یہ حکومت برسرِ اقتدار آئی ہے اس نے ایک ایک کر کے تمام آثر مٹا دیے یعنی ایک دم سے سارے نہیں، بلکہ رفتہ رفتہ مٹائے، تاکہ لوگ ہنگامہ نہ کر دیں، کبھی ایک مٹایا، کبھی دوسرا، اس طرح کر کے سب ختم کر دیے، کوئی باقی نہیں چھوڑا۔

مستند تبرّکات

یوں تو دنیا کے مختلف حصوں میں آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب

تبرّکات پائے جاتے ہیں، لیکن مشہور یہ ہے کہ استنبول میں محفوظ یہ تبرکات زیادہ مستند ہیں، ان میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جبہ مبارک، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو تلواریں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ جھنڈا جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں استعمال کیا گیا تھا، موئے مبارک، دندانِ مبارک، مقوقس شاہِ مصر کے نام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکتوبِ گرامی اور آپ کی مہرِ مبارک شامل ہیں۔

تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبرکات بنوعباس کے خلفاء کے پاس موجود تھے، چنانچہ یہ آخری عباسی خلیفہ المتوکل کے حصے میں بھی آئے تھے، وہ آخر میں مصر کے اندر مملوک سلاطین کے زیرِ سایہ زندگی بسر کر رہا تھا، اقتدار و اختیار میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ دسویں صدی ہجری میں جب حجاز اور مصر کے علاقوں نے عثمانی سلطان سلیم اول کی سلطنت تسلیم کر لی اور اسے خادم الحرمین الشریفین کا منصب عطا کیا گیا، تو عباسی خلیفہ المتوکل نے خلافت کا منصب بھی سلطان سلیم کو سونپ دیا اور مقاماتِ مقدسہ و حرمین شریفین کی کنجیاں اور یہ تبرکات بھی بطورِ سندِ خلافت ان کے حوالے کر دیے۔ اسی کے بعد سے سلاطینِ عثمان کو خلیفہ اور امیرالمؤمنین کا لقب مل گیا اور پوری دنیائے اسلام نے ان کی یہ حیثیت کسی اختلاف کے بغیر تسلیم کر لی۔

اس طرح سلطان سلیم دسویں صدی ہجری میں یہ تبرکات مصر سے استنبول لے کر آئے اور یہ اہتمام کیا کہ توپ کاپے سرائے میں ان کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک مستقل کمرہ تعمیر کیا۔ سلطان کی طرف سے ان تبرکات کی قدر دانی اور ان سے عشق و محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک سلطان سلیم زندہ رہے۔ استنبول میں مقیم رہنے کے دوران اس کمرے میں خود اپنے ہاتھ

سے جھاڑو دیتے اور اس کی صفائی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کمرے میں انہوں نے حفاظِ قرآن کو مقرر کیا کہ چوبیس گھنٹے یہاں تلاوت کرتے رہیں، حفاظ کی باریاں مقرر تھیں، ایک جماعت کا وقت ختم ہونے سے پہلے دوسری جماعت آکر تلاوت شروع کر دیتی تھی۔ اس طرح یہ سلسلہ بعد کے خلفاء نے بھی جاری رکھا، اس طرح دنیا میں شاید یہی واحد جگہ ہو جہاں چار سو سال تک تلاوتِ قرآن ہوتی رہی، اس دوران ایک لمحے کے لیےبھی بند نہیں ہوئی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد یعنی کمال اتاترک نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔

ان تبرّکات کو انتہائی نفیس لکڑی کے صندوقوں میں رکھا گیا ہے اور سال بھر میں صرف ایک بار رمضان کی ستائیسویں شب میں باہر نکال کر ان کی زیارت کرائی جاتی ہے، عام دنوں میں تبرکات صندوقوں میں بند رہتے ہیں، بس صرف صندوق ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ بہر حال! اس ظرف کی زیارت بھی ایک نعمتِ عظمیٰ ہے، جسے ان کی صحبت و مساس کا شرف حاصل ہو سعادت سے خالی نہیں ہے۔

درجۂ استناد کے لحاظ سے ان تبرکات کی جو بھی حیثیت ہو، لیکن ایک امتی کے لیے اس نسبت کی سچائی کا احتمال اور صرف احتمال بھی کیا کم ہے!

اسی کمرے میں کچھ اور تبرکات بھی رکھے ہوئے ہیں جو شوکیسوں میں محفوظ ہیں اور شفاف شیشیوں کے واسطے سے ان کی زیارت کی جا سکتی۔ ان میں ایک تلوار حضرتِ داوٗد علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، چار تلواریں چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب ہیں، ان کے علاوہ حضرتِ خالد بن ولید، حضرت جعفرِ طیار، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت ابو الحصین رضی اللہ عنہم کی طرف

منسوب تلواریں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ایک حصے میں کعبہ شریف کے دروازے کا ایک ٹکڑا، کعبہ شریف کا قفل اور چابیاں، میزاب رحمت کے دو ٹکڑے اور وہ تھیلا بھی محفوظ ہے جس میں کسی زمانے میں حجرِ اسود رکھا گیا تھا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ اقدس کی مٹی بھی موجود ہے، لیکن محققین کا کہنا ہے کہ تلواروں کی نسبت مشکوک ہے۔ (۱)

حضرتِ انس رضی اللہ عنہ نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک بال رکھا ہوا ہے، جب میں مروں، تو مرنے کے بعد وہ میرے منہ میں رکھ دینا اور اس کے ساتھ مجھے دفن کر دینا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا کہ دفن کے وقت ان کے منہ میں موئے مبارک رکھا ہوا تھا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ تبرک بآثار الانبیاء و الصالحین جائز ہے اور ثابت ہے۔ (۲)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۱) مزید تفصیل جاننے کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کا سفر نامہ ''جہانِ دیدہ'' ص ۳۳۶ تا ۳۴۰ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) الاصابہ فی تمییز الصحابہ ۲۷۶/۱ طبع دار الکتب العلمیہ۔ اس طرح کا ایک واقعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی منقول ہے ملاحظہ ہو رسائل ابن ابی الدنیا ۳۱۹/۵ (٦٦) رسالۃ المحتضرین۔ عنایت۔
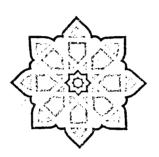
خواب کی حیثیت

(اصلاحی خطبات ج ۵ ص ۸۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خواب کی حیثیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

”عن أبی ہریرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: «لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرات»، قَالُوا: وَمَا الْمُبَشِّرَات؟ قَالَ: «الرُّؤْيَا الصَّالِحَة»[1]“

حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(۱) صحیح البخاری ۳۱/۹ (۶۹۹۰) کتاب التعبیر / باب المبشرات۔

نے ارشاد فرمایا کہ نبوت منقطع ہوگئی اور سوائے مبشرات کے نبوت کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا، صحابہ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! مبشرات کیا ہیں؟ (مبشرات کے معنی ہیں خوش خبری دینے والی چیزیں) جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سچے خواب۔ (یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبشرات ہوتے ہیں اور یہ نبوت کا ایک حصہ ہے)

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا خواب، نبوت چھیالیسواں حصہ ہے[1]۔

سچے خواب نبوت کا حصہ ہیں

مطلب اس کا یہ ہے کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا وقت آیا، تو ابتداء میں چھ ماہ تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نہیں آئی، بلکہ چھ ماہ تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سچے خواب آتے رہے، حدیث میں آتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی خواب دیکھتے تو جو واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا ہوتا، بعینہ بیداری میں وہ واقعہ پیش آجاتا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ خواب سچا ہوجاتا اور صبح کے اجالے کی طرح سچا ہونا لوگوں کے سامنے واضح ہو جاتا،[2] اس طرح چھ ماہ تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سچے خواب آتے رہے،[3] اس کے بعد پھر وحی کو سلسلہ شروع ہوا اور نبوت کے ملنے کے بعد تیئس سال تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف فرما

---

(۱) صحیح البخاری ۳۰/۹ (۶۹۸۷) وصحیح مسلم ۱۷۷۴/٤ (۲۲٦٤)۔

(۲) صحیح البخاری ۷/۱ (۳) و ۲۹/۹ (٦۹۸۲) وصحیح مسلم ۱۳۹/۱ (۱٦۰)۔

(۳) فتح الباری ٤/۹ و ۳۵۷/۱۲۔ السیرۃ الحلبیۃ ۳۲۵/۱ طبع دار الکتب العلمیۃ۔ وزاد المعاد لابن القیم ۸۳/۱ طبع الرسالۃ۔

رہے، ان تئیس سالوں میں سے چھ ماہ کا عرصہ صرف سچے خوابوں کا زمانہ تھا، اب تئیس سال کو دو سے ضرب دیں گے، تو چھیالیس بن جائیں گے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں، گویا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبوت کے زمانے کو چھیالیس حصوں میں تقسیم کیا جائے، تو اس میں سے ایک حصے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سچے خواب ہی آتے رہے، وحی نہیں آئی، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے اور اشارہ اس طرف کر دیا کہ یہ سلسلہ میرے بعد بھی جاری رہے گا اور مؤمنوں کو سچے خواب دکھائے جائیں گے اور ان کے ذریعے بشارتیں دی جائیں گی اور ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ قیامت کے قریب آخری زمانے میں مسلمانوں کو بیشتر خواب سچے آئیں گے [1] اس سے معلوم ہوا کہ خواب بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور آدمی کو اس کے ذریعے بشارتیں ملتی ہیں، لہٰذا اگر خواب کے ذریعے کوئی بشارت ملے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

خواب کے بارے میں دو رائیں

لیکن ہمارے یہاں خواب کے معاملے میں بڑی افراط و تفریط پائی جاتی ہے، بعض لوگ تو وہ ہیں جو سچے خوابوں کے قائل ہی نہیں، نہ خواب کے قائل نہ خواب کی تعبیر کے قائل ہیں، اس لیے کہ ابھی آپ نے سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سچے خواب مبشرات ہیں اور دوسری طرف بعض لوگ وہ ہیں جو خوابوں ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور خواب ہی کو مدارِ نجات اور مدارِ فضیلت سمجھتے ہیں، اگر

(۱) صحیح البخاری ۳۷/۹ (۷۰۱۷) و صحیح مسلم ۱۷۷۳/٤ (۲۲۶۳)۔

کسی نے اچھا خواب دیکھ لیا، تو بس اس کے معتقد ہو گئے اور اگر کسی نے اپنے بارے میں اچھا خواب دیکھ لیا، تو وہ اپنا ہی معتقد ہو گیا کہ اب میں پہنچا ہوا بزرگ ہو گیا ہوں، یہ خواب تو سونے کی حالت میں ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ بیداری کی حالت میں بعض چیزیں دکھاتے ہیں، جس کو کشف کہتے ہیں، چنانچہ اگر کسی کو کشف ہو گیا، تو لوگ اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا آدمی ہے، اب چاہے بیداری کے اندر اس کے حالات سنت کے مطابق نہ بھی ہوں، خوب سمجھ لیجیے کہ انسان کی فضیلت کا اصل معیار خواب اور کشف نہیں، بلکہ اصل معیار یہ ہے کہ اس کی بیداری کی زندگی سنت کے مطابق ہے یا نہیں؟ بیداری کی حالت میں وہ گناہوں سے پرہیز کر رہا ہے یا نہیں؟ بیداری کی حالت میں وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت کر رہا ہے یا نہیں؟ اگر اطاعت نہیں کر رہا ہے، تو پھر اس کو ہزار خواب نظر آئے ہوں، ہزار کشف ہوئے ہوں، ہزار کرامتیں اس کے ہاتھ پر صادر ہوئی ہوں، وہ معیارِ فضیلت نہیں، آج کل اس معاملے میں بڑی سخت گمراہی پھیلی ہوئی ہے، پیری مریدی کے ساتھ اس کو لازم سمجھ لیا گیا ہے، ہر وقت لوگ خوابوں اور کشف و کرامات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

خواب کی حیثیت

خواب کے بارے میں اہل علم کا ایک چھوٹا پیارا سا جملہ ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے، وہ جملہ خواب کی حقیقت واضح کرتا ہے فرمایا:

"اَلرُّؤْیَا تَسُرُّ وَلَا تَغُرُّ"

یعنی خواب ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان خوش ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اچھا خواب دکھایا، لیکن خواب کسی انسان کو دھوکے میں نہ ڈالے اور وہ یہ نہ سمجھے کہ بہت پہنچا ہوا ہو گیا اور اس کے نتیجے میں بیداری کے اعمال سے غافل ہو جائے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور تعبیرِ خواب

حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے بہت سے لوگ خواب کی تعبیر پوچھتے تھے کہ میں نے یہ خواب دیکھا، میں نے یہ خواب دیکھا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ عام طور پر یہ شعر پڑھتے تھے کہ ؎

نہ شب ام نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

یعنی نہ تو میں رات ہوں اور نہ رات کو پوجنے والا ہوں کہ خواب کی باتیں کروں اللہ تبارک و تعالیٰ نے تو مجھے آفتاب سے نسبت عطا فرمائی ہے، یعنی آفتابِ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے، اس لیے تو میں اسی کی بات کہتا ہوں، بہر حال! خواب کتنے ہی اچھے آ جائیں، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، وہ مبشرات ہیں، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت اس کی برکت عطا فرما دے، لیکن محض خواب کی وجہ سے بزرگی اور فضیلت کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مبشرات

میرے والد ماجد رحمہ اللہ کے بارے میں بیسیوں افراد نے خواب دیکھے، مثلاً

خواب میں حضور اقدس ﷺ کی زیارت ہوئی اور حضور اقدس ﷺ کو میرے والدِ ماجد کی شکل میں دیکھا، یہ اور اس قسم کے دوسرے خواب بے شمار افراد نے دیکھے، چنانچہ جب لوگ اس قسم کے خواب لکھ کر بھیجتے، تو حضرت والدِ ماجد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کو اپنے پاس محفوظ رکھ لیتے اور ایک رجسٹر جس پر یہی عنوان تھا ''مبشرات'' یعنی خوش خبری دینے والے خواب، اس رجسٹر میں نقل کرادیتے تھے، لیکن اس رجسٹر کے پہلے صفحے پر اپنے قلم سے یہ نوٹ لکھا تھا:

> ''اس رجسٹر میں ان خوابوں کو نقل کر رہا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے میرے بارے میں دیکھے ہیں، اس غرض سے نقل کر رہا ہوں کہ بہر حال یہ مبشرات ہیں، فالِ نیک ہیں، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے میری اصلاح فرما دے، لیکن میں سب پڑھنے والوں کو متنبہ کر رہا ہوں کہ آگے جو خواب ذکر کیے جا رہے ہیں، یہ ہرگز مدارِ فضیلت نہیں اور ان کی بنیاد پر میرے بارے میں فیصلہ نہ کیا جائے، بلکہ اصل مدار بیداری کے افعال و اقوال ہیں، لہٰذا اس کی وجہ سے آدمی دھوکے میں نہ پڑے۔''

یہ آپ نے اس لیے لکھ دیا کہ کوئی پڑھ کر دھوکہ نہ کھائے، بس یہ حقیقت ہے خواب کی، بس جب انسان اچھا خواب دیکھے تو اللہ کا شکر ادا کرے اور دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرے حق میں باعث برکت بنا دے، لیکن اس کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا نہ ہو، نہ دوسرے کے بارے میں، نہ اپنے بارے میں، بس خواب کی حقیقت اتنی ہی ہے، اسی خواب سے متعلق دو تین احادیث اور ہیں، جن کے بارے میں اکثر و بیشتر لوگوں کو معلومات نہیں ہیں، جس کی وجہ

سے غلط فہمی میں پڑے رہتے ہیں، اس لیے ان احادیث کو بھی پڑھ لینا مناسب اور ضروری ہے۔

شیطان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں نہیں آسکتا

"عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ:
«مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ بِي»" (۱)

حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا (یعنی جس نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی) تو اس نے مجھے ہی دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا۔

اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ خواب میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی سعادت عطا فرما دے، تو یہ بڑی عظیم سعادت ہے اور اس کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے؟ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس معروف حلیہ کے مطابق دیکھے جو احادیث کے ذریعے سے ثابت ہے، تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی دیکھتا ہے، شیطان یہ دھوکہ نہیں دے سکتا کہ۔ معاذ اللہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں آجائے، یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں اپنی زیارت کی خصوصیت بیان فرما دی۔

(۱) صحیح مسلم ۱۷۷۵/۴ (۲۲۶۶) وصحیح البخاری ۳۳/۱ (۱۱۰)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت عظیم سعادت

الحمد للہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بہت سے لوگوں کو یہ سعادت عطا فرما دیتے ہیں اور انہیں خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوجاتی ہے، یہ بڑی عظیم نعمت اور عظیم سعادت ہے، لیکن اس معاملے میں ہمارے بزرگوں کے ذوق مختلف رہے ہیں، ایک ذوق تو یہ ہے کہ اس سعادت کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے اور ایسے عمل کیے جاتے ہیں جس سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوجائے اور بزرگوں نے ایسے خاص خاص عمل لکھے ہیں، مثلاً یہ کہ جمعہ کی شب میں اتنی مرتبہ درود شریف پڑھنے کے بعد فلاں عمل کر کے سوئے، تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہونے کی توقع اور امید ہوتی ہے اور اس قسم کے بہت سے اعمال مشہور ہیں، بعض حضرات کا ذوق اور مذاق یہ ہے، اب اگر کوئی شخص اس ذوق کے پیشِ نظر خواب میں زیارت کی کوشش کرنا چاہے، تو کر لے اور اس سعادت سے سرفراز ہو جائے۔

زیارت کی اہلیت کہاں؟

لیکن دوسرے بعض حضرات کا ذوق کچھ اور ہے، مثلاً میرے والدِ ماجد قدس اللہ سرہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، ایک مرتبہ آ کر کہنے لگے کہ طبیعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا بہت شوق ہو رہا ہے، کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جس کے نتیجے میں یہ نعمت حاصل ہو جائے، حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بھائی تم بڑے حوصلے والے آدمی ہو کہ تم اس بات کی تمنا کرتے ہو کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو جائے، ہمیں یہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ یہ تمنا بھی

کریں، اس لیے کہ ہم کہاں اور نبی کریم ﷺ کی زیارت کہاں؟ اس لیے کبھی اس قسم کے عمل سیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور نہ کبھی یہ سوچا کہ ایسا عمل سیکھا جائے، جس کی وجہ سے سرکارِ دو عالم ﷺ کی زیارت ہو جائے۔ اس لیے کہ اگر زیارت ہو جائے، تو ہم اس کے آداب، اس کے حقوق، اس کے تقاضے کس طرح پورے کریں گے؟ اس لیے خود سے اس کے حصول کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے فضل سے زیارت کرا دیں، تو یہ ان کا انعام ہے اور جب خود کرائیں گے تو پھر اس کے آداب کی توفیق بھی بخشیں گے، لیکن خود سے ہمت نہیں ہوتی، البتہ جس طرح ایک مؤمن کے دل میں آرزو ہوتی ہے اس طرح کی آرزو دل میں ہے، لیکن زیارت کی کوشش کرنا بڑی ہمت اور حوصلے والوں کا کام ہے، مجھے تو حوصلہ ہوتا نہیں ہے، بہر حال! اس سلسلے میں ذوق مختلف رہے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور روضۂ اقدس کی زیارت

میں نے اپنے والد صاحب قدس اللہ سرہ کا یہ واقعہ آپ کو پہلے بھی سنایا تھا کہ جب روضۂ اقدس پر حاضر ہوتے، تو کبھی روضۂ اقدس کی جالی تک پہنچ ہی نہیں پاتے تھے، بلکہ ہمیشہ یہ دیکھا کہ جالی کے سامنے ایک ستون ہے، اس ستون سے لگ کر کھڑے ہو جاتے اور جالی کا بالکل سامنا نہیں کرتے تھے، بلکہ وہاں اگر کوئی آدمی کھڑا ہوتا، تو اس کے پیچھے جا کر کھڑے ہو جاتے اور ایک دن خود ہی فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید تو بڑا شقی القلب آدمی ہے، یہ اللہ کے بندے ہیں جو جالی کے قریب تک پہنچ جاتے

ہیں اور قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جتنا بھی قرب حاصل ہو جائے وہ نعمت ہی نعمت ہے، لیکن میں کیا کروں کہ میرا قدم آگے بڑھتا ہی نہیں، شاید کچھ شقاوتِ قلب ہے، فرماتے ہیں کہ وہاں کھڑے کھڑے دل میں یہ خیال پیدا ہوا، مگر اس کے بعد فوراً یہ محسوس ہوا جیسا کہ روضۂ اقدس سے یہ آواز آ رہی ہے کہ

> جو شخص ہماری سنتوں پر عمل کرتا ہے، وہ ہم سے قریب ہے، خواہ ہزاروں میل دور ہو اور جو شخص ہماری سنتوں پر عمل نہیں کرتا وہ ہم سے دور ہے، چاہے وہ ہماری جالیوں سے چمٹا ہوا ہو۔

اصل مدار بیداری کے اعمال ہیں

بہرحال! اصل دولت ہے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا اتباع، اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ بیداری کی حالت میں ان سنتوں کی توفیق ہو جائے، یہ ہے اصل نعمت، اصل دولت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل قرب یہی ہے، لیکن اگر سنتوں پر عمل نہیں اور روضہ اقدس کی جالیوں سے چمٹا کھڑا ہے اور زیارت کی کوشش کر رہا ہے، تو ہمارے خیال میں یہ بڑی جسارت ہے، اس لیے اصل فکر اس کی ہونا چاہیے کہ سنت کی اتباع ہو رہی ہے یا نہیں؟ اس کی فکر کرو، خوابوں کے پیچھے بہت زیادہ پڑنا مطلوب اور مقصود نہیں، البتہ اگر حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، لیکن اس پر نجات کا مدار نہیں، کیونکہ غیر اختیاری معاملہ ہے، ہمارے طبقے میں ایک بڑی تعداد ہے جو خوابوں ہی کے

پیچھے پڑی ہے، دن رات یہی فکر ہے کہ کوئی اچھا خواب آجائے، اسی کو منتہائے مقصود سمجھا ہوا ہے، حالانکہ یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ پھر یہ ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی اچھا خواب اپنے بارے میں دیکھ لیا، تو بس پھر یہ سمجھا کہ اب میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہوں، خوب سمجھ لیں کہ خواب اپنی ذات میں نہ تو کسی کا درجہ بلند کرتا ہے اور نہ اجر و ثواب کا موجب ہوتا ہے، بلکہ اصل مدار بیداری کے اعمال پر ہے، یہ دیکھو کہ تم بیداری میں کیا عمل کر رہے ہو۔

اچھا خواب دھوکے میں نہ ڈالے

لہٰذا اگر کسی شخص نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت میں پھر رہا ہوں اور جنت کے باغات اور محلات کی سیر کر رہا ہوں، تو یہ بڑی اچھی بشارت ہے، لیکن اس کی وجہ سے دھوکے میں نہ آئے کہ جنتی ہو گیا، لہٰذا اب مجھے کسی عمل اور کوشش کی حاجت اور ضرورت نہیں، یہ خیال غلط ہے، بلکہ اگر کوئی شخص اچھا خواب دیکھنے کے بعد اعمال کے اندر اور زیادہ اتباع کا اہتمام کرنے لگتا ہے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خواب اچھا اور سچا اور بشارت والا تھا اور اس سے اس نے غلط نتیجہ نہیں نکالا، لیکن اگر خدا نہ کرے خواب دیکھنے کے بعد اعمال چھوڑ بیٹھا اور اعمال کی طرف سے غفلت ہو گئی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خواب نے اس کو دھوکے میں ڈال دیا۔

خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی بات کا حکم دینا

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اگر خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہو گئی، تو اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو کوئی مجھے خواب

میں دیکھتا ہے تو مجھے ہی دیکھتا ہے، اس لیے کہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا، لہٰذا اگر خواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت ہو اور وہ کوئی ایسا کام کرنے کو کہیں جو شریعت کے دائرے میں ہے، مثلاً فرض ہے یا واجب ہے یا سنت ہے یا مباح ہے، تو پھر اس کام کو اہتمام سے کرنا چاہیے، اس لیے جو کام شریعت کے دائرے میں ہے اس کے کرنے کا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حکم فرما رہے ہیں تو وہ خواب سچا ہوگا، اس کام کا کرنا ہی اس کے حق میں مفید ہے اور اگر نہیں کرے گا، تو بعض اوقات اس کے حق میں بے برکتی شدید ہو جاتی ہے۔

خواب حجتِ شرعی نہیں

لیکن اگر خواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایسی بات کا حکم دیں جو شریعت کے دائرے میں نہیں ہے، مثلاً خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت ہوئی اور ایسا محسوس ہوا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک ایسی بات کا حکم فرمایا جو شریعت کے ظاہری احکام کے دائرے میں نہیں ہے، تو خوب سمجھ لیجیے کہ اس خواب کی وجہ سے وہ کام کرنا جائز نہ ہوگا، اس لیے کہ ہمارے دیکھے ہوئے خواب کی بات کو اللہ تعالیٰ نے مسائلِ شرعیہ میں حجت نہیں بنایا اور جو ارشادات حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے قابلِ اعتماد واسطوں سے ہم تک پہنچے ہیں، وہ حجت ہیں، ان پر عمل کرنا ضروری ہے، خواب کی بات پر عمل کرنا ضروری نہیں، کیونکہ یہ بات تو صحیح ہے کہ شیطان حضور اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صورت میں نہیں آسکتا، لیکن بسا اوقات خواب دیکھنے والے کے ذاتی خیالات اس خواب کے ساتھ مل کر گڈ مڈ ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس کو غلط بات یاد رہ جاتی ہے یا سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے، اس لیے

ہمارے خواب حجت نہیں [1]۔

خواب کا ایک عجیب واقعہ

ایک قاضی تھے لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک مقدمہ سامنے آیا اور مقدمے کے اندر گواہ پیش ہوئے اور شریعت کے مطابق گواہوں کی جانچ پڑتال کا جو طریقہ ہے، وہ پورا کرلیا اور آخر میں مدعی کے حق میں فیصلہ کرنے کا دل میں ارادہ بھی ہوگیا، لیکن قاضی صاحب نے کہا کہ اس فیصلے کا اعلان کل کریں گے، یہ خیال ہوا کہ کل تک ذرا اور سوچ لوں گا، لیکن جب رات کو سوئے تو خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی اور جب صبح بیدار ہوئے تو ایسا یاد آیا کہ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرما رہے تھے کہ جو تم فیصلہ کرنے کا ارادہ کررہے ہو یہ فیصلہ غلط ہے، یہ فیصلہ یوں کرنا چاہیے، اب اٹھ کر جو غور کیا تو جس طریقے سے فیصلہ کرنے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا وہ کسی طرح شریعت کے دائرے میں فٹ نہیں ہوتا تھا، اب بڑے پریشان ہوئے کہ ظاہری طور پر شریعت کا جو تقاضا ہے، اس کے لحاظ سے تو یہ فیصلہ اس طرح ہونا چاہیے، لیکن دوسری طرف خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں کہ اس طرح فیصلہ کرو، اب معاملہ بڑا سنگین ہوگیا اور یہ جو مقدمے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ بڑی سنگین ذمہ داری ہوتی ہے، جن لوگوں پر گزرتی ہے، وہی اس کو جانتے ہیں، راتوں کی نیندیں حرام ہوجاتی ہیں۔

چنانچہ قاضی صاحب نے خلیفہ صاحب سے جا کر بتایا کہ اس طرح سے یہ

---

(۱) کما فی الدرالمختار مع رد المحتار ۱/۳۸۳ ان رویا غیر الانبیاء لا یبنی علیها حکم شرعی.

مقدمہ پیش آ گیا اور حضور ﷺ نے اس طرح فیصلہ کرنے کو فرمایا، آپ علماء کو جمع فرمائیں تا کہ اس کے بارے میں ان سے مشورہ ہو جائے، چنانچہ سارے شہر کے علماء جمع ہوئے اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا کہ اس طرح سے مقدمہ در پیش ہے، ظاہری طور پر شریعت کا تقاضا یہ ہے، لیکن دوسری طرف خواب میں حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے، اب کیا کیا جائے؟

علماء نے فرمایا واقعۃً یہ معاملہ بڑا سنگین ہے، حضور ﷺ کی زیارت ہوئی اور شیطان آپ کی صورتِ مبارکہ میں آ نہیں سکتا، لہٰذا حضور ﷺ کے فرمان پر عمل کرنا چاہیے، لیکن اس زمانے کے ایک بزرگ جو اپنے زمانے کے بزرگ کہلاتے تھے، حضرت شیخ عز الدین بن عبد السلام رحمہ اللہ، وہ بھی مجلس میں حاضر تھے وہ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ میں پورے جزم اور وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ شریعت کے قاعدے کے مطابق آپ جو فیصلہ کرنے جا رہے ہیں، وہی فیصلہ کیجیے اور سارا گناہ اور ثواب میری گردن پر ہے، خواب کی بات پر فیصلہ کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ خواب میں ہزاروں احتمالات ہو سکتے ہیں، خدا جانے اپنے دل کی کوئی بات اس میں آ گئی ہو، اگرچہ حضورِ اقدس ﷺ کی صورتِ مبارکہ میں شیطان نہیں آسکتا، لیکن ہو سکتا ہے کہ بیداری کے بعد شیطان نے کوئی وسوسہ ڈال دیا ہو، کوئی غلط بات دل میں آ گئی ہو، شریعت نے حضورِ اقدس ﷺ کی بیداری میں سنے ہوئے ارشادات کے مقابلے میں ہمارے خواب کو حجت قرار نہیں دیا اور حضورِ اقدس ﷺ کے جو ارشادات ہم تک سندِ متصل کے ساتھ پہنچے ہیں، وہی ہمارے لیے حجت ہیں، ہمیں انہی پر عمل کرنا ہے، آپ بھی اس پر کیجیے اور گناہ ثواب میری گردن پر ہے (۱)۔

---

(۱) علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے تنویر الحوالک مؤطا شرح امام مالک ص ۲۵۴ پر شیخ عز الدین بن عبد السلام

خواب اور کشف وغیرہ سے شرعی حکم نہیں بدل سکتا

یہ اللہ کے بندے ہوتے ہیں، جو اس قوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، ورنہ یہ بات کہنا آسان کام نہیں تھا کہ "گناہ وثواب میری گردن پر" جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس دین کی صحیح تشریح کے لیے اور اس دین کی حفاظت کے لیے بھیجتے ہیں، ان سے ایسی باتیں کرا دیتے ہیں، اگر ایک مرتبہ یہ اصول مان لیا جاتا کہ خواب سے بھی شریعت بدل سکتی ہے، تو پھر شریعت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا، ایک سے ایک خواب لوگ دیکھ لیتے اور آکر بیان کر دیتے، آج آپ دیکھیں کہ یہ جتنے جاہل پیر ہیں، جو بدعات میں مبتلا ہیں، وہ انہی خوابوں کو سب کچھ سمجھتے ہیں، کوئی خواب دیکھ لیا یا کشف ہو گیا، الہام ہو گیا اور اس کی بنیاد پر شریعت کے خلاف عمل کر لیا، خواب تو خواب ہے، اگر کسی کو کشف ہو جائے جو جاگتے اور بیداری کی حالت میں ہوتا ہے، اس میں آواز آتی ہے اور وہ آواز کانوں کو سنائی دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود کشف شریعت میں حجت نہیں، کوئی شخص کتنا ہی پہنچا ہوا عالم یا بزرگ ہو، اس نے اگر خواب دیکھ لیا یا اس کو کوئی کشف یا الہام ہو گیا، وہ بھی شرعی احکام کے مقابلے میں حجت نہیں ہے۔

= کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ ایک شخص کو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ فلاں جگہ کھودو وہاں خزانہ ہے اسے لے لو اور تمہارے اوپر اس کا خمس (پانچواں حصہ جو بیت المال میں جمع ہوتا ہے) نہیں ہے۔ صبح اس شخص نے جب مطلوبہ زمین کھودی تو اس سے خزانہ برآمد ہوا تو اس وقت کے علماء نے اس خواب کے سچے ہونے کی بنیاد پر یہ فتویٰ دیا کہ اس میں خمس نہیں ہے، لیکن شیخ عز الدین بن عبد السلام نے فتویٰ دیا کہ اس میں خمس ہے اور فرمایا کہ اس کا یہ خواب صحیح احادیث سے ثابت شدہ مسئلہ کے خلاف ہے، لہٰذا اس کے خواب کی کوئی حیثیت نہیں اور اس کی وجہ سے اس سے خمس ساقط نہیں ہوگا۔ از مرتب۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت مولانا شیخ عبد القادر رحمہ اللہ جو سلطان الاولیا ہیں، ایک مرتبہ رات کو عبادت میں مشغول تھے، تہجد کا وقت ہے شیخ عبد القادر جیلانی جیسا ولی اللہ عبادت کر رہا ہے، اس وقت ایک زبردست نور چمکا اور اس نور میں سے یہ آواز آئی کہ اے عبدالقادر! تو نے ہماری عبادت کا حق ادا کر دیا، اب تو اس مقام پر پہنچ گیا کہ آج کے بعد ہماری طرف سے تم پر کوئی عبادت فرض و واجب نہیں، نماز تیری معاف، تیرا روزہ معاف، تیرا حج اور تیری زکوۃ معاف، اب تو جس طرح چاہے عمل کرے ہم نے تجھے جنتی بنا دیا، شیخ عبد القادرؒ نے سنتے ہی فورا جواب میں فرمایا کہ

> "مردود دور ہو جا، یہ نماز حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تو معاف نہیں ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام سے تو معاف نہیں ہوئی، مجھ سے کیسے معاف ہو جائے گی؟ دور ہو جا"۔

یہ کہہ کر شیطان کو دور کر دیا، اس کے بعد ایک اور نور چمکا، جو پہلے نور سے بھی بڑا نور تھا اس میں سے آواز آئی کہ عبد القادر! تیرے علم نے آج تجھے بچا لیا، ورنہ یہ وہ داؤ ہے، جس سے میں نے بڑے بڑوں کو ہلاک کر دیا، اگر تیرے پاس علم نہ ہوتا، تو ہلاک ہو چکا ہوتا، حضرت شیخ نے فرمایا کہ "مردود دوبارہ بہکاتا ہے میرے علم نے مجھے نہیں بچایا، میرے اللہ نے مجھے بچایا ہے۔"
عارفین فرماتے ہیں کہ یہ دوسرا داؤ پہلے داؤ سے زیادہ سنگین تھا، اس لیے کہ اس وقت شیطان نے ان کے اندر علم کا ناز پیدا کرنا چاہا تھا، کہ تمہارے علم اور تقویٰ نے تمہیں بچا لیا، لیکن آپ نے اس کو بھی رد کر دیا۔(۱)

---

(۱) التوسل والوسیلۃ لابن تیمیۃ ص ٤٤ طبع مکتبۃ الفرقان۔

خواب کے ذریعے حدیث کی تردید جائز نہیں

بھائی! یہ راستہ بڑا خطرناک ہے، آج کل خاص طور پر جس طرح کا مذاق بنا ہوا ہے کہ لوگ خواب، کشف، کرامات اور الہامات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، یہ دیکھے بغیر کہ شریعت کا تقاضا کیا ہے؟ اچھے خاصے دین دار اور پڑھے لکھے لوگوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کردیا کہ مجھے یہ کشف ہوا ہے کہ فلاں حدیث صحیح نہیں ہے اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی فلاں حدیث یہودیوں کی گھڑی ہوئی ہے اور مجھے یہ بات کشف کے ذریعے معلوم ہوئی ہے، اگر اس طریقے سے کشف ہونے لگے، تو دین کی بنیادیں ہل جائیں، اللہ تعالیٰ ان علماء کو غریقِ رحمت کرے، جن کو درحقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین کا محافظ بنایا، یہ دین کے چوکیدار ہیں، لوگ ان پر ہزار لعنتیں ملامتیں کریں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کا محافظ اور نگہبان بنایا، تاکہ کوئی دین پر حملہ نہ کرسکے اور دین میں تحریف نہ ہو، چنانچہ ان علماء نے صاف صاف کہہ دیا کہ چاہے کشف ہو یا الہام ہو یا کرامت ہو، ان میں سے کوئی چیز بھی دین میں حجت نہیں، وہ چیزیں حجت ہیں جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیداری کے عالم میں ثابت ہیں، کبھی خواب، کشف و الہام اور کرامت کے دھوکے میں مت آنا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح کشف تو دیوانوں بلکہ کافروں کو بھی ہوجاتا ہے، اس لیے کبھی اس دھوکے میں مت آنا کہ نور نظر آگیا یا دل چلنے لگا یا دل دھڑکنے لگا وغیرہ، اس لیے کہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ شریعت میں ان چیزوں پر فضیلت کا کوئی مدار نہیں۔

خواب دیکھنے والا کیا کرے؟

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، لہٰذا جو شخص خواب میں کوئی ایسی چیز دیکھے جو ناگوار ہو تو بائیں جانب تین مرتبہ تھتکار دے اور ''أعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیمِ'' پڑھ لے(۱)، جس کروٹ پر خواب دیکھا تھا، اس کی جگہ دوسری کروٹ بدل لے، پھر یہ خواب ان شاء اللہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا، مثلاً بعض اوقات انسان کچھ ڈراؤنے خواب دیکھ لیتا ہے یا کوئی برا واقعہ دیکھ لیتا ہے، تو ایسے موقع کے لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلقین فرما دی کہ جیسے ہی آنکھ کھلے فوراً یہ عمل کرے اور اگر کوئی اچھا خواب دیکھے، مثلاً اپنے بارے میں کوئی دینی یا دنیوی ترقی دیکھی، تو اس صورت میں اپنے جاننے والے اور اپنے محبت کرنے والوں کے سامنے اس خواب کا تذکرہ کرے، دوسروں کو نہ بتائے، کیونکہ بعض اوقات ایک آدمی وہ خواب سن کر اس کی الٹی سیدھی تعبیر بیان کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے اس اچھے خواب کی تعبیر اس کے مطابق ہو جاتی ہے، اس لیے اپنے محبت کرنے والوں کو وہ خواب بتائے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

خواب بیان کرنے والے کے لیے دعا کرنا

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے خواب دیکھا ہے اور پھر وہ اپنا خواب بیان کرنے لگے، تو ایسے موقع پر حضورِ اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ

(۱) صحیح البخاری ۱۲۵/٤ (۳۲۹۲) و ۱۳۳/۷ (۵۷٤۷) و صحیح مسلم ۱۷۷۱/٤ (۲۲٦۱)۔

جب کوئی شخص آ کر بتاتا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے، تو حضورِ اقدس ﷺ یہ دعا پڑھتے:

"خَيرًا تَلقَّاهُ وَ شَرًّا تَوَقَّاهُ، خَيرًا لَّنَا وَ شَرًّا لِّأَعْدَائِنَا"(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ اس خواب کی خیر تم کو عطا فرمائے اور اس کے شر سے تمہاری حفاظت فرمائے اور خدا کرے کہ یہ خواب تمہارے لیے اچھا ہو اور ہمارے دشمنوں کے لیے برا ہو۔

اس دعا میں حضورِ اقدس ﷺ نے ساری باتیں جمع فرما دیں، آپ حضرات بھی اس کا معمول بنا لیں کہ جب کوئی شخص آ کر اپنا خواب بیان کرے، تو اس کے لیے دعا کریں، اگر عربی میں یاد نہ ہو، تو اردو میں ہی کر لیں، یہ ہیں خواب کے آداب اور خواب کی حیثیت، بس ان باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے، لوگوں میں بہت سی فضولیات خواب کے بارے میں پھیلی ہوئی ہیں، ان سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے اور دین پر صحیح طریقے سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

---

(۱) المعجم الكبير للطبراني ۳۰۲/۸ (۸۱٤٦) ۔ودلائل النبوة للبيهقي ۳٦/۷۔ وذكره الحافظ في فتح الباري ٤۳۲/۱۲ وقال وسنده ضعيف جدا۔ وقال الهيثمي في مجمع الزوائد ۱۸۳/۷ (۱۱۷۷۲) رواه الطبراني وفيه سليمان بن عطاء القرشي وهو ضعيف۔
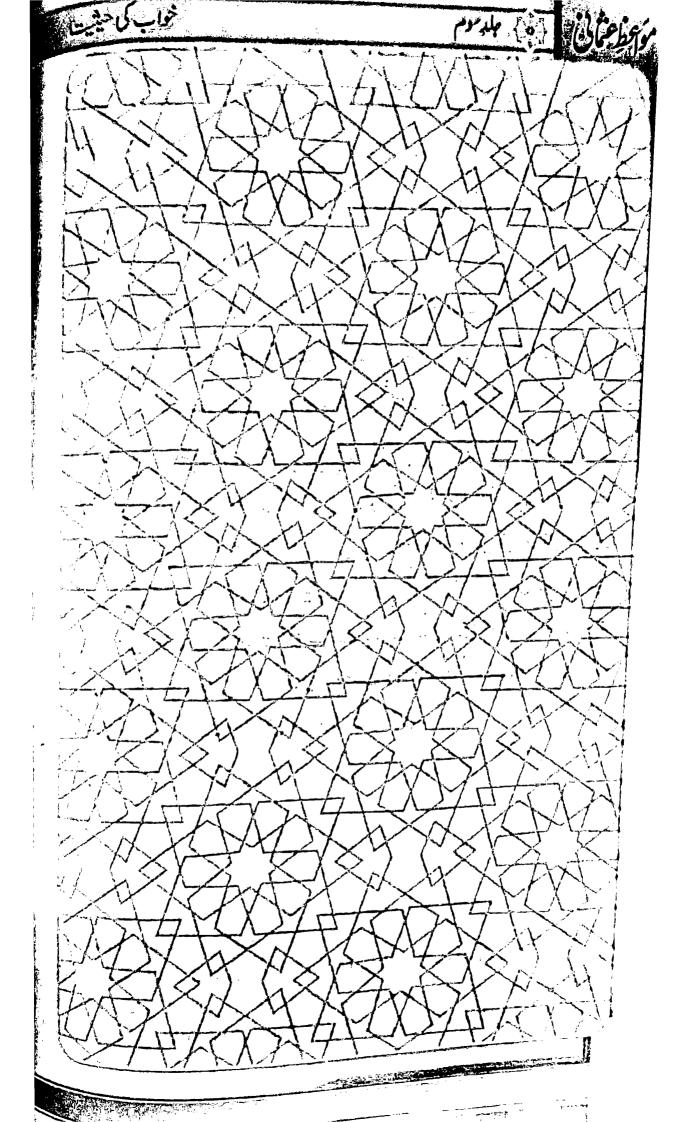
شادی بیاہ کی رسمیں

(ذکر و فکر ص ۲۶۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
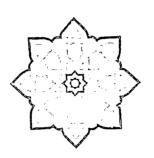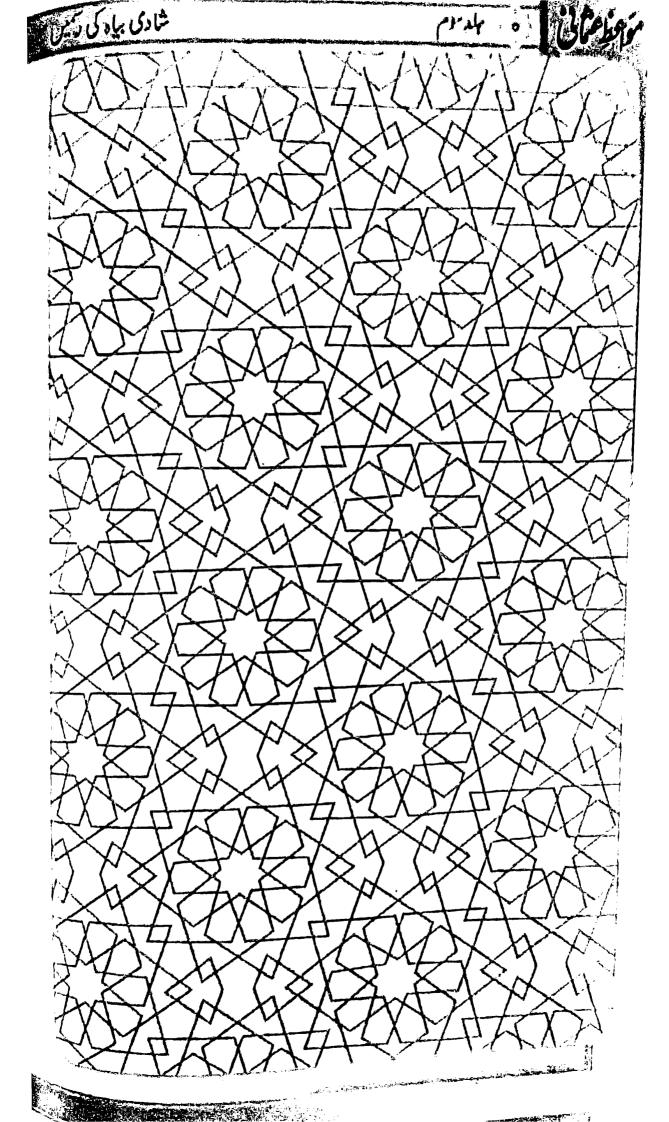
شادی بیاہ کی رسمیں
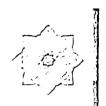
حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ان دس خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کی خوش خبری دی تھی[1] حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا، تو کپڑوں پر ایک پیلا نشان نظر آیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا یہ کیسا نشان ہے؟ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے ایک خاتون سے نکاح کیا ہے، (مطلب یہ تھا کہ نکاح کے موقع پر کپڑوں پر خوشبو لگائی تھی، اس کا یہ نشان باقی رہ گیا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں برکت کی دعا دی اور فرمایا کہ ولیمہ کرنا چاہے ایک بکری ہی کا ہو[2]۔

اندازہ لگائیے کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتنے قریبی صحابی ہیں کہ دس منتخب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہوتا ہے، لیکن انہوں نے نکاح کیا، تو نکاح کی مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کو دعوت دینے

(۱) مسند احمد ۱۷۴/۳ (۶۲۹) وسنن الترمذی ۱۰۰/۶ (۳۷۴۷) وقال ہذا اصح۔ وسنن ابن ماجہ ۱۰۷/۱ (۸۴) وصحیح ابن حبان ۴۶۳/۱۵ (۷۰۰۲)۔

(۲) صحیح البخاری ۵۲/۳ (۶۰۴۸)۔

کی ضرورت نہیں سمجھی، آپ ﷺ نے کپڑوں پر لگی ہوئی خوشبو کا نشان دیکھ کر سوال کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے نکاح کیا ہے، آنحضرت ﷺ نے بھی کوئی شکایت نہیں فرمائی کہ تم اکیلے اکیلے نکاح کر بیٹھے اور ہمیں پوچھا بھی نہیں، شکایت کے بجائے آپ ﷺ نے انہیں دعا دی، البتہ ساتھ ہی یہ ترغیب بھی دی کہ ولیمہ کریں۔

دراصل اسلام نے نکاح کو اتنا آسان اور اتنا سادہ بنایا کہ جب دونوں فریق راضی ہوں وہ کسی بے جا رکاوٹ کے بغیر یہ رشتہ قائم کرسکیں، شریعت نے یہ شرط بھی نہیں لگائی کہ کوئی قاضی یا عالم ہی نکاح پڑھائے، شریعت کی طرف سے شرط صرف اتنی ہے کہ نکاح کی مجلس میں دو گواہ موجود ہوں، اگر دولہا دلہن عاقل و بالغ ہوں تو ان میں سے کوئی دوسرے سے کہہ دے کہ میں نے تم سے نکاح کیا، دوسرا جواب دے دے کہ میں نے قبول کیا، بس نکاح ہوگیا،[1] نہ اس کے لیے کسی عدالت میں جانے کی ضرورت ہے نہ کسی تقریب کی کوئی شرط ہے، نہ دعوت ضروری ہے نہ جہیز لازمی ہے، ہاں دلہن کے اکرام کے لیے مہر ضروری ہے[2] اور صحیح طریقہ یہی ہے کہ مہر کا تعین نکاح ہی کے وقت کرلیا جائے، لیکن اگر بالفرض نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ آیا ہو، تب بھی نکاح ہوجاتا ہے اور مہرِ مثل لازم سمجھا جاتا ہے۔[3] نکاح کے وقت خطبہ بھی ایک سنت ہے اور حتی الامکان اس سنت کی برکات ضرور حاصل کرنی چاہیں، لیکن نکاح کی صحت اس پر موقوف نہیں، لہٰذا اگر خطبہ کے بغیر ایجاب و قبول کرلیا جائے تب

---

(۱) الهداية شرح البداية ۱/۱۸۵ طبع دار احياء التراث العربی۔

(۲) قال الله تعالى: "وآتوا النساء صدقاتهن نحلة" ۔سورة النساء آيت (٤)۔

(۳) ملاحظہ ہو الهداية ۲/۱۸ تا ۱۹ باب المهر۔

بھی نکاح صحیح ہوجاتا ہے، نکاح میں کوئی نقص نہیں آتا۔

ولیمہ، جس کی ترغیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا حدیث میں دی ہے، وہ بھی سنت ہے، لیکن اوّل تو وہ بھی ایسا فرض یا واجب نہیں کہ اس کے بغیر نکاح نہ ہوسکتا ہو، دوسرے اس کی کوئی مقدار شریعت نے مقرر نہیں کی، نہ مہمانوں کی کوئی تعداد لازمی قرار دی ہے، ہر شخص اپنی مالی استطاعت کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کرسکتا ہے اور اس کے لیے قرض ادھار کرنے کی بھی نہ صرف کوئی حاجت نہیں بلکہ ایسا کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے، کوئی شخص جتنے مختصر پیمانے پر ولیمہ کرسکتا ہے اتنے ہی مختصر پیمانے پر کرلے اور نہ کرسکے تب بھی اس سے نکاح میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔

اسلام نے نکاح کو اتنا آسان اس لیے کیا تھا کہ نکاح انسانی فطرت کا ایک ضروری تقاضا جائز طریقے سے پورا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اور اگر اس جائز ذریعے پر رکاوٹیں عائد کی جائیں یا اس کو مشکل بنایا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ بے راہ روی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، جب کوئی شخص اپنی فطری ضرورت پوری کرنے کے لیے جائز راستے بند پائے گا تو اس کے دل میں ناجائز راستوں کی طلب پیدا ہوگی اور اس طرح پورا معاشرہ بگاڑ کا شکار ہوگا۔

لیکن اسلام نے نکاح جتنا آسان بنایا تھا، ہمارے موجودہ معاشرتی ڈھانچے نے اسے اتنا ہی مشکل بنا ڈالا ہے، نکاح کے بابرکت معاہدے پر ہم نے لامتناہی رسموں، تقریبات اور فضول اخراجات کا ایسا بوجھ لاد رکھا ہے کہ ایک غریب، بلکہ متوسط آمدنی والے شخص کے لیے بھی وہ ایک ناقابلِ عبور پہاڑ بن کر رہ گیا ہے، کوئی شخص اس وقت تک نکاح کا تصور نہیں کرسکتا، جب تک اس کے پاس (گری سے گری حالت میں بھی) لاکھ دو لاکھ روپے موجود نہ ہوں، یہ

لاکھ دو لاکھ روپے کی حقیقی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے نہیں، بلکہ صرف فضول رسموں کا پیٹ بھرنے کے لیے درکار ہیں، جنہیں خرچ کرنے سے زندگی کی حقیقی ضروریات پوری کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

شریعت کی طرف سے نکاح کے موقع پر لے دے کر صرف ایک دعوت ولیمہ مسنون تھی، وہ بھی ہر شخص کی استطاعت کے مطابق، لیکن اب تقریبات اور دعوتوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا ہی جارہا ہے، منگنی کی تقریب ایک مستقل شادی کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے اور عین نکاح کے موقع پر مہندی، ابٹن سے لے کر چوتھی بہوڑے تک تقریباً ہر روز کسی نہ کسی تقریب کا اہتمام لازمی سمجھ لیا گیا ہے، جس کے بغیر شادی بیاہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ پھر تقریبات میں بھی زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ نت نئے اخراجات کا اضافہ ہورہا ہے، نئے نئے مطالبے سامنے آرہے ہیں، نئی نئی رسمیں وجود میں آرہی ہیں، غرض فضولیات کا ایک طومار ہے جس نے شادی کو خاص طور سے غریب اور متوسط آدمی کے لیے ایک ایسی ذمے داری میں تبدیل کردیا ہے جو عام طور پر صرف حلال آمدنی سے پوری نہیں ہوسکتی، لہٰذا اسے پورا کرنے کے لیے کہیں نہ کہیں ناجائز ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اس طرح نکاح کا یہ کارِ خیر نہ جانے کتنی بدعنوانیوں اور کتنے گناہوں کا ملغوبہ بن کر رہ جاتا ہے اور جس نکاح کا آغاز ہی بدعنوانی یا گناہ سے ہو اس میں خیر و برکت کہاں سے آئے گی؟

خوشی کے مواقع پر اعتدال کے ساتھ خوشی منانے پر شریعت نے کوئی پابندی نہیں لگائی، لیکن خوشی منانے کے نام پر ہم نے اپنے آپ کو جن بے شمار رسموں میں جکڑ لیا ہے، ان کا نتیجہ یہ ہے کہ خوشی، جو دل کی فرحت کا نام تھا،

پیچھے چلی گئی ہے اور رسموں کے لگے بندھے قواعد آگے آگئے ہیں، جن کی ذرا خلاف ورزی ہو تو شکوے شکایتوں اور طعن و تشنیع کا طوفان کھڑا ہو جاتا ہے، لہٰذا شادی کی تقریبات رسموں کی خانہ پری کی نذر ہو جاتی ہیں، جس میں پیسہ تو پانی کی طرح بہتا ہی ہے، دل و دماغ ہر وقت رسمی قواعد کے بوجھ تلے دبے رہتے ہیں، شادی کے انتظامات کرنے والے تھک کر چور ہو جاتے ہیں، پھر بھی کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی شکایت کا سامان پیدا ہو ہی جاتا ہے، جس کے نتیجے میں بعض اوقات لڑائی جھگڑوں تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

زبان سے اس صورتِ حال کو ہم سب قابل اصلاح سمجھتے ہیں، لیکن جب عمل کی نوبت آتی ہے، تو عموماً پرنالہ وہیں گرتا ہے اور ایک ایک کر کے ہم تمام رسموں کے آگے ہتھیار ڈالتے چلے جاتے ہیں۔

اس صورتِ حال کا کوئی حل اس کے سوا نہیں ہے کہ اول تو با اثر اور خوش حال لوگ بھی اپنی شادیوں کی تقریبات میں حتی الامکان سادگی اختیار کریں اور ہمت کر کے ان رسموں کو توڑیں جنہوں نے شادی کو ایک عذاب بنا کر رکھ دیا ہے، دوسرے اگر دولت مند افراد اس طریق کار کو نہیں چھوڑتے، تو کم از کم محدود آمدنی والے افراد یہ طے کرلیں کہ وہ دولت مندوں کی حرص میں اپنا پیسہ اور توانائیاں ضائع کرنے کے بجائے اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلائیں گے اور اپنی استطاعت کی حدود سے آگے نہیں بڑھیں گے۔

اس سلسلے میں اگر ہم مندرجہ ذیل باتوں کا خاص طور پر اہتمام کرلیں تو امید ہے کہ مذکورہ بالا خرابیوں میں ان شاء اللہ نمایاں کمی واقع ہوگی۔

(۱) خاص نکاح اور ولیمہ کی تقریبات کے علاوہ جو تقریبات منگنی، مہندی، ابٹن اور چوتھی وغیرہ کے نام سے رواج پا گئی ہیں، ان کو یکسر ختم کیا جائے اور یہ طے کر لیا جائے کہ ہماری شادیوں میں یہ تقریبات نہیں ہوں گی، فریقین اگر واقعی محبت اور خوش دلی سے ایک دوسرے کو تحفہ دینا یا بھیجنا چاہتے ہیں، وہ کسی باقاعدہ تقریب اور لاؤ لشکر کے بغیر سادگی سے پیش کر دیں گے۔

(۲) اظہارِ مسرت کے کسی بھی مخصوص طریقے کو لازمی اور ضروری نہ سمجھا جائے، بلکہ ہر شخص اپنے حالات اور وسائل کے مطابق بے تکلفی سے جو طرزِ عمل اختیار کرنا چاہے کر لے، نہ وہ خود کسی حرص کا شکار یا رسموں کا پابند ہو، نہ دوسرے اسے مطعون کریں۔

(۳) نکاح اور ولیمے کی تقریبات بھی حتی الامکان سادگی سے اپنے وسائل کی حد میں رہتے ہوئے منعقد کی جائیں اور صاحبِ تقریب کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنے خاندانی یا مالی حالات کے مطابق جسے چاہے دعوت دے اور جس کو چاہے دعوت نہ دے، اس معاملے میں بھی کسی کو کوئی سنجیدہ شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

(۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہمیشہ ہمارے سامنے رہے کہ

"سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں زیر باری

کم سے کم ہو"(۱)

یعنی جس میں انسان نہ مالی طور پر زیرِ بار ہو اور نہ بے جا مشقت ومحنت کے کسی بوجھ میں مبتلا ہو۔

۱۹ / جمادی الاولی ۱۴۱۶ھ
۱۵ / اکتوبر ۱۹۹۵ء

(۱) سنن ابی داود ۲۳۸/۲ (۲۱۱۷) وصحیح ابن حبان ۳۸۱/۹ (۴۰۷۲) کلاہما من حدیث عقبة بن عامر مطولا وفیه "خیر النکاح ایسره". مسند احمد ۷۵/۴۱ (۲۴۵۲۹) والمستدرک للحاکم ۱۹۴/۲ (۲۷۳۲) کلاهما من حدیث عائشة بلفظ "ان اعظم النکاح برکة ایسرها مؤنة". وقال هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه ووافقه الذهبی فی "التلخیص"۔
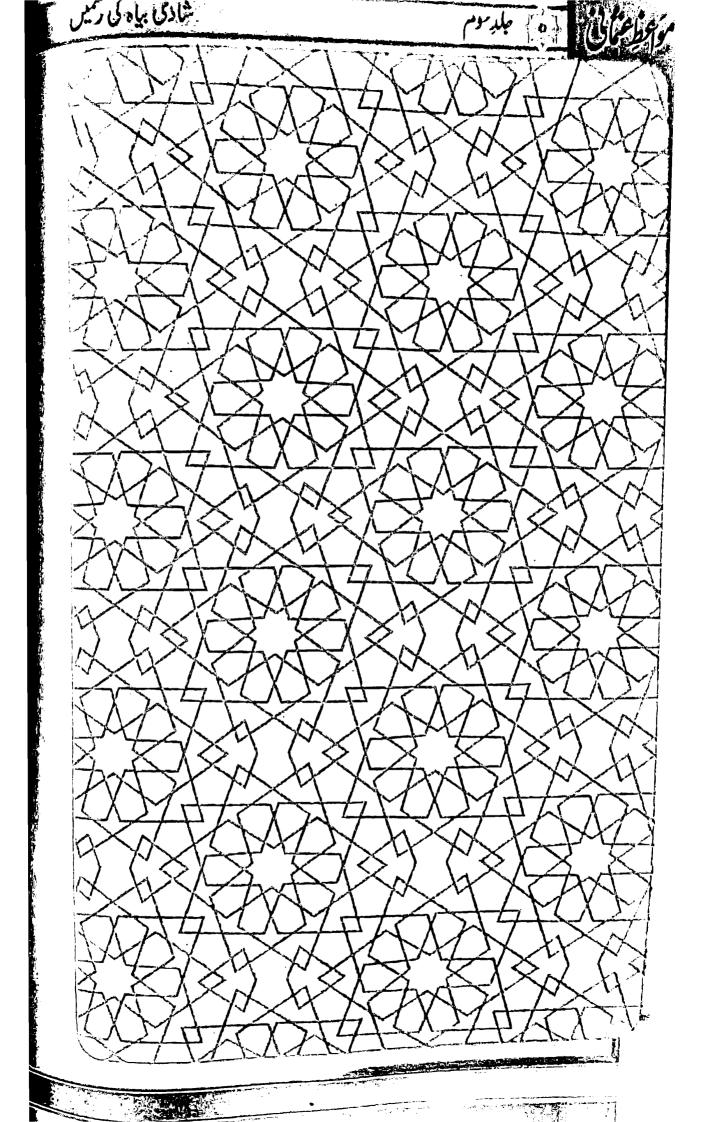
مہرِ شرعی کی حقیقت

(ذکر و فکر ص ۲۷۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم
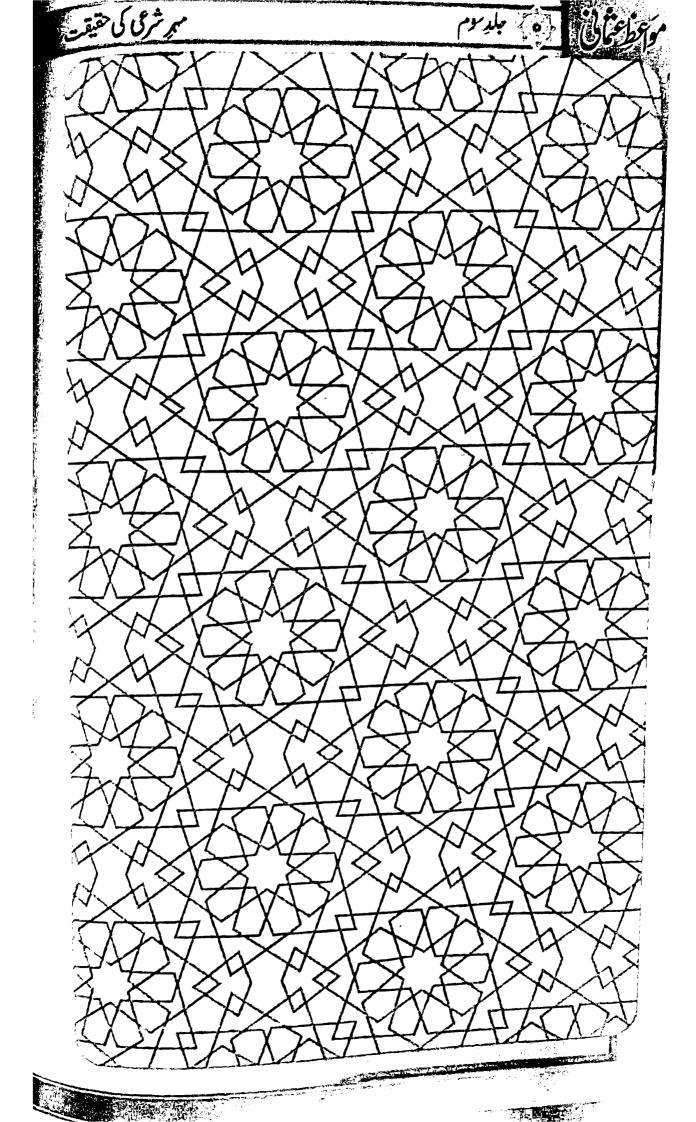
مہرِ شرعی کی حقیقت

پچھلے دنوں ایک نکاح نامہ میری نظر سے گزرا جس میں ''مہر'' کے خانے میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی، ''مبلغ بتیس روپیہ مہر شرعی'' اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ لوگوں سے بات چیت کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ وہ خدا جانے کس وجہ سے بتیس روپے کو مہرِ شرعی سمجھتے ہیں اور یہ تاثر تو بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے کہ مہر جتنا کم سے کم رکھا جائے، شریعت کی نگاہ میں اتنا ہی مستحسن ہے، اس کے علاوہ بھی مہر کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں، جن کا ازالہ ضروری ہے۔

''مہر'' دراصل ایک اعزازیہ (Hounorarium) ہے[1] جو ایک شوہر اپنی بیوی کو پیش کرتا ہے اور اس کا مقصد عورت کا اعزاز و اکرام ہے، نہ تو یہ عورت کی قیمت ہے جسے ادا کر کے یہ سمجھا جائے کہ وہ شوہر کے ہاتھوں بِک گئی اور اب اس کی حیثیت ایک کنیز کی ہے اور نہ یہ محض ایک ضمنی کارروائی ہے جس کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ اسے عملاً ادا کرنے کی ضرورت نہیں، شوہر کے ذمہ بیوی کا مہر لازم کرنے سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی شخص بیوی کو

---

(۱) الہدایۃ ۱/۱۹۸ و فتح القدیر لابن الہمام ۳/۳۱۶ باب المہر۔

اپنے گھر میں لائے، تو اس کا مناسب اکرام کرے اور اسے ایک ایسا ہدیہ پیش کرے جو اس کے اعزاز و اکرام کے مناسب ہو، لہٰذا شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ مہر کی رقم نہ تو اتنی کم رکھی جائے جس میں اعزاز و اکرام کا یہ پہلو بالکل مفقود ہو اور نہ اتنی زیادہ رکھی جائے کہ شوہر اس کے ادا کرنے پر قادر نہ ہو اور بالآخر یا تو مہر ادا کیے بغیر دنیا سے رخصت ہو جائے یا آخر میں بیوی سے معاف کرانے پر مجبور ہو۔

شرعی نقطۂ نظر سے ہر عورت کا اصل حق یہ ہے کہ اسے ''مہرِ مثل'' ادا کیا جائے، ''مہرِ مثل'' کا مطلب مہر کی وہ مقدار ہے جو اس عورت کے خاندان میں عام طور سے اس جیسی خواتین کے نکاح کے وقت مقرر کی جاتی رہی ہو اور اگر اس عورت کے خاندان میں دوسری عورتیں نہ ہوں تو خاندان سے باہر اس کے ہم پلہ خواتین کا جو مہر عام طور سے مقرر کیا جاتا ہو وہ اس عورت کا مہر مثل ہے اور شرعی اعتبار سے بیوی مہر مثل وصول کرنے کی حق دار ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت باہمی رضامندی سے مہر کا تعین نہ کیا گیا ہو، یا مہر کا ذکر کیے بغیر نکاح کرلیا گیا ہو، تو مہرِ مثل خود بخود لازم سمجھا جاتا ہے اور شوہر کے ذمہ شرعاً ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بیوی کو اس کا مہرِ مثل ادا کرے [1]، البتہ اگر بیوی خود مہر مثل سے کم پر خوش دلی سے راضی ہو جائے یا شوہر خوش دلی سے مہرِ مثل سے زیادہ مہر کی حد مقرر کرلے، تو باہمی رضامندی سے مہر مثل سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرلینا بھی شرعاً جائز ہے، لیکن یہاں بھی شریعت نے زیادہ سے زیادہ مہر کی تو کوئی حد مقرر نہیں کی، البتہ کم سے کم مہر کی حد مقرر کردی ہے اور وہ حد (حنفی

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ۱۳۷/۳ مطلب فی بیان مہر المثل۔

موقف کے مطابق) دس درہم ہے[1]، دس درہم کا مطلب دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے جو آج کل کی قیمتوں کے لحاظ سے دو سو روپے کے لگ بھگ بنتی ہے، اس کم سے کم مقدار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اتنا مہر رکھنا شرعاً پسندیدہ ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سے کم مہر پر اگر خود عورت بھی راضی ہوجائے تو شریعت راضی نہیں ہے، کیونکہ اس سے مہر کا مقصد یعنی عورت کا اعزاز و اکرام پورا نہیں ہوتا، یہ کم سے کم حد بھی ان لوگوں کا خیال کر کے رکھی گئی ہے، جو مالی اعتبار سے کمزور ہیں اور زیادہ رقم خرچ کرنے کے متحمل نہیں، ان کے لیے یہ گنجائش پیدا کردی گئی ہے کہ اگر عورت راضی ہو تو کم از کم اس مقدار پر نکاح ہوسکتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب لینا کسی طرح درست نہیں ہے کہ شریعت کو منظور ہی یہ ہے کہ مہر کی مقدار دو سو روپے رکھی جائے اور اسے اس معنی میں مہر شرعی قرار دیا جائے، جن لوگوں نے آج کے دور میں بتیس روپیہ مہر باندھ کر اسے مہر شرعی قرار دیا، انہوں نے دو غلطیاں کیں، ایک غلطی، تو یہ کی کہ دس درہم کی قیمت کسی زمانے بتیس روپیہ رہی ہوگی، انہوں نے اسے ہمیشہ کے لیے بتیس روپیہ سمجھ لیا، دوسری غلطی یہ کی کہ شریعت نے مہر کی جو کم سے کم مقدار مقرر کی تھی، اس کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ شرعاً پسندیدہ ہی یہ ہے کہ اس سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، حالانکہ یہ تصور قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی

---

(۱) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۱۳۶/۲ باب المهر- طبع المطبعة الكبرى الاميرية بولاق القاهره.

صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا مہر پانچ سو درہم مقرر فرمایا تھا، جو ۱۳۱ تولہ تین ماشہ چاندی کے برابر ہوتا ہے اور آج کل کے لحاظ سے اس کی قیمت دس ہزار روپیہ کے قریب بنتی ہے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی متعدد ازواج مطہرات کا مہر بھی اس کے قریب قریب ہی مقرر فرمایا[1]، جو اوسط درجے کے لحاظ سے ایک قابلِ لحاظ مقدار ہے۔

بعض حضرات اس مہرِ فاطمی ہی کو مہر شرعی کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور غالباً ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شرعی اعتبار سے اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنا پسندیدہ نہیں، یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر فریقین مہرِ فاطمی کے برابر مہر مقرر کریں اور نیت یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقرر کی ہوئی مقدار بابرکت اور معتدل ہوگی، نیز یہ کہ اس سے اتباعِ سنت کا اجر ملنے کی توقع ہے، تو یقیناً یہ جذبہ بہت مبارک اور مستحسن ہے، لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہ مقدار اس معنی میں مہرِ شرعی ہے کہ اس سے زیادہ یا کم مقرر کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

ہاں یہ اصول مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ مہر اتنا ہو جس سے بیوی کا اعزاز و اکرام بھی ہو اور وہ شوہر کی استطاعت سے باہر بھی نہ ہو، جن بزرگوں نے بہت زیادہ مہر باندھنے سے منع کیا ان کا مقصد یہی تھا کہ اگر استطاعت سے زیادہ مہر

---

(۱) سنن الترمذی ۴۰۷/۲ (۱۱۱۴) وقال هذا حديث حسن صحيح - وسنن ابی داود ۲۲۵/۲ (۲۱۰۶)۔

مقرر کرلیا جائے تو وہ محض ایک کاغذی کاروائی ہو کر رہ جاتی ہے، حقیقت میں اسے دینے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی اور مہر ادا نہ کرنے کا گناہ شوہر کی گردن پہ رہ جاتا ہے، دوسرے بعض اوقات بہت زیادہ مہر مقرر کرنے کے پیچھے دکھاوے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے اور لوگ محض اپنی شان وشوکت کے اظہار کے لیے غیر معمولی مہر مقرر کر لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہیں، اس لیے متعدد بزرگوں نے غیر معمولی مہر مقرر کرنے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک مرتبہ تقریر کے دوران لوگوں سے کہا کہ وہ نکاح میں بہت زیادہ مہر نہ باندھا کریں اس پر ایک خاتون نے اعتراض کیا کہ قرآنِ کریم نے ایک جگہ مہر کے لیے ''قنطار'' (سونے چاندی کا ڈھیر) کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ چاندی کا ڈھیر بھی مہر ہوسکتا ہے، پھر آپ زیادہ مہر مقرر کرنے سے کیوں روکتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خاتون کی بات سن کر فرمایا کہ واقعی خاتون کا استدلال درست ہے اور زیادہ مہر باندھنے سے کلی طور پر منع کرنا درست نہیں۔ (۱)

مطلب یہی تھا کہ اگر دکھاوا مقصود نہ ہو، ادائیگی کی نیت بھی ہو اور استطاعت بھی، تو زیادہ مہر مقرر کرنا بھی جائز ہے، البتہ ان میں سے کوئی بات

---

(۱) مصنف عبد الرزاق ١٨٠/٦ (١٠٤٢٠) باب غلاء الصداق۔ طبع المكتب الاسلامی۔ وسنن سعيد بن منصور ١٩٥/١ (٥٩٨) طبع الدار السلفية۔ وشرح مشكل الآثار للطحاوی ٥٧/١٣ (٥٠٥٩) طبع الرسالة.

مفقود ہو تو ناجائز۔

جب مہر کا ذکر چل نکلا، تو ایک اور نکتے کی وضاحت بھی ہو جائے، مہر کی دو قسمیں مشہور ہیں، ''مہرِ معجّل'' اور ''مہرِ مؤجّل''، یہ الفاظ چونکہ نکاح کی مجلس میں سنائی دیتے ہیں اس لیے بہت سے لوگوں کو ان کا مطلب معلوم نہیں ہوتا، شرعی اعتبار سے ''مہرِ معجّل'' اس مہر کو کہتے ہیں جو نکاح ہوتے ہی شوہر کے ذمے لازم ہو جاتا ہے اور یہ اس کا فریضہ ہے کہ یا تو نکاح کے وقت ہی بیوی کو ادا کر دے یا اس کے بعد جتنی جلد ممکن ہو، عورت کو بھی ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اس کا مطالبہ کر لے، چونکہ ہمارے معاشرے میں خواتین عام طور سے مطالبہ نہیں کرتیں، اس لیے اسے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کی ادائیگی ہمارے لیے ضروری نہیں، بلکہ شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ عورت کے مطالبے کا انتظار کیے بغیر بھی جس قدر جلد ممکن ہو اس فرض سے سبکدوش ہو جائے۔

''مہرِ مؤجّل'' اس مہر کو کہا جاتا ہے جس کی ادائیگی کے لیے فریقین نے آئندہ کی کوئی تاریخ متعین کر لی ہو، جو تاریخ اس طرح متعین کر لی جائے، اس سے پہلے اس کی ادائیگی شوہر کے ذمے لازم نہیں ہوتی، نہ بیوی اس سے پہلے مطالبہ کر سکتی ہے، لہٰذا مہر کے مؤجّل ہونے کا اصل مطلب تو یہی ہے کہ اس کی ادائیگی کے لیے کوئی تاریخ نکاح کے وقت ہی مقرر کر لی جائے، لیکن ہمارے معاشرے میں عام طور سے کوئی تاریخ مقرر کیے بغیر صرف کہہ دیا جاتا ہے کہ اتنا مہرِ مؤجّل ہے اور ہمارے معاشرے کے رواج کے مطابق اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مہر کی یہ مقدار اس وقت واجب الادا ہوگی جب نکاح ختم ہوگا،

چنانچہ اگر طلاق ہوجائے تب مہر مؤجل کی ادائیگی لازم ہوگی یا میاں بیوی میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تب اس کی ادائیگی لازم سمجھی جاتی ہے۔

ایک اور نکتہ یہ قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے معاشرے میں شوہر کی طرف سے دلہن کو جو زیور چڑھایا جاتا ہے اس کا بذاتِ خود مہر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ہمارے معاشرے کے رواج کے مطابق یہ زیور دلہن کی ملکیت نہیں ہوتا، بلکہ اسے عارضی استعمال کے لیے دیا جاتا ہے، چنانچہ بیوی اسے شوہر کی اجازت کے بغیر نہ فروخت کرسکتی ہے نہ کسی کو تحفے میں دے سکتی ہے، نہ کسی اور کام میں لگا سکتی ہے، نیز یہی وجہ ہے کہ اگر خدانخواستہ طلاق کی نوبت آجائے تو شوہر یہ زیور واپس لے لیتا ہے، لہٰذا اس زیور سے مہر ادا نہیں ہوتا، ہاں اگر شوہر بیوی سے صراحتاً یہ کہہ دے کہ یہ زیور میں نے بطورِ مہر تمہاری ملکیت میں دے دیا، تو پھر اسے مہر میں شمار کرسکتے ہیں، اس صورت میں بیوی اس زیور کی مالک بن کر اس میں ہر طرح کا تصرف کرسکتی ہے اور اسے کسی بھی حالت میں اس سے واپس نہیں لیا جاسکتا۔

بہرصورت! یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ مہر کا تعین محض ایک فرضی یا رسمی کارروائی نہیں ہے، جو سوچے سمجھے بغیر کرلی جائے، بلکہ یہ ایک دینی فریضہ ہے جو پوری سنجیدگی کا متقاضی ہے، یہ ایک معاملے کی بات ہے، شرعاً اس کے تمام پہلو صاف اور واضح ہونے چاہییں اور اس کی معاملے کے مطابق ادائیگی کی فکر کرنی چاہیے، یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ اس حق کی ادائیگی سے ساری عمر

بے فکر رہنے کے بعد بسترِ مرگ پر بیوی سے اس کی معافی حاصل کر لی جائے، جب ماحول کے جبر سے اس کے پاس معاف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے[1]۔

۱۸/ جمادی الثانی ۱۴۱۶ھ

۱۲/ نومبر ۱۹۹۵ء

(۱) حضرت والا دامت برکاتہم کا مذکورہ مضمون روزنامہ جنگ (لندن ایڈیشن) میں شائع ہوا جس پر حضرت مولانا عتیق الرحمن صاحب سنبھلی مدظلہم نے حضرت والا دامت برکاتہم سے چند استفسارات فرمائے ہیں جو حضرت والا دامت برکاتہم کے تفصیلی جواب کے ساتھ فتاوی عثمانی کی جلد دوم ص ۲۹۸ پر شائع ہوا ہے۔ اس کی مراجعت قارئین کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ۔ مرتب

کچھ جہیز کے بارے میں

(ذکر و فکر ص ۲۸۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم
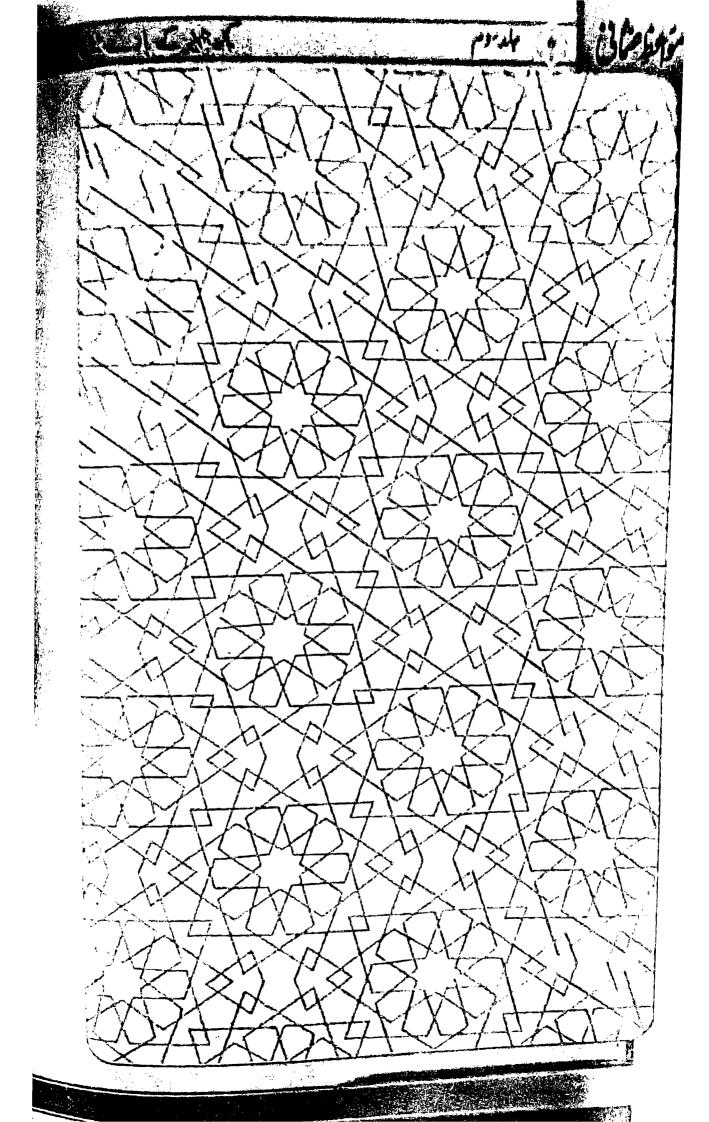
کچھ جہیز کے بارے میں

چند سال پہلے شام کے ایک بزرگ شیخ عبد الفتاح ہمارے یہاں تشریف لائے ہوئے تھے، اتفاق سے ایک مقامی دوست بھی اسی وقت آگئے اور جب انہوں نے ایک عرب بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا، تو ان سے دعا کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ میری دو بیٹیاں شادی کے لائق ہیں دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ان کی شادی کے اسباب پیدا فرمادے۔ شیخ نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ رشتہ تو دونوں کا ہوچکا ہے، لیکن میرے پاس اتنے مالی وسائل نہیں ہیں کہ ان کی شادی کرسکوں، شیخ نے یہ سن کر انتہائی حیرت سے پوچھا کہ وہ آپ کے لڑکے ہیں یا لڑکیاں؟ کہنے لگے کہ لڑکیاں ہیں، شیخ نے سراپا تعجب بن کر کہا لڑکیوں کی شادی کے لیے مالی وسائل کی کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے کہا میرے پاس انہیں جہیز میں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، شیخ نے پوچھا جہیز کیا ہوتا ہے؟ اس پر حاضرین مجلس نے انہیں بتایا کہ ہمارے ملک میں یہ رواج ہے کہ باپ شادی کے وقت اپنی بیٹی کو زیورات، کپڑے، گھر کا اثاثہ اور بہت سا سازوسامان دیتا ہے، اسے

جہیز کہتے ہیں اور جہیز دینا باپ کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے، جس کے بغیر لڑکی کی شادی کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور لڑکی کی سسرال والے بھی اس کا مطالبہ کرتے ہیں، شیخ نے یہ تفصیل سنی، تو وہ سر پکڑ بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ کیا بیٹی کی شادی کرنا کوئی جرم ہے جس کی یہ سزا باپ کو دی جائے؟ پھر انہوں نے بتایا کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی کوئی رسم نہیں، اکثر جگہوں پر تو یہ لڑکے کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے کہ اپنے گھر میں دلہن کو لانے سے پہلے گھر کا اثاثہ اور دلہن کی ضروریات فراہم کرکے رکھے، لڑکی کے باپ کو کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا اور بعض جگہوں پر رواج ہے کہ لڑکی کی ضروریات کو مدّنظر رکھتے ہوئے سامان باپ ہی خریدتا ہے، لیکن اس کی قیمت لڑکا ادا کرتا ہے، البتہ باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت کوئی مختصر تحفہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے، لیکن وہ بھی کچھ ایسا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

اس واقعے سے کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے، ہمارے معاشرے میں جہیز کو جس طرح بیٹی کی شادی کا ایک ناگزیر حصہ قرار دے لیا گیا ہے، اس کے بارے میں عالمِ اسلام کے دوسرے علاقوں میں کیا نقطہ نظر ہے؟

جیسا کہ شیخ کے حوالے سے پیچھے بیان کیا گیا، شرعی اعتبار سے بھی جہیز کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر کوئی باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اسے کوئی تحفہ اپنی استطاعت کے مطابق دینا چاہے، تو دے دے، اور ظاہر ہے کہ تحفہ دیتے وقت لڑکی کی آئندہ ضروریات کو مدنظر رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے، لیکن نہ وہ شادی کے لیے کوئی لازمی شرط ہے نہ سسرال والوں کو کوئی حق پہنچتا ہے کہ اس کا مطالبہ کریں، اگر کسی لڑکی کو جہیز نہ دیا جائے یا کم دیا جائے تو اس پر برا منائیں یا لڑکی کو مطعون کریں اور نہ یہ کوئی دکھاوے کی چیز ہے کہ شادی کے

موقع پر اس کی نمائش کر کے اپنی شان و شوکت کا اظہار کیا جائے، اس سلسلے میں ہمارے معاشرے میں جو غلط تصورات پھیلے ہوئے ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں :

(۱) جہیز کو لڑکی کی شادی کے لیے ایک لازمی شرط سمجھا جاتا ہے، چنانچہ جب تک جہیز دینے کے لیے پیسے نہ ہوں لڑکی کی شادی نہیں کی جاتی، ہمارے معاشرے میں نہ جانے کتنی لڑکیاں اسی وجہ سے بن بیاہی رہتی ہیں کہ باپ کے پاس انہیں دینے کے لیے جہیز نہیں ہوتا اور جب شادی سر پر آہی جائے، تو جہیز کی شرط پوری کرنے کے لیے باپ کو بعض اوقات روپیہ حاصل کرنے کے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں اور وہ رشوت، جعلسازی، دھوکہ، فریب اور خیانت جیسے جرائم کے ارتکاب پر آمادہ ہوجاتا ہے اور اگر کوئی باپ اتنا باضمیر ہے کہ ان ناجائز ذرائع کو استعمال نہیں کرنا چاہتا، تو کم از کم اپنے آپ کو قرض اور ادھار کے شکنجے میں جکڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔

(۲) جہیز کی مقدار اور اس کے لیے لازمی اشیاء کی فہرست میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے، اب جہیز محض ایک بیٹی کے لیے باپ کا تحفہ نہیں ہے جو وہ اپنی خوش دلی سے، اپنی استطاعت کی حد میں رہ کر دے، بلکہ معاشرے کا ایک جبر ہے، چنانچہ اس میں صرف بیٹی کی ضروریات ہی داخل نہیں، بلکہ اس کے شوہر کی ضروریات پوری کرنا اور اس کے گھر کو مزین کرنا بھی ایک لازمی حصہ ہے، خواہ لڑکی کے باپ کا دل چاہے یا نہ چاہے، اسے یہ تمام لوازم

پورے کرنے پڑتے ہیں۔

(۳) بات صرف اتنی نہیں ہے کہ لڑکی کی ضروریات پوری کر کے اس کا دل خوش کیا جائے، بلکہ جہیز کی نمائش کی رسم نے یہ بھی ضروری قرار دے دیا ہے کہ جہیز ایسا ہو جو ہر دیکھنے والے کو خوش کر سکے اور ان کی تعریف حاصل کر سکے۔

(۴) جہیز کے سلسلے میں سب سے گھٹیا بات یہ ہے کہ لڑکی کا شوہر یا اس کے سسرال کے لوگ جہیز پر نظر رکھتے ہیں، بعض جگہ تو شاندار جہیز کا مطالبہ پوری ڈھٹائی سے کیا جاتا ہے اور بعض جگہ اگر صریح مطالبہ نہ ہو تب بھی توقعات یہ باندھی جاتی ہیں کہ دلہن اچھا سا جہیز لے کر آئے گی اور اگر یہ توقعات پوری نہ ہوں، تو لڑکی کو طعنے دے دے کر اس کے ناک میں دم کر دیا جاتا ہے۔

جہیز کے ساتھ اس قسم کی جو رسمیں اور تصورات نتھی کر دیئے گئے ہیں اور ان کی وجہ سے جو معاشرتی خرابیاں جنم لیتی رہی ہیں، ان کا احساس ہمارے معاشرے کے اہلِ فکر میں مفقود نہیں، اس موضوع پر کچھ لکھا بھی گیا ہے بعض تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں، بلکہ سرکاری سطح پر بعض قوانین بھی بنائے گئے ہیں اور ان کوششوں کا اثر بحمد اللہ ضرور ہوا ہے کہ اب جہیز کے بارے میں لوگوں کے بہت سے تصورات میں تبدیلی آئی ہے، جہیز کی نمائش کا سلسلہ کم ہوا ہے، بین الممالک شادیوں میں جہیز کی پابندی حالات کے جبر نے ترک کرادی ہے، لیکن ابھی تک معاشرے کے ایک بڑے حصے میں ان غلط تصورات کی حکمرانی ختم نہیں ہوئی۔

بعض حضرات یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ جہیز کو قانوناً بالکل ممنوع قرار دے دیا جائے، لیکن دراصل یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے اور اس قسم کے مسائل صرف قانون کی جکڑ بند سے حل نہیں ہوتے اور نہ ایسے قوانین پر عمل کرنا ممکن ہوتا ہے، اس کے لیے تعلیم و تربیت اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک مناسب ذہنی فضاء تیار کرنی ضروری ہے، بذاتِ خود اس بات میں کوئی شرعی یا اخلاقی خرابی بھی نہیں ہے کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اپنے دل کے تقاضے سے اسے ایسی چیزوں کا تحفہ پیش کرے جو اس کے لیے آئندہ زندگی میں کارآمد ہوں، خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سادگی کے ساتھ کچھ جہیز عطا فرمایا تھا[1] شرعی اعتبار سے اس قسم کے جہیز کے لیے کوئی مقدار بھی مقرر نہیں ہے، اگر دوسرے مفاسد نہ ہوں تو باپ اپنے دلی تقاضے کے تحت جو کچھ دینا چاہے دے سکتا ہے، لیکن خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ اول تو اسے نمود و نمائش کا ذریعہ بنایا جاتا ہے اور دوسرے لڑکے والے عملاً اسے اپنا حق سمجھتے ہیں زیادہ سے زیادہ جہیز کی امیدیں باندھتے ہیں اور انتہائی گھٹیا بات یہ ہے کہ اس کی کمی کی وجہ سے لڑکی اور اس کے گھر والوں کو مطعون کرتے ہیں، جہیز کی ان خرابیوں کو ختم کرنے کے لیے معاشرے کے تمام طبقات کو ان تصورات کے خلاف جہاد کرنا پڑے گا، تعلیم و تربیت، ذرائعِ ابلاغ اور وعظ و نصیحت کے ذریعے ان تصورات کی قباحتیں مختلف انداز و اسلوب سے متواتر بیان کرنے اور کرتے رہنے کی ضرورت ہے، یہاں تک کہ یہ گھٹیا باتیں

---

(۱) ملاحظہ ہو سنن النسائی ۱۳۵/۶ کتاب النکاح/باب جهاز الرجل ابنته-طبع مکتب المطبوعات الاسلامية-وسنن ابن ماجه ۵۸۵/۵ (۴۱۵۲) وصحيح ابن حبان ۳۹۸/۱۵ (۶۹۴۷)۔

ہر کس و ناکس کی نظر میں ایک ایسا عیب بن جائیں جس کی اپنی طرف نسبت سے لوگ شرمانے لگیں، کسی بھی معاشرے میں پھیلے ہوئے غلط تصورات یا بری عادتیں اسی طرح رفتہ رفتہ دور ہوتی ہیں کہ اس معاشرے کے اہلِ اقتدار، اہلِ علم و دانش اور دوسرے بارسوخ طبقے مل جل کر ایک ذہنی فضا تیار کرتے ہیں، یہ ذہنی فضا رفتہ رفتہ فروغ پاتی ہے اور لوگوں کی تربیت کرتی ہے، لیکن اس کے لیے دردمند دل اور انتھک جدو جہد درکار ہے، افسوس ہے کہ ہمارے ان طبقوں کے بیشتر افراد کچھ ایسے مسائل میں الجھ گئے ہیں کہ معاشرے کی اصلاح و تربیت کا کام، جو کسی بھی قوم کی تعمیر کے لیے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، کسی شمار قطار میں نظر نہیں آتا، ذہنی تربیت اور کردار سازی کا کام سیاست اور فرقہ واریت کی ہاؤ ہُو میں ایسا گم ہوا ہے کہ اب اس کا نام بھی ایک مذاق معلوم ہونے لگا ہے لیکن اس صورتِ حال میں مایوس ہو کر بیٹھ جانا بھی درست نہیں، ایک داعیٔ حق کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی بات کہنے سے نہ اکتائے، اپنے دائرے کی حد تک کام کرنے سے نہ تھکے۔ بالآخر ایک وقت آتا ہے جب حق و صداقت کی کشش دوسروں کو بھی اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیتی ہے اور قوموں کی نہ صرف سوچ میں، بلکہ عمل میں بھی انقلاب آجاتا ہے۔

۲۵ / جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ

۱۶ / نومبر ۱۹۹۵ء
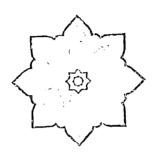
شادی کی دعوت اور بارات

(ذکر و فکر ص ۲۸۷)
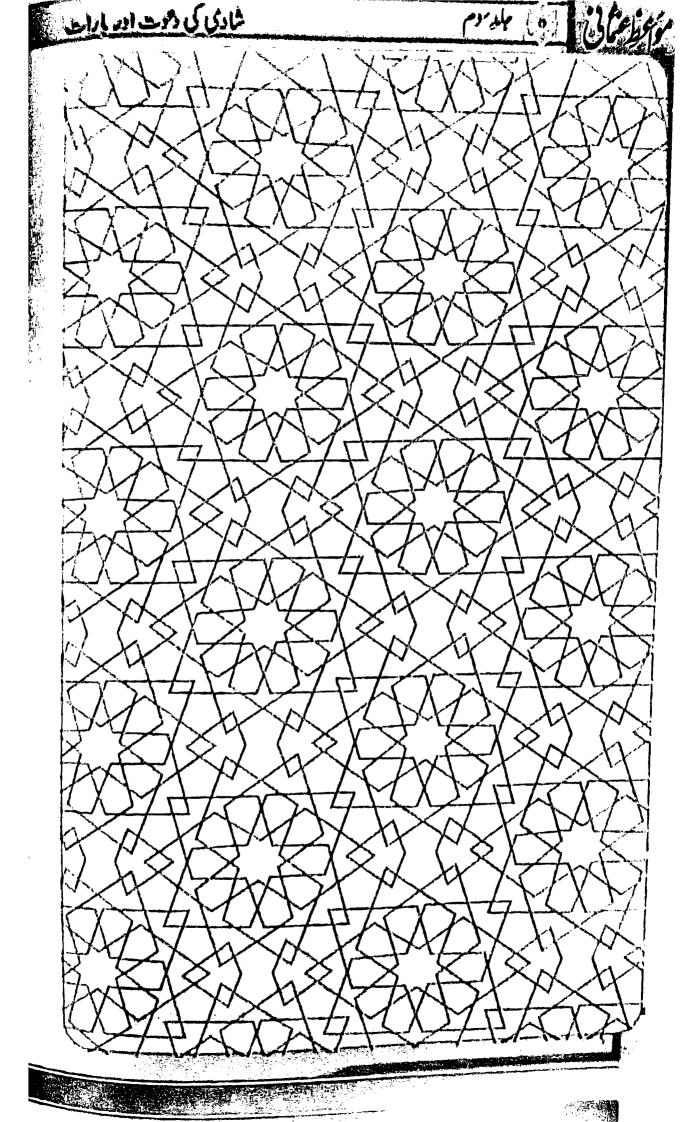
بسم اللہ الرحمن الرحیم

شادی کی دعوت اور بارات

میں پچھلے مضمون میں جہیز کے بارے میں کچھ گذارشات لکھ چکا تھا، بعد میں ایسٹن برسٹل (برطانیہ) سے ایک صاحب کا خط موصول ہوا جس میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''میں آپ کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف دلانا چاہتا ہوں، جس کی ابتداء کا زمانہ متعین کرنا تو ایک تاریخ داں کا کام ہے، مگر اس کی برائی ہر شخص کے سامنے ہے وہ ہے جہیز، جہیز کی رسم چونکہ ہند و پاک میں بسنے والے مسلمانوں میں اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ جاری ہے، اس لیے جو مسلمان وہاں سے نقلِ مکانی کر کے مغرب آئے، تو وہ یہ رسم بھی اپنے ساتھ لائے، چنانچہ اب یہ رسم مغرب میں بھی پھیل گئی ہے، آپ سے گزارش ہے کہ ایک تو آپ اس کی شرعی حیثیت بیان فرمائیں تاکہ یورپ میں مسلمانوں کی نئی نسل

اس سے آگاہ ہو سکے اور شاید ان ہزاروں غریب لڑکیوں کی قسمت پر بھی اس کا کچھ اثر پڑے، جو صرف جہیز نہ ہونے کی بنا پر دلہن نہیں بن سکتیں، کیا جہیز ضروری ہے؟ اگر ہے تو اس کی مقدار کیا ہے؟ کیا جہیز دینے کے بعد ماں باپ کو اپنی وراثت سے حصہ دینا ضروری نہیں رہتا؟ عموماً عورتیں اپنے حقِ وراثت سے اس لیے دست بردار ہوجاتی ہیں کہ ان کو جہیز مل گیا ہے اور غمی خوشی میں ان کی ماں باپ کی طرف سے مدد متوقع ہوتی ہے۔ اور ان کی شادی پر بھی خاصا خرچ ہو چکا ہوتا ہے، مگر یہ ساری باتیں لڑکے پر بھی صادق آتی ہیں، پھر وہ وراثت کا کیوں کر حقدار ہوگا؟ دوسرے لڑکی کے والدین برات کو جو کھانا کھلاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ عرب ممالک میں لڑکی کے والدین جو خرچ کرتے ہیں اس کی ادائیگی دولہا کرتا ہے، مگر ہمارے یہاں تمام اخراجات والدین پر ہی کیوں ڈالے جاتے ہیں؟

تیسرے بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ لڑکی کا باپ دولہا سے شادی کے اخراجات کے علاوہ بھی کچھ رقم کا تقاضا کرتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بلاشبہ آپ کی کتابوں سے ان گنت لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں، لیکن ''جنگ'' میں آپ نے مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ مختصر اور عام فہم ہونے کی وجہ سے زیادہ موثر ہے، اگر آپ کو میرے مذکورہ سوالات

کی وضاحت ''جنگ'' ہی کے صفحات میں فرمادیں تو امید ہے
کہ اس سے بہت سے لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا'۔

عبد المجید ایسٹن برسٹل برطانیہ

مکتوب نگار کے بعض سوالات کا جواب، تو میرے پچھلے مضمون میں آچکا ہے مثلاً یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ جہیز ہرگز نکاح کا ضروری حصہ نہیں ہے اور اس کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں لڑکی کو نکاح کے بغیر بٹھائے رکھنا ہرگز جائز نہیں، کوئی باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اپنی استطاعت کی حدود میں رہتے ہوئے خوشی سے بیٹی کو تحفہ دینا چاہے، تو وہ بے شک دے سکتا ہے، لیکن نہ اس کو نکاح کی لازمی شرط سمجھنے کی گنجائش ہے، نہ اس میں نام ونمود کا کوئی پہلو ہونا چاہیے اور نہ شوہر یا اس کے گھر والوں کے لیے جائز ہے کہ وہ جہیز کا مطالبہ کریں یا اس کی توقعات باندھیں۔

اب مکتوب نگار نے جو نئی بات ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ ''کیا جہیز دینے کے بعد ماں باپ کو اپنی وراثت سے حصہ دینا ضروری نہیں رہتا؟'' واقعی یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں خاصی عام ہے۔ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جہیز کا وراثت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے، اگر کسی باپ نے اپنی بیٹی پر جہیز کی صورت میں اپنی ساری کائنات بھی لٹادی ہو، تب بھی لڑکی کا حقِ وراثت ختم نہیں ہوتا، باپ کے انتقال کے بعد وہ اپنے باپ کے ترکے میں ضرور حصہ دار ہوگی اور اس کے بھائیوں کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ سارا ترکہ خود لے بیٹھیں اور اپنی بہن کو اس بنیاد پر محروم کردیں کہ اسے جہیز میں بہت کچھ مل چکا ہے، لڑکا ہو یا

لڑکی، ان کے باپ نے اپنی زندگی میں انہیں جو کچھ دیا ہو اس سے ان کے وراثت کے حصے میں کوئی کمی نہیں آتی، البتہ باپ کو حتی الامکان اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اپنی زندگی میں وہ اپنی اولاد کو جو کچھ دے، وہ قریب قریب برابر ہو اور کسی ایک لڑکے یا لڑکی پر دولت کی بارش برسا کر دوسروں کو محروم نہ کرے، لیکن یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کی تفصیل ان شاء اللہ کسی اور موقع پر عرض کروں گا، بہر حال! یہ بات طے شدہ ہے اور اس میں شرعی اعتبار سے کوئی ادنی شبہ نہیں کہ لڑکی کو جہیز دینے سے اس کا حقِ وراثت ختم نہیں ہوتا، بلکہ جہیز میں دی ہوئی مالیت کو اس کے حصہ وراثت سے منہا بھی نہیں کیا جاسکتا، اسے بہر صورت ترکے سے اپنا پورا حصہ ملنا ضروری ہے۔

مکتوب نگار نے دوسرا مسئلہ یہ اٹھایا ہے کہ ''لڑکی کے والدین برات کو جو کھانا کھلاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟'' اس معاملے میں بھی ہمارے معاشرے میں افراط وتفریط پر مبنی تصورات پھیلے ہوئے ہیں، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح لڑکے کے لیے نکاح کے بعد ولیمہ کرنا سنت ہے، اسی طرح لڑکی کے باپ کے لیے بھی نکاح کے وقت دعوت کرنا سنت یا کم از کم شرعی طور پر پسندیدہ ہے، حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے، لڑکی والوں کی طرف سے کسی دعوت کا اہتمام نہ سنت ہے، نہ مستحب، بلکہ اگر دوسری خرابیاں نہ ہوں، تو صرف جائز ہے، یہی معاملہ بارات کا بھی ہے، نکاح کے وقت دولہا کی طرف سے بارات لے جانا کوئی سنت نہیں، نہ نکاح کو شریعت نے اس پر موقوف کیا ہے، لیکن اگر دوسری خرابیاں نہ ہوں تو بارات لے جانا کوئی گناہ بھی نہیں، لہٰذا بعض حضرات جو بارات لے جانے اور لڑکی والوں کی طرف سے ان کی دعوت کو

ایسا گناہ سمجھتے ہیں جیسے قرآن وسنت نے اس سے خاص طور پر منع کیا ہو، ان کا یہ تشدّد بھی مناسب نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر اعتدال کے ساتھ کچھ لوگ نکاح کے موقع پر لڑکی کے گھر چلے جائیں، (جس میں لڑکی کے باپ پر کوئی بار نہ ہو) اور لڑکی کے والدین اپنی بچی کے نکاح کے فریضے سے سبکدوش ہونے کی خوشی میں اپنی دلی خواہش سے ان کی اور اپنے دوسرے عزیزوں اور دوستوں کی دعوت کردیں، تو اس میں بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن ان تمام چیزوں میں خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ ان تقریبات کو نکاح کا لازمی حصہ سمجھ لیا جاتا ہے اور جو شخص انہیں انجام دینے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، وہ بھی خواہی نخواہی ان پر مجبور ہوتا ہے اور اس غرض کے لیے بعض اوقات ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے اور بعض اوقات قرض اور ادھار کا بوجھ اپنے سر لیتا ہے اور اگر کوئی شخص اپنے مالی حالات کی وجہ سے یہ کام نہ کرے، تو اسے معاشرے میں مطعون کیا جاتا ہے۔

کسی شخص کو کوئی ہدیہ تحفہ دینا یا اس کی دعوت کرنا اگر دل کے تقاضے اور محبت سے ہو، تو نہ صرف یہ کہ کوئی گناہ نہیں، بلکہ باعثِ برکت ہے، بالخصوص جب نئے رشتے قائم ہورہے ہوں، تو ایسا کرنے سے باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ سب کچھ خلوص سے ہو اور اپنی استطاعت کی حدود میں رہ کر ہو، لیکن جب یہ چیز نام ونمود اور دکھاوے کا ذریعہ بن جائے یا اس میں بدلے کی طلب شامل ہوجائے یا یہ کام خوش دلی کے بجائے معاشرے اور ماحول کے جبر کے تحت انجام دیئے جائیں، یعنی اندر سے دل نہ چاہ رہا ہو، لیکن ناک کٹنے کے خوف سے زبردستی تحفے دیئے جائیں یا دعوتیں کی جائیں، تو یہی کام جو باعثِ برکت ہوسکتے تھے، الٹے گناہ، بے برکتی اور نحوست کا سبب بن جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ طرح طرح کی اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے،

ہماری شامتِ اعمال یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو خود ساختہ رسموں میں جکڑ کر اچھے کاموں کو بھی اپنے لیے ایک عذاب بنالیا ہے، اگر یہی کام سادگی، بے ساختگی اور بے تکلفی سے کیے جائیں، تو ان میں کوئی خرابی نہیں، لیکن اگر رسموں کی پابندی، نام ونمود اور معاشرتی جبر کے تحت انجام دیئے جائیں، تو یہ بہت بڑی برائی ہیں۔

لٰہذا اصل بات یہ ہے کہ اگر کسی لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کے نکاح کے وقت اپنی خوش دلی سے اس کی سسرال کے لوگوں کو، یا اپنے اعزہ اور احباب کو جمع کر کے ان کی دعوت کر دیتا ہے اور اسے نکاح کا لازمی حصہ یا سنت نہیں سمجھتا، تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے اور اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس کی شکایت کی جائے یا جس کی وجہ سے اسے مطعون کیا جائے، بلکہ اس کا عمل سادگی کی سنت سے زیادہ قریب ہے، اس لیے اس کی تعریف کرنی چاہیے۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ بعض لوگ اپنی اولاد کے امتحان میں کامیاب ہونے پر یا انہیں اچھی ملازمت ملنے پر خوشی کے اظہار کے لیے اپنے خاص خاص ملنے والوں کی دعوت کر دیتے ہیں، اس دعوت میں ہرگز کوئی حرج نہیں، دوسری طرف بہت سے لوگوں کے بچے امتحان میں پاس ہوتے رہتے ہیں یا انہیں اچھی ملازمتیں ملتی رہتی ہیں لیکن وہ اس خوشی میں کوئی دعوت نہیں کرتے، ان لوگوں پر بھی معاشرے کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا، نہ انہیں اس بنا پر مطعون کیا جاتا ہے کہ انہوں نے دعوت کیوں نہیں کی؟ اگر یہی طرزِ عمل نکاح کی دعوت میں بھی اختیار کر لیا جائے، تو کیا مضائقہ ہے؟ یعنی جس کا دل چاہے دعوت کرے اور جس کا دل نہ چاہے نہ کرے، لیکن خرابی یہاں سے پیدا

ہوتی ہے کہ نکاح میں اگر کوئی دعوت نہ کرے، تو سسرال والوں کی طرف سے باقاعدہ مطالبہ ہوتا ہے اور یوں سمجھا جاتا ہے جیسے شادی ہوئی ہی نہیں، جن بزرگوں نے بارات لے جانے اور اس کی دعوت کے اہتمام سے روکا، درحقیقت ان کے پیشِ نظر یہی خرابیاں تھیں، انہوں نے اس بات کی ترغیب دی کہ کم از کم کچھ بارسوخ افراد ان دعوتوں کے بغیر نکاح کریں گے تو ان لوگوں کو حوصلہ ہوگا جو ان کی استطاعت نہیں رکھتے اور صرف معاشرے کی مجبوری سے انہیں یہ کام کرنے پڑتے ہیں۔

مکتوب نگار نے آخری بات یہ پوچھی ہے کہ ”بعض علاقوں میں لڑکی کا باپ دولہا سے نکاح کے اخراجات کے علاوہ مزید کچھ رقم کا بھی مطالبہ کرتا ہے اور اس کے بغیر اسے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے پر تیار نہیں ہوتا۔“ بے شک یہ بے بنیاد رسم بھی ہمارے معاشرے کے بعض حصوں میں خاصی رائج ہے اور یہ شرعی اعتبار سے بالکل ناجائز رسم ہے، اپنی لڑکی کا رشتہ دینے کے لیے دولہا سے رقم لینے کو ہمارے فقہائے کرام رحمہم اللہ علیہم نے رشوت قرار دیا ہے اور اس کا گناہ رشوت لینے کے گناہ کے برابر ہے، بلکہ اس میں ایک پہلو بے غیرتی کا بھی ہے اور یہ عمل اپنی لڑکی کو فروخت کرنے کے مشابہ ہے اور بعض جگہ جہاں یہ رسم پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے شوہر اس کے ساتھ زرخرید کنیز جیسا سلوک کرتا ہے، لہٰذا یہ رسم شرعی اور اخلاقی لحاظ سے انتہائی غلط رسم ہے جو واجب الترک ہے۔
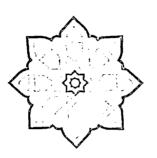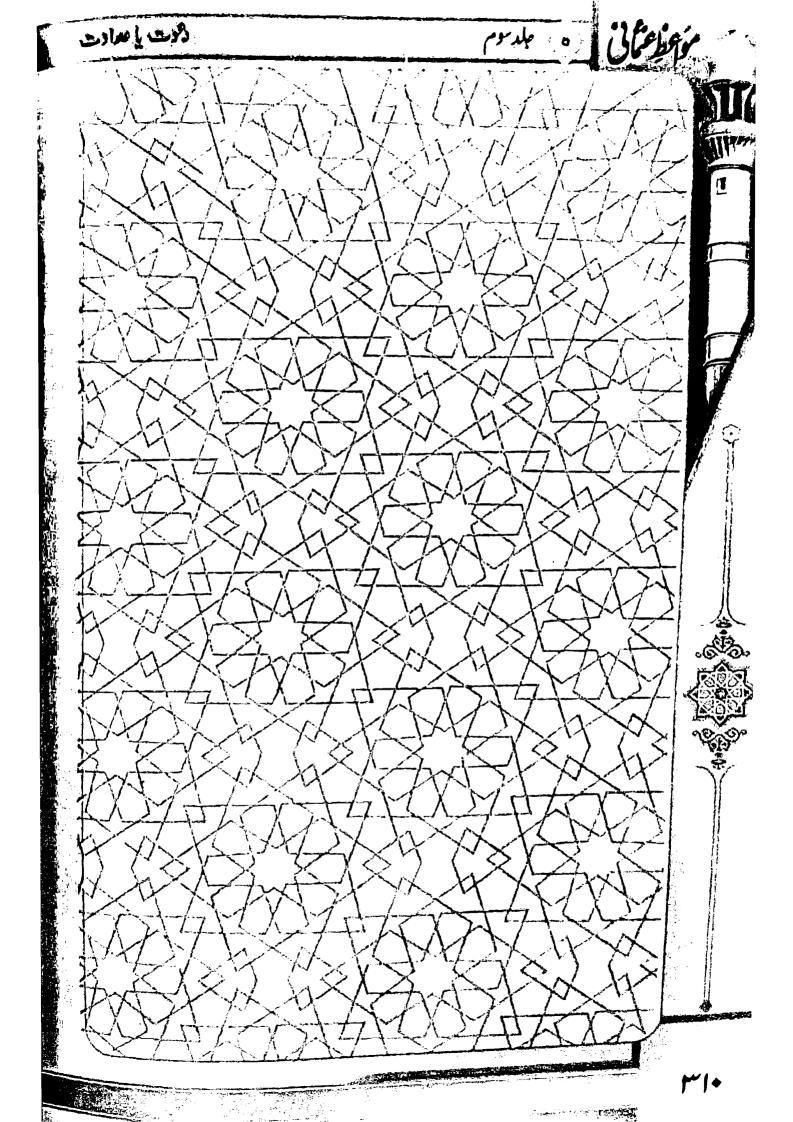
۳/رجب ۱۴۱۶ھ

۲۶/نومبر ۱۹۹۵ء

دعوت یا عداوت

(ذکر و فکر ص ۲۰۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعوت یا عداوت

کچھ عرصہ قبل اپنے ایک عزیز کے یہاں شادی کی ایک تقریب میں مدعو تھا، چونکہ آج کل شادی کی تقریبات متعدد وجوہ سے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی ہیں، اس لیے میں بہت کم تقریبات میں شرکت کرتا ہوں اور رشتہ داری یا دوستی کا حق کسی اور مناسب وقت پر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اتفاق سے اس روز اسی وقت میں پہلے بہار کالونی میں ایک جگہ تقریر کا وعدہ کرچکا تھا، جبکہ شادی کی یہ تقریب نیشنل اسٹیڈیم کے متصل ایک لان میں منعقد ہورہی تھی یعنی دونوں جگہوں کے درمیان میلوں کا فاصلہ تھا اس لیے میرے پاس ایک معقول عذر تھا جو میں نے تقریب کے منتظمین سے عرض کردیا اور پروگرام یہ بنایا کہ میں بہار کالونی جاتے ہوئے اہل خانہ کو تقریب میں چھوڑتا جاؤں گا، اور جب بہار کالونی کے پروگرام سے واپس ہوں گا تو اس وقت تک تقریب ختم ہوچکی ہوگی، میں منتظمین کو مختصر مبارک باد دے کر گھر والوں کو ساتھ لے جاؤں گا۔ چنانچہ اسی نظم کے مطابق میں نے عشاء کی نماز بہار کالونی میں پڑھی، نماز کے کافی دیر بعد وہاں پروگرام شروع ہوا، مجھ سے پہلے ایک اور صاحب نے

خطاب کیا، پھر میرا خطاب بھی تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا۔ اس کے بعد عشائیہ کا انتظام تھا، میں نے اس میں بھی شرکت کی، پھر وہاں سے روانہ ہوا اور جب اسٹیڈیم پہنچا، تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے، خیال یہ تھا کہ اگرچہ دعوت نامے پر نکاح کا وقت آٹھ بجے اور کھانے کا وقت غالباً ساڑھے آٹھ بجے درج تھا، لیکن اگر کچھ دیر ہوئی ہوگی، تب بھی ساڑھے گیارہ بجے تک ضرور تقریب ختم ہوگئی ہوگی، لیکن جب تقریب والے لان میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابھی تک بارات ہی نہیں آئی، لوگ بے چارگی کے عالم میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے، بعض لوگوں کے کندھوں پر سے بچے لگے ہوئے تھے جو بھوک یا نیند کے غلبے کی وجہ سے روتے روتے سونے لگے تھے، کچھ لوگ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ کر نکاح میں شرکت کے بغیر واپسی کی سوچ رہے تھے۔ اور بہت سے افراد منتشر ٹولیوں کی شکل میں وقت گزاری کے لیے بات چیت میں مشغول تھے اور بہت سے ساکت و صامت بیٹھے آنے والے حالات کا انتظار کررہے تھے، منتظمین نے لوگوں کے پوچھنے پر انہیں اطمینان دلایا کہ ابھی فون سے پتہ چلا ہے کہ بارات روانہ ہورہی ہے اور ان شاء اللہ آدھے گھنٹے تک یہاں پہنچ جائے گی۔

میں خیر پہلے ہی معذرت کرچکا تھا، اس لیے چند منٹ بعد منتظمین سے اجازت لے کر چلا آیا، لیکن آدھے گھنٹے بعد بارات کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ سوا بارہ بجے رات کو بارات پہنچی ہوگی، ساڑھے بارہ بجے کے وقت نکاح ہوا ہوگا، اور کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے یقیناً لوگوں کو ڈیڑھ بج گیا ہوگا۔

یہ تو ایک تقریب کا واقعہ تھا، شہر کی بیشتر شادی کی تقریبات کا یہی حال ہے

کہ دعوت نامے پر لکھے ہوئے اوقات قطعی طور پر بے معنی ہوکر رہ گئے ہیں، خود لکھنے والوں کا ارادہ بھی یہی ہوتا ہے کہ ہم ان اوقات کی پابندی نہیں کریں گے، لہٰذا جن حضرات کو دعوت نامہ پہنچتا ہے وہ بھی اتنی بات تو یقین سے جانتے ہیں کہ دعوت نامے میں لکھے ہوئے اوقات پر عمل نہیں ہوگا، لیکن تقریب کے واقعی اوقات کیا ہوں گے؟ چونکہ اس کے بارے میں یقینی بات کوئی نہیں بتا سکتا، اس لیے ہر شخص اپنا الگ اندازہ لگاتا ہے، شروع شروع میں لوگوں نے یہ اندازہ لگانا شروع کیا کہ مقررہ وقت سے آدھے پون گھنٹے کی تاخیر ہوجائے گی، لیکن جب اس حساب سے دعوت میں پہنچ کر گھنٹوں خوار ہونا پڑا، تو انہوں نے تاخیر کا اندازہ اور بڑھالیا، اس طرح ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ نہ اب تاخیر کی کوئی حد مقرر ہے، نہ اندازوں کا کوئی حساب ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں، کہ رات کو ایک بجے کے بعد نکاح ہوا اور لوگ دو بجے کے بعد اپنے گھروں کا رخ کر سکے، ہر شخص کے پاس اپنی سواری بھی نہیں ہوتی اور رات گئے سواری کا انتظام جوئے شیر لانا تو ہے ہی، شہر کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر جان کا جوا کھیلنے کے مترادف بھی ہے۔

اس صورتِ حال کے نتیجے میں کسی ایک تقریب میں شرکت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کم از کم چار پانچ گھنٹے خرچ کرے، بے مقصد انتظار کی کوفت برداشت کرے، رات گئے ٹیکسیوں کا کئی گنا کرایہ ادا کرے اور پھر بھی سارے راستے ممکنہ خطرات سے سہا رہے، رات کو بے وقت سونے کے نتیجے میں صبح کو دیر سے بیدار ہوکر فجر کی نماز غائب کرے اور یا تو اگلے روز آدھے دن کی چھٹی کرے یا نیم غنودگی کی حالت میں الٹا سیدھا کام کرے، سوال یہ ہے کہ ؎

کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

دنیا کا کوئی نظامِ فکر ایسا نہیں ہے جس میں وقت کو انسان کی سب سے بڑی دولت قرار دے کر اس کی اہمیت پر زور نہ دیا گیا ہو، انسان کی زندگی کا ایک ایک لحہ قیمتی ہے اور جو قومیں وقت کی قدر پہچان کر اسے ٹھیک استعمال کرتی ہیں، وہی دنیا میں ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔

مجھے جاپان جانے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن میرے ایک دوست نے (جو خاصے ثقہ ہیں) ایک صاحب کا یہ قصہ سنایا کہ وہ اپنے تجارتی مقصد سے جاپان گئے تھے، وہاں ان کے ایک ہم پیشہ تاجر یا صنعت کار نے انہیں رات کے کھانے پر اپنے یہاں دعوت دی، جب یہ صاحب کھانے کے مقررہ وقت پر ان کے گھر پہنچے، تو میزبان کھانے کی میز پر بیٹھ چکے تھے اور کھانا لگایا جا چکا تھا، ان صاحب کو کسی قسم کے تمہیدی تکلفات کے بغیر سیدھے کھانے کی میز پر لے جا کر بٹھا دیا گیا اور کھانا فوراً شروع ہوگیا، کھانے کے دوران باتیں ہوتی رہیں، لیکن ان صاحب نے ایک عجیب سی بات یہ نوٹ کی کہ میزبانوں کے پاؤں کھانے کے دوران ایک خاص انداز سے حرکت کر رہے تھے، شروع میں انہوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ اس انداز کی حرکت ہے جیسے بعض لوگ بے مقصد پاؤں ہلانے کے عادی ہوجاتے ہیں، لیکن تھوڑی دیر انہوں نے محسوس کیا کہ پاؤں کی حرکت میں کچھ ایسی باقاعدگی ہے جو بے مقصد حرکت میں عموماً نہیں ہوا کرتی، بالآخر انہوں نے میزبانوں سے پوچھ ہی لیا۔ اور ان صاحب کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ دراصل میز کے نیچے کوئی مشین رکھی ہوئی ہے اور وہ کھانے کے دوران بھی اپنا پاؤں استعمال کر کے کوئی ہلکا پھلکا ''پیداواری کام'' جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ قصہ سچا ہے یا کسی ''جہاں دیدہ'' نے زیب داستان کے لیے گھڑا ہے، لیکن اس قسم کے قصے بھی اسی قوم کے بارے میں گھڑے جاسکتے ہیں جس نے اپنے عمل سے وقت کی قدر و قیمت پہچاننے اور محنت کرنے کی مثالیں قائم کی ہوں، ہمارے ملک کے بارے میں اس قسم کا کوئی قصہ جھوٹ موٹ بھی نہیں گھڑا جاسکتا، اس لیے کہ ہمارا مجموعی طرزِ عمل یہ بتاتا ہے کہ وقت ہمارے نزدیک سب سے زیادہ بے وقعت چیز ہے اور اگر شادی کی کسی ایک رسمی تقریب میں شرکت کے لیے ہمارا پورا دن برباد ہوجائے تو بھی ہمیں کوئی پروانہیں۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ہم وقت کی یہ ناقدری اس دین اسلام کے نام لیوا ہونے کے باوجود کرتے ہیں جس نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہر شخص کو اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب آخرت میں دینا ہوگا، جس نے پانچ وقت کی با جماعت نماز مقرر کر کے اس کے ہر دن کو خود بخود پانچ حصوں میں تقسیم کردیا ہے اور اس کے ذریعے شب و روز کا بہترین نظام الاوقات طے کرنا آسان بنادیا ہے۔

یوں تو وقت ضائع کرنے کے مظاہرے ہم زندگی کے ہر شعبے میں کرتے ہیں، لیکن اس وقت موضوع گفتگو تقریبات اور دعوتیں تھیں جن میں وقت کی پابندی نہ کرکے ہم اپنا بھی اور سینکڑوں مدعوین کا بھی وقت برباد کرتے ہیں، لوگوں کو دعوت میں بلا کر انہیں غیر محدود مدت تک انتظار کی قید میں رکھنا ان سب کے ساتھ ایسی زیادتی ہے جس کے خلاف ایسی خوشی کے مواقع پر کوئی احتجاج کرنا بھی آسان نہیں ہوتا، کیونکہ لوگ مروّت میں اس زیادتی پر زبان بھی نہیں

کھولتے، لیکن جو شخص بھی انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو بلا وجہ تکلیف پہنچانے کا سبب بنے، کیا وہ گناہ گار نہیں ہوگا؟ مدعو حضرات میں سے بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کا وقت بچتا، تو ملک وملت کے کسی مفید کام میں خرچ ہوتا، ایسے لوگوں کا وقت ضائع کر کے انہیں گھنٹوں بے مقصد بٹھائے رکھنا صرف ان پر نہیں، بلکہ ملک وملت پر بھی ظلم ہے، یہ حقیقت میں دعوت نہیں، عداوت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ ایک غلط رِیت معاشرے میں چل پڑی ہے اس لیے اگر کوئی شخص اسے غلط سمجھ کر اس کی اصلاح کرنا بھی چاہے، تو اب اصلاح اس کے بس میں نہیں رہی۔ لیکن مجھے اس نقطہ نظر سے کبھی اتفاق نہیں ہوا، سوال یہ ہے کہ آپ اس قسم کی غلط، بلکہ مہلک رِیت کا کب تک ساتھ دیں گے؟ کب تک رواجِ عام کو غلطیوں کا بہانہ بنایا جاتا رہے گا؟ ہر غلط رِیت کے آگے ہتھیار ڈال کر اس کے بہاؤ پر بہنے کا سلسلہ آخر کہاں جا کر رکے گا؟ واقعہ یہ ہے کہ اصل ضرورت صرف ایک پختہ اور ناقابل شکست ارادے کی ہے، اسی ماحول میں جہاں مقررہ وقت پر کسی دعوت میں پہنچنے والا بے وقوف سمجھا جاتا ہے، خود میں نے ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہیں جنہوں نے دعوت نامہ پر پابندیٔ وقت کی خصوصی ہدایت لکھی اور اس پر عمل کر کے بھی دکھایا اور کھانے کا جو وقت دیا گیا تھا، اس پر کھانا واقعی شروع کر دیا اور اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ حاضرین کم ہیں یا زیادہ؟ سوال یہ ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے پابندیٔ وقت کے خصوصی التماس کے باوجود آنے میں دیر کی ہے، تو اس کی سزا ان لوگوں کو کیوں دی جائے جو بے چارے وقت پر آ گئے تھے؟ جب تک کچھ لوگ ان باتوں کو سنجیدگی سے سوچ کر پابندیٔ وقت کا تہیہ نہیں کریں گے، اس وقت تک تقریبات کا یہ بے ڈھب سلسلہ کسی حد پر نہیں رکے گا۔ آج بھی جو تقریبات ہوٹلوں میں

ہوتی ہیں اور جہاں گھنٹوں کے حساب سے بکنگ ہوتی ہے، وہاں سارے کام کس طرح وقت پر ہوجاتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ ضرورت صرف پختہ ارادے کی ہے، اگر چند افراد بھی یہ پختہ ارادہ کرلیں اور اس پر عمل کر کے دکھا دیں، تو تبدیلی ہمیشہ افراد ہی سے آتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ، وہ عمومی رواج کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔

۲۴ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ
۳۰ / اکتوبر ۱۹۹۴ء

نکاح اور ولیمہ......
چند سوالات کا جواب

(ذکر وفکر ص ۳۹۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم
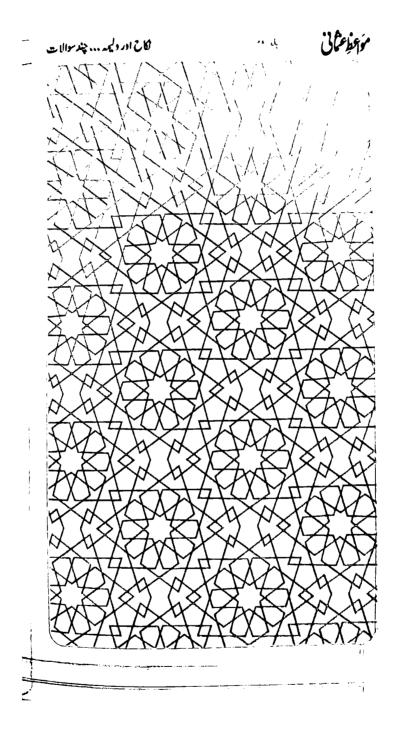
نکاح اور ولیمہ......چند سوالات کا جواب

میں نے پچھلے مضامین میں شادی بیاہ اور اس کے رسم ورواج کے بعض پہلوؤں پر کچھ گذارشات پیش کیں، تو میرے پاس قارئین کی طرف سے سوالات اور تجاویز کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا، جن سے ایک تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ شادی بیاہ میں ہونے والی فضول رسموں سے کتنے پریشان ہیں اور ان کا کوئی حل چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شادی بیاہ کے بارے میں دینی معلومات سے ناواقفیت کتنی عام ہوگئی ہے کہ وہ معمولی باتیں جو مسلمان گھرانے کے ہر فرد کو معلوم ہوا کرتی تھیں، اب اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم نہیں ہیں اور ان کی جگہ بہت سے بے بنیاد اور غلط مفروضوں نے لے لی ہے، تیسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان مسائل کی صحیح شرعی حیثیت جاننا چاہتے ہیں۔

ان میں سے بعض سوالات تو ایسے تھے کہ میں نے انہیں شائع کرنے کے بجائے ان کا انفرادی جواب دینا زیادہ مناسب سمجھا، لیکن ان میں سے بعض

باتیں ایسی ہیں کہ ان کی وضاحت ان کالموں میں مناسب معلوم ہوتی ہیں تاکہ وہ وسیع پیمانے پر پڑھی جاسکیں۔ تاہم ہر خط کو اس کے الفاظ میں نقل کرنے کے بجائے میں مجموعی مضمون کے ذیل میں ان شاء اللہ مطلوبہ سوالات کا جواب عرض کردوں گا۔

شادی کی تقریبات میں ''ولیمہ'' ایک ایسی تقریب ہے جو باقاعدہ سنت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی صراحۃً ترغیب دی ہے (۱)، لیکن اول تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دعوت کوئی فرض یا واجب نہیں جس کے چھوڑنے سے نکاح پر کوئی اثر پڑتا ہو، ہاں یہ سنت ہے اور حتی الامکان اس پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس سنت کی ادائیگی کے لیے شرعاً نہ مہمانوں کی کوئی تعداد مقرر ہے نہ کھانے کا کوئی معیار، بلکہ ہر شخص اپنی استطاعت کی حد میں رہتے ہوئے جس پیمانے پر چاہے ولیمہ کرسکتا ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضورِ اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ولیمہ ایسا کیا جس میں صرف دو سیر جو خرچ ہوئے (۲)، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر ولیمہ سفر میں ہوا اور اس طرح ہوا کہ دسترخوان بچھا دیا گیا اور اس پر کچھ کھجوریں، کچھ پنیر اور کچھ گھی رکھ دیا گیا (۳)، بس ولیمہ ہوگیا، البتہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر روٹی اور بکری کے گوشت سے دعوت کی گئی (۴)، لہٰذا ولیمے کے بارے میں یہ سمجھنا

---

(۱) صحیح البخاری ۵۲/۳ (۲۰٤۸)۔
(۲) صحیح البخاری ۲٦/۷ (۵۱۷۲)۔
(۳) صحیح البخاری ۸۳/۱ (۳۷۱)۔
(٤) صحیح البخاری ۲٤/۷ (۵۱٦۸) و ۱۱۹/٦ (٤۷۹٤)۔

درست نہیں کہ اس میں مہمانوں کی کوئی بڑی تعداد ضروری ہے یا کوئی اعلیٰ درجے کا کھانا ضرور ہونا چاہیے اور اگر کسی شخص کے پاس خود گنجائش نہ ہو، تو وہ قرض ادھار کر کے ان چیزوں کا اہتمام کرے، بلکہ شرعی اعتبار سے مطلوب یہی ہے کہ جس شخص کے پاس خود اپنے وسائل کم ہوں اور اپنی استطاعت کے مطابق اختصار سے کام لے، ہاں اگر استطاعت ہو تو زیادہ مہمان مدعو کرنے اور اچھے کھانے کا اہتمام کرنے میں بھی کچھ حرج نہیں، بشرطیکہ مقصد نام ونمود اور دکھاوا نہ ہو۔

ان حدود میں رہتے ہوئے ولیمہ بے شک مسنون ہے اور اس لحاظ سے کارِ ثواب بھی، لہٰذا اس کے تقدس کو طرح طرح کے گناہوں سے مجروح کرنا اس کی ناقدری، بلکہ توہین کے مترادف ہے، محض شان وشوکت کے اظہار اور نام ونمود کے اقدامات، تقریب کی مصروفیات میں نمازوں کا ضیاع، سجے بنے مردوں عورتوں کا بے حجاب میل جول ان کی فلم بندی اور اس قسم کے دوسرے منکرات اس تقریب کی برکتوں پر پانی پھیر دیتے ہیں جن سے اس بابرکت تقریب کو بچانا چاہیے۔

ولیمے کے بارے میں ایک اور غلط فہمی خاصی پھیلی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ پریشان رہتے ہیں، ایک صاحب نے خاص طور پر اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے اس نکتے کی وضاحت چاہی ہے، وہ غلط فہمی یہ ہے کہ اگر دولہا دلہن کے درمیان تعلقات زن وشو قائم نہ ہو پائے ہوں تو ولیمہ صحیح نہیں ہوتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ولیمہ نکاح کے وقت سے لے کر رخصتی کے بعد تک کسی بھی

وقت ہوسکتا ہے، البتہ مستحب یہ ہے کہ رخصتی کے بعد ہو اور رخصتی کا مطلب رخصتی ہی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی یہ کہ دلہن دولہا کے گھر آجائے اور دونوں کی تنہائی میں ملاقات ہوجائے اور بس، لہٰذا اگر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان تعلق زن وشو قائم نہ ہوا ہو، تو اس سے ولیمے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ ولیمہ ناجائز ہوتا ہے، نہ نفلی قرار پاتا ہے اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس طرح ولیمے کی سنت ادا نہیں ہوتی، بلکہ اگر ولیمہ رخصتی ہی سے پہلے منعقد کرلیا جائے تب بھی ولیمہ ادا ہوجاتا ہے، صرف اس کا مستحب وقت حاصل نہیں ہوتا، (یہاں دلائل کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، جو حضرات دلائل سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ علامہ ابن حجر کی فتح الباری میں صفحہ ۲۳۱ ج ۹ پر باب الولیمہ کے تحت حدیث نمبر ۵۱۶۶ کی تشریحات ملاحظہ فرمالیں)۔

ایک صاحب نے ایک اور سوال کیا ہے اور وہ یہ کہ نکاح کے وقت جب لڑکی کے گھر والے لڑکی سے ایجاب وقبول کراتے ہیں، تو کیا لڑکی کا اپنی زبان سے منظوری کا اظہار کرنا ضروری ہے یا نکاح نامے پر دستخط کردینا کافی ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہمارے یہاں شادیاں عموماً اس طرح ہوتی ہیں کہ دلہن خود نکاح کی محفل میں موجود نہیں ہوتی، بلکہ دلہن کے گھر والوں میں سے کوئی نکاح سے پہلے سے اجازت لیتا ہے، جو دلہن کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور نکاح نامے میں بھی اس کا نام وکیل کے خانے میں درج ہوتا ہے، جب یہ وکیل لڑکی سے اجازت لینے جاتا ہے، تو یہ نکاح کا ایجاب وقبول نہیں ہوتا، بلکہ محض لڑکی سے نکاح کی اجازت لی جاتی ہے، اس میں اجازت لینے والے کو لڑکی سے یہ کہنا چاہیے کہ میں تمہارا نکاح فلاں ولد فلاں سے اتنے مہر پر کرنا چاہتا ہوں، کیا تمہیں یہ منظور ہے؟ اگر لڑکی کنواری ہے، تو

اس کا زبان سے ''منظور ہے'' کہنا ضروری نہیں، بلکہ اتنا بھی کافی ہے کہ انکار نہ کرے، البتہ زبان سے منظوری کا اظہار کردے تو اور اچھا ہے اور اگر صرف نکاح نامے پر دستخط کردے تو بھی اجازت ہوجاتی ہے، البتہ اگر کوئی عورت پہلے شادی شدہ رہ چکی ہے اور اب یہ اس کی دوسری شادی ہے، تو اس کا زبان سے منظوری کا اظہار ضروری ہے، بصورتِ دیگر اسے منظوری نہیں سمجھا جائے گا۔

جب لڑکی سے اس طرح اجازت لے لی جائے، تو جس شخص نے اجازت لی ہے وہ بحیثیتِ وکیل نکاح کرنے کا اختیار نکاح خواں کو دے دیتا ہے اور پھر نکاح خواں جو الفاظ دولہا سے کہتا ہے وہ نکاح کا ایجاب ہے اور دولہا جو جواب دیتا ہے وہ قبول ہے، اور ان دونوں کلمات سے نکاح کی تکمیل ہوجاتی ہے۔

۱۱/رجب ۱۴۱۶ھ
۴/دسمبر ۱۹۹۵ء

نکاح اور برادری

(ذکر وفکر ص ۳۱۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نکاح اور برادری

شادی بیاہ کے معاملے میں لوگ ابھی تک اپنے خود ساختہ خیالات کے بندھن میں کس بری طرح جکڑے ہوئے ہیں اور اس معاملے میں اسلامی تعلیمات سے غفلت اور ناواقفیت کتنی عام ہو چکی ہے؟ اس کا اندازہ ان مختلف قضیوں سے ہوتا رہتا ہے جو لوگ شرعی حل معلوم کرنے کے لیے بکثرت میرے سامنے لاتے رہتے ہیں، ابھی ایک خاتون نے امریکہ سے مجھے ایک طویل خط میں اپنی درد بھری داستان لکھی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے والد ایک کروڑ پتی آدمی ہیں، پڑھے لکھے ہیں، لیکن ان کو یہ اصرار تھا کہ وہ اپنی کسی بیٹی کی شادی اپنی برادری سے باہر نہیں کریں گے، خاتون نے لکھا ہے کہ میں ان کی بڑی بیٹی ہوں اور شروع میں مجھ سے شادی کرنے کے لیے کئی رشتے آئے، لیکن میرے والد نے ہر رشتے کو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ برادری سے باہر کا رشتہ ہے، اس لیے ان کے لیے قابلِ قبول نہیں، یہاں تک کہ میری عمر زیادہ ہوتی چلی گئی اور بالآخر رشتے آنے بند ہو گئے، یہاں تک کہ ایک روز میرے والد نے مجھ سے یہ کہا کہ اب میرے لیے تمہارا کوئی رشتہ اپنی برادری سے

حاصل کرنا ممکن نہیں رہا، لہٰذا اب تم میرے سامنے یہ حلف اٹھاؤ کہ عمر بھر شادی نہیں کروگی، میں چونکہ مال دار آدمی ہوں، لہٰذا جیتے جی تمہاری کفالت کروں گا، لیکن مجھے یہ کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے کہ تمہاری شادی برادری سے باہر ہو، خاتون کہتی ہیں کہ والد صاحب نے مجھے یہ اقرار کرنے پر اتنا مجبور کیا کہ بالآخر میں نے یہ وعدہ کرلیا کہ تمام عمر شادی نہیں کروں گی اور اس کے بعد واقعۃً میں نے یہ تہیہ بھی کرلیا کہ اپنے والد کی خواہش کے احترام میں زندگی اسی طرح گذاردوں گی، لیکن میری چھوٹی بہن، ایک بھائی اور والدہ اس فیصلے پر راضی نہیں ہوئے، ایک صاحب جنہوں نے عرصہ دراز پہلے میرے لیے رشتہ مانگا تھا اور والد صاحب نے انہیں سختی سے انکار کردیا تھا، ابھی تک مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ تھے، میرے بھائی بہن نے ان سے بات کی اور والد صاحب کو بھی آمادہ کرنے کی کوشش کی، آخرکار والد صاحب نے اتنا تو کہہ دیا کہ اگر تم لوگ یہ نکاح کرنا ہی چاہتے ہو تو میں نکاح کرادوں گا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کے بعد لڑکی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، بہن نے مجھ سے والد صاحب کی یہ بات چھپائی اور صرف اتنا کہا کہ وہ ناراض تو ہیں، مگر نکاح پر آمادہ ہوگئے ہیں، چنانچہ یہ نکاح ہوگیا اور میں اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی آئی، لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ والد صاحب نے عمر بھر کے لیے مجھ سے قطع تعلق کرلیا ہے، نہ وہ مجھ سے فون پر بات کرنے کے لیے تیار ہیں نہ مجھے اپنی بیٹی تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔

یہ واقعہ تو انتہائی سنگین نوعیت کا ہے، لیکن یہ بات اکثر دیکھنے سننے میں آتی رہتی ہے کہ لوگ برادری میں نکاح کرنے کے بارے میں طرح طرح کی غلط

فہمیوں کا شکار ہیں، یہ درست ہے کہ شریعت نے نکاح کے معاملے میں ایک حد تک کفو کی رعایت رکھی ہے، لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ نکاح چونکہ زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے، اس لیے میاں بیوی اور دونوں خاندانوں کے درمیان طبعی ہم آہنگی ہو، ان کے رہن سہن، ان کے طرزِ فکر اور ان کے مزاج میں اتنی دوری نہ ہو کہ ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے میں مشکل پیش آئے، لیکن اول تو کفو کی اس رعایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر کفو میں کوئی رشتہ نہ ملے، تو یہ قسم کھالی جائے کہ اب زندگی بھر شادی ہی نہیں ہوسکے گی، دوسرے کفو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خاص اپنی برادری ہی میں رشتہ کیا جائے اور برادری کے باہر سے جو بھی رشتے آئیں، انہیں غیر کفو قرار دیا جائے، اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں جنہیں نظر انداز کرنے سے ہمارے معاشرے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں:

① ہر وہ شخص کسی لڑکی کا کفو ہے جو اپنے خاندانی حسب ونسب، دین داری اور پیشے کے لحاظ سے لڑکی اور اس کے خاندان کا ہم پلہ ہو، یعنی کفو میں ہونے کے لیے اپنی برادری کا فرد ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص کسی اور برادری کا ہے، لیکن اس کی برادری بھی لڑکی کی برادری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہے، تو وہ بھی لڑکی کا کفو ہے، کفو سے باہر نہیں ہے، مثلاً سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی، بلکہ تمام قریشی برادریاں آپس میں ایک دوسری کے لیے کفو ہیں، اسی طرح جو مختلف عجمی برادریاں ہمارے ملک میں پائی جاتی ہیں مثلاً راجپوت، خان وغیرہ وہ بھی اکثر ایک دوسری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہیں اور ایک دوسری کے لیے کفو ہیں۔

(۲) بعض احادیث وروایات میں یہ ترغیب ضرور دی گئی ہے کہ نکاح کفو میں کرنے کی کوشش کی جائے[۱]، تاکہ دونوں خاندانوں کے مزاج آپس میں میل کھا سکیں، لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ کفو سے باہر نکاح کرنا شرعاً بالکل ناجائز ہے یا یہ کہ کفو سے باہر نکاح شرعاً درست نہیں ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ اگر لڑکی اور اس کے اولیاء کفو سے باہر نکاح کرنے پر راضی ہوں، تو کفو سے باہر کیا ہوا نکاح بھی شرعاً منعقد ہوجاتا ہے اور اس میں نہ کوئی گناہ ہے، نہ کوئی ناجائز بات، لہٰذا اگر کسی لڑکی کا رشتہ کفو میں میسر نہ آرہا ہو اور کفو سے باہر کوئی مناسب رشتہ مل جائے، تو وہاں شادی کردینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کفو میں رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے لڑکی کو عمر بھر بغیر شادی کے بٹھائے رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔

(۳) شریعت نے یہ ہدایت ضرور دی ہے کہ لڑکی کو نکاح بغیر ولی کے نہیں کرنا چاہیے (خاص طور سے اگر کفو سے باہر نکاح کرنا ہو تو ایسا نکاح اکثر فقہاء کے نزدیک بغیر ولی کے درست نہیں ہوتا) لیکن ولی کو بھی یہ چاہیے کہ وہ کفو کی شرط پر اتنا زور نہ دے جس کے نتیجے میں لڑکی

---

(۱) المعجم الاوسط للطبرانی ۱/٦ (۳) طبع دار الحرمین القاہرہ۔والسنن الکبری للبیھقی ۷/۲۱۵ (۱۳۷٦۰) وقال ھذا حدیث ضعیف بمرۃ۔طبع دار الکتب العلمیۃ.و۷/۲۱۷ (۱۳۷٦۹) وقال ھذا منقطع بین شجاع وابن جریج حیث لم یسم شجاع بعض اصحابہ ورواہ عثمان بن عبد الرحمن عن علی بن عروۃ الدمشقی عن ابن جریج عن نافع عن ابن عمر وہو ضعیف وروی من وجہ آخر عن نافع وھو ایضا ضعیف بمرۃ۔

عمر بھر شادی سے محروم ہوجائے اور برادری کی شرط پر اتنا زور دینا تو اور بھی زیادہ بے بنیاد اور لغو حرکت ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ایک حدیث میں حضورِ سرورِ کونین ﷺ کا ارشاد ہے:

"إذا جَاءَكُم مَن تَرْضَوْنَ دِينَه وخُلُقَه فزوِّجُوهُ إلَّا تَفْعَلوا تكنْ فِتنةٌ في الأرضِ وفَسَادٌ عَرِيضٌ"[1]

"جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص رشتہ لے کر آئے جس کی دینداری اور اخلاق تمہیں پسند ہوں، تو اس سے (اپنی لڑکی کا) نکاح کردو، اگر تم ایسا نہیں کروگے، تو زمین میں بڑا فتنہ وفساد برپا ہوگا"۔

④ اسی ضمن میں یہ غلط فہمی بھی بہت سے لوگوں میں عام ہے کہ سید لڑکی کا نکاح غیر سید گھرانے میں نہیں ہوسکتا، یہ بات بھی شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے، ہمارے عرف میں "سید" ان حضرات کو کہتے ہیں جن کا نسب بنی ہاشم سے جا ملتا ہو، چونکہ حضور سرورِ کونین ﷺ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے بلاشبہ اس خاندان سے نسبی وابستگی ایک بہت بڑا اعزاز ہے، لیکن شریعت نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی کہ اس خاندان کی کسی لڑکی کا نکاح باہر نہیں ہوسکتا، بلکہ جیسا میں نے اوپر عرض کیا، نہ صرف شیوخ، بلکہ تمام قریشی نسب کے لوگ بھی

(۱) سنن ابن ماجہ ۳/۳۹۰ (۱۹۶۷) وسنن الترمذی ۲/۳۸۱ (۱۰۸۵) وقال ہذا حدیث حسن غریب۔

شرعی اعتبار سے سادات کے کفو ہیں اور ان کے درمیان نکاح کا رشتہ قائم کرنے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ قریش سے باہر کے خاندانوں میں بھی باہمی رضامندی کے ساتھ نکاح ہوسکتا ہے۔

۲۶/ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ
۱۵/مئی ۱۹۹۶ء

خطبۂ نکاح کا پیغام

(ذکر و فکر ص ۲۹۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ نکاح کا پیغام

ہم میں سے شاید کوئی شخص بھی ایسا نہ ہو جس نے کبھی کسی نکاح کی تقریب میں حصہ نہ لیا ہو، آئے دن شادی کی تقریبات اور نکاح کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں اور تقریباً ہر محفل میں سینکڑوں افراد شریک ہوتے ہیں، ان محفلوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایجاب وقبول سے پہلے نکاح خواں ایک خطبہ پڑھتا ہے، اس کے بعد نکاح کی کارروائی ہوتی ہے، اگرچہ نکاح کی صحت کے لیے خطبہ کوئی لازمی شرط نہیں ہے، اس کے بغیر بھی دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کرنے سے نکاح صحیح ہوجاتا ہے، لیکن یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے کہ نکاح سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختصر خطبہ دیتے تھے جس کے ابتدائی الفاظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سکھائے تھے،[1] یہی وہ الفاظ ہیں جو ہم تقریباً ہر نکاح کی محفل میں نکاح خواں کی زبانی سنتے ہیں، عام طور سے خطبے

(۱) سنن النسائی ۱۰٤/۳ (۱٤۰٤)، وسنن أبی داود ۲۳۸/۲ (۲۱۱۸) وسنن الترمذی ۳۹۸/۲ (۱۱۰۵) وقال حدیث حسن.

کے یہ الفاظ، ان کا مقصد اور ان کی معنویت شادی کے طربیہ ہنگاموں میں گم ہو کر رہ جاتی ہے، انہیں بے توجہی کے ساتھ سنا جاتا ہے اور اگر نکاح کی محفل بڑی ہو اور لاؤڈاسپیکر کا انتظام نہ ہو، تو اکثر لوگ انہیں سن بھی نہیں پاتے اور عین خطبے کے وقت بھی باتیں کرتے نظر آتے ہیں (اور یہ بھی اسی بے توجہی کا شاخسانہ ہے کہ جو لوگ نکاح کی تقریب پر ہزاروں، بلکہ بعض اوقات لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں، وہ بعض اوقات اتنا بھی خیال نہیں کرتے کہ تھوڑے سے پیسے مزید خرچ کر کے لاؤڈاسپیکر کا انتظام کر دیں، تاکہ خطبہ اور ایجاب وقبول، جو پوری تقریب کی اصل روح ہے، وہ پرسکون اور باوقار طریقے سے انجام پا سکے اور حاضرین ان بابرکت کلمات کو ہاؤ ہو کے بجائے تقدس کی فضا میں سن سکیں)۔

بہر کیف! اگر خطبہ سننے میں آ بھی جائے، تو عموماً اسے محض ایک تبرک سمجھا جاتا ہے اور عام لوگوں کے ذہن میں اس کا مقصد صرف برکت کا حصول ہوتا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں، لہٰذا شاید ہی کوئی صاحب ایسے ہوں جنہوں نے یہ جاننے سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟ وہ کیوں اس موقع پر پڑھے جاتے ہیں؟ اور ان کا نکاح سے کیا تعلق ہے؟ چونکہ خطبے کے یہ الفاظ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، بلکہ آپ نے باقاعدہ سکھائے ہیں، اس لیے ہمیں ان کا مفہوم، مقصد اور پس منظر ضرور سمجھنا چاہیے، تاکہ ہم اس بابرکت سنت کی معنویت سے واقعی آگاہ ہو سکیں۔

ان الفاظ کی ابتداء تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء سے ہوتی ہے اور بحیثیتِ مسلمان

ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ہر اہم کام کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد سے کیا جائے، اس لیے کہ اس کائنات میں کوئی بھی کام اس کی توفیق کے بغیر انجام نہیں پا سکتا، نکاح دو افراد کی زندگی کا اہم ترین دوراہا ہے، جس کے ذریعے یہ دو افراد زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں، اس موقع پر ہمیں بطورِ خاص یہ سکھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور دعا سے یہ سفر شروع کریں، حمد وثنا اور دعا کے لیے جو الفاظ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائے ہیں وہ کتنے خوبصورت اور کتنے جامع ہیں، اس کا اندازہ ان کے ترجمے سے ہوسکتا ہے، اصل عربی الفاظ تو یہ ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔

اور ان کا ترجمہ یہ ہے:

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، ہم اس کی حمد کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں، اسی پر ایمان لاتے اور اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں، ہم اپنی نفسانیت کے شر سے اور اپنے اعمال کی

برائیوں سے اسی کی پناہ مانگتے ہیں، جسے وہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور ہم یہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر اور ان کے تمام آل واصحاب پر اپنی رحمتیں اور سلامتی نازل فرمائے"۔

نکاح کے موقع پر دولہا دلہن ہی نہیں ان کے دونوں خاندان اپنی زندگی کے بڑے نازک دوراہے پر ہوتے ہیں، اگر دل مل جائیں تو زندگی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے، اور اگر خدا نہ کرے دلوں میں ملاپ نہ ہوتو دونوں خاندانوں کے لیے ایک مستقل دردِ سر کھڑا ہوجاتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس سے مدد مانگنے کی تلقین کی گئی ہے اور چونکہ بسا اوقات ازدواجی زندگی کے فتنے خود اپنی بدطینتی یا بداعمالیوں سے پیدا ہوتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی بداعمالیوں کے شر سے اسی کی پناہ مانگی گئی ہے اور اسی سے اس بات کی توفیق طلب کی گئی ہے کہ وہ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرمائے اور گمراہی سے محفوظ رکھے۔ اور یہ ساری حمد وثناء اور دعائیں چونکہ توحید و رسالت پر مستحکم ایمان کے بغیر بے معنی ہیں، اس لیے توحید اور آنحضرت ﷺ کی گواہی کی تجدید کرائی گئی ہے اور آخر میں آنحضرت ﷺ پر درود وسلام بھیجا گیا ہے، کیونکہ آپ ﷺ ہی ہمارے لیے ہدایت کا یہ نور لے کر تشریف لائے۔

یہ ہیں خطبۂ نکاح کے تمہیدی الفاظ، اس کے بعد عموماً خطبے میں قرآن کریم کی تین آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے، پہلی آیت سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۲ ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ○

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت اسلام ہی کی حالت میں آنی چاہیے''

دوسری آیت سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا○

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان (یعنی آدم) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیئے اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو اور رشتہ داریوں کا پاس کرو، بے شک اللہ تمہاری نگرانی کرنے والا ہے''۔

تیسری آیت سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۷۰، ۷۱ ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہا کرو، اللہ تمہارے کام سنوار دے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کر لی اس نے بڑی عظیم کامیابی حاصل کی"۔

۱۷/رجب ۱۴۱۶ھ
۱۰/دسمبر ۱۹۹۵ء

خطبۂ نکاح کی اہمیت

(اصلاحی خطبات ج ۱ ص ۲۴۸)
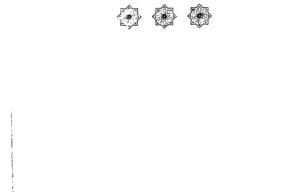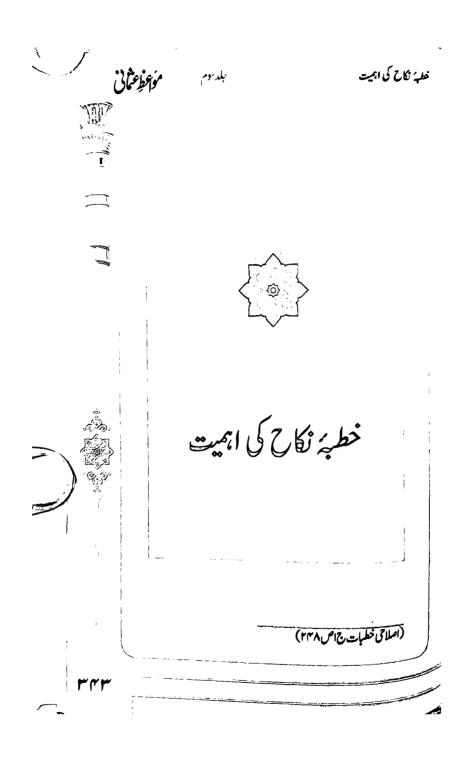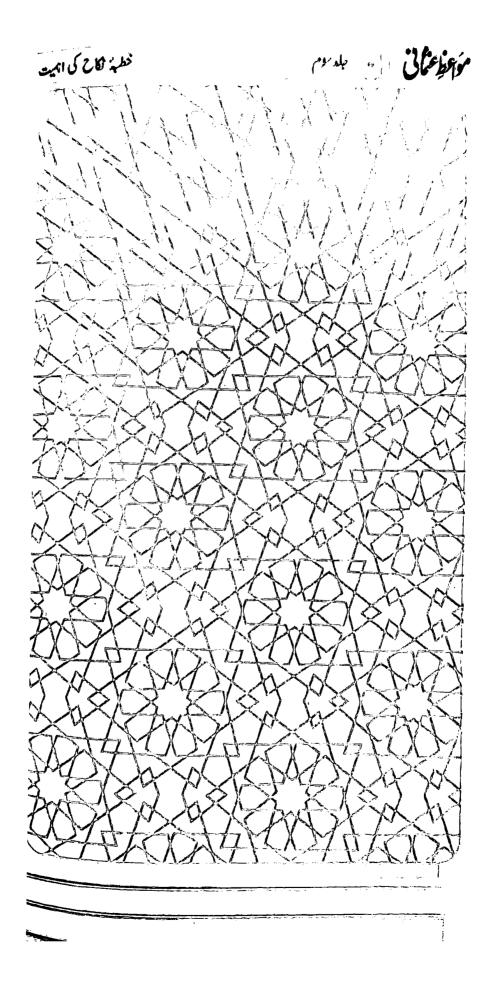
بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ نکاح کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اما بعد!

ابھی ان شاءاللہ پُرمسرت تقریب کا آغاز ہونے والا ہے، جس میں تقریب کے دولہا اور دلہن ان شاء اللہ نکاحِ مسنون کے رشتے میں منسلک ہونے والے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے لیے اس رشتے کو مبارک فرمائے۔ آمین

شادی کی تقریبات

مجھ سے فرمائش کی گئی کہ نکاح پڑھانے سے پہلے کچھ گزارشات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں۔ اگرچہ شادی بیاہ کی تقریبات آج کل کے ماحول کے لحاظ سے کسی وعظ ونصیحت کی مجلس کے لیے موزوں نہیں، لیکن تقریب کو منعقد کرنے والے حضرات کی فرمائش ہے کہ اکثر حاضرین بھی اس موقع پر کوئی دین کی بات سننا چاہتے ہیں۔ اس لیے حکم کی خاطر چند کلمات آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

خطبۂ نکاح کی تین آیات

ابھی ان شاء اللہ نکاح کے خطبے کا آغاز ہوگا اور یہ خطبہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے، نکاح بھی حضورِ اقدس سرورِ دوعالم ﷺ کی سنت ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي"[1]

نکاح میری سنت ہے۔

شرعی اعتبار سے تو نکاح دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول سے منعقد ہوجاتا ہے، لیکن حضور ﷺ نے اس کے لیے جو مسنون طریقہ مقرر فرمایا وہ یہ ہے کہ ایجاب وقبول سے پہلے ایک خطبہ دیا جائے، اس خطبے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد ہوتی ہے، حضور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجا جاتا ہے اور عموماً قرآنِ کریم کی تین آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں۔ حضورِ اقدس ﷺ نے نکاح کے موقع پر یہ تین آیتیں تلقین فرمائیں کہ نکاح کے خطبے میں ان آیات کی تلاوت کی جائے، سب سے پہلے سورۃ النساء کی پہلی آیت تلاوت کی جاتی ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ
وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا

---

(۱) سنن ابن ماجه ۳۰۰/۳ (۱۸۴۶) ذكره ابن الملقن في "خلاصة البدر المنير" (۱۶۹/۲) وقال: رواه ابن ماجه كذلك من رواية عائشة... وهو في الصحيحين من حديث أنس رضي الله تعالى عنه بلفظ: "لكني أصوم وأفطر وأصلي وأنام وأتزوج النساء، فمن رغب عن سنتي فليس مني". طبع الرشد.

وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ①

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا (یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے) اور اسی جان سے اس کی بیوی کو پیدا کیا (یعنی حضرت حوا علیہا السلام کو) اور ان دونوں (آدم اور حوا) کے ذریعے دنیا میں بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے (کہ ساری دنیا کی آبادی انہیں دو مقدس میاں بیوی کی اولاد ہیں) اور اس سے ڈرو جس کے نام کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے (اپنے حقوق کا) مطالبہ کرتے ہو (جب کسی کو دوسرے سے اپنا حق مانگنا ہوتا ہے، تو وہ اکثر اللہ کا واسطہ دے کر مانگتا ہے کہ خدا کے واسطے میرا یہ حق دے دو) اور رشتہ داریوں (کے حقوق) سے بھی ڈرو (یعنی اس کا خیال رکھو کہ رشتہ داریوں کے حقوق پامال نہ ہونے پائیں) اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال و افعال پر نگراں ہیں (وہ دیکھ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور کیا کر رہے ہو)۔''

یہ پہلی آیت ہے جو خطبہ نکاح میں تلاوت کی جاتی ہے۔ دوسری آیت سورۂ آلِ عمران کی ہے۔ وہ یہ ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا

وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾ (۱)

اس کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو (جیسا کہ اس سے) ڈرنے کا حق ہے اور تم نہ مرو (موت نہ آئے) مگر اس حالت میں کہ تم اللہ کے فرماں بردار ہو۔''

تیسری آیت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ نکاح میں ہمارے لیے تعلیم فرمائی، وہ یہ ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا ﴿ۙ۷۰﴾ یُّصۡلِحۡ لَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا ﴿۷۱﴾ (۲)

اس کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور (سیدھی) سچی بات کہو (اگر اللہ سے ڈرو گے اور سیدھی سچی بات کہنے کی عادت ڈالو گے) تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال قبول فرمالیں گے اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمادیں گے، جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے گا، تو وہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔''

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱۰۲)۔
(۲) سورۃ الاحزاب آیت (۷۰-۷۱)۔

تینوں آیتوں میں مشترک چیز

یہ تین آیتیں ہیں جو حضور نبی کریم، سرورِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ نے خطبۂ نکاح کے موقع پر پڑھنے کی تعلیم دی اور ان تینوں میں جو چیز قدرِ مشترک نظر آتی ہے اور جس کا حکم تینوں آیتوں میں موجود ہے، وہ ہے "تقویٰ اختیار کرنا" تینوں آیتوں کا آغاز اس حکم سے ہو رہا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو، یہ عقدِ نکاح کے موقع پر جو تقویٰ کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اور خاص طور پر تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کی جارہی ہے اور اس کو بار بار دہرایا جارہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یوں تو انسان کو دنیا اور آخرت دونوں کو سنوارنے کے لیے تقویٰ ایک لازمی شرط ہے، جس کے بغیر انسان دنیا اور آخرت میں صلاح و فلاح حاصل نہیں کرسکتا۔

تقویٰ کے بغیر حقوق ادا نہیں ہو سکتے

لیکن خاص طور سے نکاح کا رشتہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے حقوق اور اس کی برکات اس وقت تک حاصل نہیں کی جاسکتیں، جب تک دونوں فریقوں کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہو، تجربہ اس بات پر گواہ ہے کہ اگر دلوں میں اللہ کا خوف نہ ہو، اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس نہ ہو اور اس بات کا ادراک نہ ہو کہ ایک دن ہمیں اللہ جل شانہٗ کے حضور حاضر ہو کر اپنے ایک ایک قول و فعل کا جواب دینا ہے، اس وقت تک صحیح معنی میں ایک شخص دوسرے شخص کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ نہ شوہر بیوی کا حق ادا کرسکتا ہے، نہ بیوی شوہر کا حق ادا کرسکتی ہے، نہ ایک رشتے دار دوسرے رشتے دار کا حق ادا کرسکتا ہے۔ نہ دوست دوست کا

حق ادا کرسکتا ہے، یہ حق ادا کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ دلوں میں اللہ کا خوف ہو اور دلوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر جواب دہی کا احساس ہو، ورنہ محض قانون کے ذریعے، محض محکموں اور عدالتوں کے ذریعے حقوق نہیں دلائے جاسکتے۔ جب تک کہ حق دینے والے کے دل میں اس بات کا احساس نہ ہو کہ اگر میں نے دوسرے کا حق مار لیا، تو شاید میں عدالت اور قانون سے بچ جاؤں، لیکن اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر میں جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گا، اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب ہوگا اس سے بچنے کی مجھے تیاری کرنی ہے اور اس سے بچاؤ کا سامان کرنا ہے، جب تک یہ احساس دلوں میں پیدا نہ ہو، ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

تین آیتوں کی تلاوت سنت ہے

اس لیے خاص طور پر نکاح کے موقع پر جو خطبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں تعلیم فرمایا، اس میں ان تین آیتوں کو مقرر فرما کر تقویٰ کی تاکید فرمائی، یوں تو ہر انسان جب مسلمان ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے حضور تقویٰ کا عہد کرتا ہے۔

نئی زندگی کا آغاز

لیکن یہ موقع زندگی کا ایک دوراہا ہے، جس میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے، زندگی میں ایک انقلاب آ رہا ہے، اس وقت میں تقویٰ کے اس عہد کو دوبارہ تازہ کریں اور اس کی تجدید کریں، تو ان تین آیتوں کو تلاوت کرنے کا درحقیقت یہ مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو ہمیں صحیح طور پر سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس موقع پر تقویٰ حاصل کرنے کی فکر اور اس کی کوشش کو تازہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اپریل فُول

مغرب کی بے سوچے سمجھے تقلید کے شوق نے ہمارے معاشرے میں جن رسموں کو رواج دیا، انہی میں سے ایک رسم ''اپریل فُول'' منانے کی رسم بھی ہے، اس رسم کے تحت یکم اپریل کی تاریخ میں جھوٹ بول کر کسی کو دھوکہ دینا اور دھوکہ دے کر اسے بے وقوف بنانا نہ صرف جائز سمجھا جاتا ہے، بلکہ اسے ایک کمال قرار دیا جاتا ہے، جو شخص جتنی صفائی اور چابک دستی سے دوسرے کو جتنا بڑا دھوکہ دے، اُتنا ہی اُسے قابلِ تعریف اور یکم اپریل کی تاریخ سے صحیح فائدہ اٹھانے والا سمجھا جاتا ہے۔

یہ مذاق جسے درحقیقت ''بد مذاقی'' کہنا چاہیے، نہ جانے کتنے افراد کو بلاوجہ جانی اور مالی نقصان پہنچا چکا ہے، بلکہ اس کے نتیجے میں بعض اوقات لوگوں کی جانیں چلی گئی ہیں، کہ انہیں کسی ایسے صدمے کی جھوٹی خبر سنا دی گئی جسے سننے کی وہ تاب نہ لاسکے اور زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

یہ رسم جس کی بنیاد جھوٹ، دھوکے اور کسی بے گناہ کو بلا وجہ بے وقوف

بنانے پر ہے، اخلاقی اعتبار سے تو جیسی کچھ ہے ظاہر ہی ہے، لیکن اس کا تاریخی پہلو بھی ان لوگوں کے لیے انتہائی شرمناک ہے جو حضرت عیسی علیہ السلام کے تقدس پر کسی بھی اعتبار سے ایمان رکھتے ہیں۔

اس رسم کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اس بارے میں مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں، بعض مصنفین کا کہنا ہے کہ فرانس میں سترھویں صدی سے پہلے سال کا آغاز جنوری کے بجائے اپریل سے ہوا کرتا تھا، اس مہینے کو رومی لوگ اپنی دیوی وینس (Venus) کی طرف منسوب کر کے مقدس سمجھا کرتے تھے، وینس کا ترجمہ یونانی زبان میں Aphrodite کیا جاتا تھا اور شاید اسی یونانی نام سے مشتق کر کے مہینے کا نام اپریل رکھ دیا گیا۔ (۱)

لہٰذا بعض مصنفین کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ یکم اپریل سال کی پہلی تاریخ ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ایک بت پرستانہ تقدس بھی وابستہ تھا، اس لیے اس دن کو لوگ جشنِ مسرت منایا کرتے تھے اور اسی جشنِ مسرت کا ایک حصہ ہنسی مذاق بھی تھا جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے اپریل فُول کی شکل اختیار کر گیا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس جشنِ مسرت کے دن لوگ ایک دوسرے کو تحفے دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ کسی نے تحفے کے نام پر کوئی مذاق کیا جو بالآخر دوسرے لوگوں میں بھی رواج پکڑ گیا۔

برٹانیکا میں اس رسم کی ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ۲۱ر مارچ سے موسم میں تبدیلیاں آنی شروع ہوتی ہیں، ان تبدیلیوں کو بعض لوگوں نے اس طرح تعبیر کیا کہ (معاذ اللہ) قدرت ہمارے ساتھ مذاق کر کے ہمیں بیوقوف

---

(۱) (برٹانیکا پندرھواں ایڈیشن ص: ۲۹۲، ج: ۸)۔

بنا رہی ہے، لہٰذا لوگوں نے بھی اس زمانے میں ایک دوسرے کو بے وقوف بنانا شروع کردیا۔[1] یہ بات اب بھی مبہم ہی ہے کہ قدرت کے اس نام نہاد مذاق کے نتیجے میں یہ رسم چلانے سے ''قدرت'' کی پیروی مقصود تھی یا اس سے انتقام لینا منظور تھا؟

ایک تیسری وجہ انیسویں صدی عیسوی کی معروف انسائیکلوپیڈیا ''لاروس'' نے بیان کی ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے، وہ وجہ یہ ہے کہ دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کی بیان کردہ روایات کے مطابق یکم اپریل وہ تاریخ ہے جس میں رومیوں اور یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمسخر اور استہزاء کا نشانہ بنایا گیا، موجودہ نام نہاد انجیلوں میں اس واقعے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، لُوقا کی انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

> ''اور جو آدمی اسے (یعنی حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو) گرفتار کیے ہوئے تھے اس کو ٹھٹھے میں اڑاتے اور مارتے تھے اور اس کی آنکھیں بند کر کے اس کے منہ پر طمانچے مارتے تھے اور اس سے یہ کہہ کر پوچھتے تھے کہ نبوّت (یعنی الہام) سے بتا کہ کس نے تجھ کو مارا؟ اور طعنے مار مار کر بہت سی اور باتیں اس کے خلاف کہیں''[2]

انجیلوں میں ہی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کو یہودی سرداروں اور فقیہوں کی عدالتِ عالیہ میں پیش کیا گیا، پھر وہ انہیں پیلاطس کی

---

(۱) (برٹانیکا، ج:۱، ص:۴۹۶)۔

(۲) (لُوقا ۲۲:۶۳ تا ۶۵)۔

عدالت میں لے گئے کہ ان کا فیصلہ وہاں ہوگا، پھر پیلاطس نے انہیں ہیروڈیس کی عدالت میں بھیج دیا اور بالآخر ہیروڈیس نے دوبارہ فیصلے کے لیے ان کو پیلاطس ہی کی عدالت میں بھیجا۔

لاروس کا کہنا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ایک عدالت سے دوسری عدالت میں بھیجنے کا مقصد بھی ان کے ساتھ مذاق کرنا اور انہیں تکلیف پہنچانا تھا۔ اور چونکہ یہ واقعہ یکم اپریل کو پیش آیا تھا، اس لیے اپریل فُول کی رسم درحقیقت اسی شرمناک واقعے کی یادگار ہے۔

اپریل فُول منانے کے نتیجے میں جس شخص کو بے وقوف بنایا جاتا ہے، اسے فرانسیسی زبان میں Poisson d'avril کہا جاتا ہے جس کا انگریزی ترجمہ April Fish ہے، یعنی اپریل کی مچھلی (۱)۔ گویا جس شخص کو بے وقوف بنایا گیا ہے وہ پہلی مچھلی ہے جو اپریل کے آغاز میں شکار کی گئی، لیکن لاروس نے اپنے مذکورہ بالا موقف کی تائید میں کہا ہے کہ Poisson کا لفظ جس کا ترجمہ "مچھلی" کیا گیا ہے، درحقیقت اسی سے ملتے جلتے ایک اور فرانسیسی لفظ Posion کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی "تکلیف پہنچانے" اور "عذاب دینے" کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ رسم درحقیقت اس عذاب اور اذیت کی یاد دلانے کے لیے مقرر کی گئی ہے جو عیسائی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہنچائی گئی تھی۔

ایک اور فرانسیسی مصنف کا کہنا ہے کہ دراصل Poisson کا لفظ اپنی اصل شکل ہی پر ہے، لیکن یہ لفظ پانچ الفاظ کے ابتدائی حروف کو ملا کر ترتیب دیا گیا

---

(۱) برٹانیکا، ص:۴۹۶، ج:۱

ہے، جن کے معنی فرانسیسی زبان میں بالترتیب عیسیٰ، مسیح، اللہ، بیٹا اور فدیہ ہوتے ہیں۔ گویا اس مصنف کے نزدیک بھی اپریل فول کی اصل یہی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مذاق اڑانے اور انہیں تکلیف پہنچانے کی یادگار ہے۔

اگر یہ بات درست ہے (لاروس وغیرہ نے اسے بڑے وثوق کے ساتھ درست قرار دیا ہے اور اس کے شواہد پیش کیے ہیں) تو غالب گمان یہی ہے کہ یہ رسم یہودیوں نے جاری کی ہوگی، اور اس کا منشاء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تضحیک ہوگی، لیکن یہ بات حیرت ناک ہے کہ جو رسم یہودیوں نے (معاذ اللہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہنسی اڑانے کے لیے جاری کی، اسے عیسائیوں نے کس طرح ٹھنڈے پیٹوں نہ صرف قبول کرلیا، بلکہ خود بھی اسے منانے اور رواج دینے میں شریک ہوگئے، اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عیسائی صاحبان اس رسم کی اصلیت سے واقف ہی نہ ہوں اور انہوں نے بے سوچے سمجھے اس پر عمل شروع کردیا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عیسائیوں کا مزاج و مذاق اس معاملے میں عجیب وغریب ہے، جس صلیب پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے خیال میں سولی دی گئی بظاہر قاعدے سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ان کی نگاہ میں قابلِ نفرت ہوتی کہ اس کے ذریعے حضرت مسیح علیہ السلام کو ایسی اذیت دی گئی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عیسائی حضرات نے اسے مقدس قرار دینا شروع کردیا اور آج وہ عیسائی مذہب میں تقدس کی سب سے بڑی علامت سمجھی جاتی ہے۔

لیکن مندرجۂ بالا تفصیل سے یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ خواہ اپریل فول کی رسم وینس نامی دیوی کی طرف منسوب ہو، یا اسے (معاذ اللہ) قدرت کے مذاق کا ردعمل کہا جائے یا حضرت مسیح علیہ السلام کے مذاق اڑانے کی یادگار، ہر

صورت میں اس رسم کا رشتہ کسی نہ کسی توہم پرستی یا کسی گستاخانہ نظریے یا واقعے سے جڑا ہوا ہے اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ رسم مندرجۂ ذیل بدترین گناہوں کا مجموعہ ہے:

① جھوٹ بولنا۔
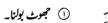
② دھوکہ دینا۔

③ دوسرے کو اذیت پہنچانا۔

④ ایک ایسے واقعے کی یاد منانا جس کی اصل یا تو بت پرستی ہے یا توہم پرستی، یا پھر ایک پیغمبر کے ساتھ گستاخانہ مذاق۔

اب مسلمانوں کو خود فیصلہ کرلینا چاہیے کہ آیا یہ رسم اس لائق ہے کہ اسے مسلمان معاشروں میں اپنا کر اسے فروغ دیا جائے؟

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمارے ماحول میں اپریل فُول منانے کا رواج بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن اب بھی ہر سال کچھ نہ کچھ خبریں سننے میں آ ہی جاتی ہیں کہ بعض لوگوں نے اپریل فُول منایا، جو لوگ بے سوچے سمجھے اس رسم میں شریک ہوتے ہیں، وہ اگر سنجیدگی سے اس رسم کی حقیقت، اصلیت اور اس کے نتائج پر غور کریں گے، تو ان شاء اللہ اس سے پرہیز کی اہمیت تک ضرور پہنچ کر رہیں گے۔

۱۴/شوال ۱۴۱۴ھ

۲۷/مارچ ۱۹۹۴ء

سورج گرہن

(ذکر و فکر ص ۱۷۲)
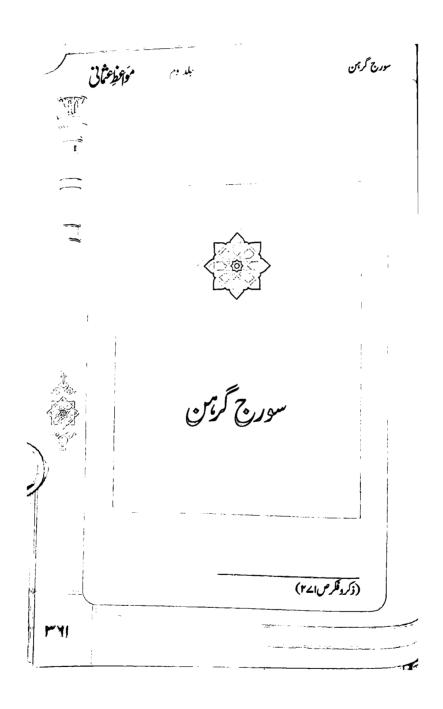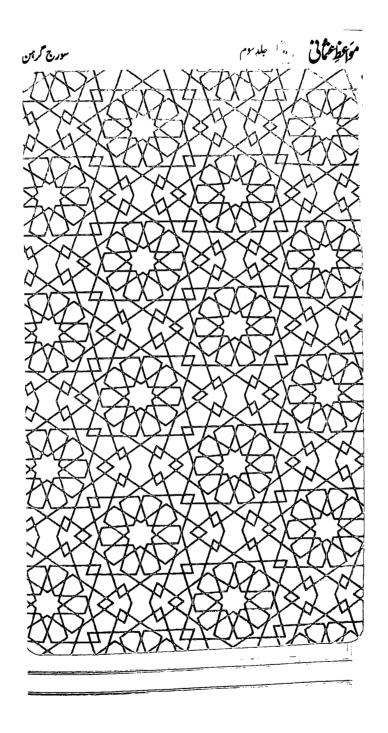
بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورج گرہن

ماہرینِ فلکیات نے اعلان کیا ہے کہ ۲۴ اکتوبر کو پاکستان میں سورج گرہن ہوگا، ملک کے بعض علاقوں میں یہ گرہن مکمل ہوگا اور بعض علاقوں میں جزوی، لیکن کہا جاتا ہے کہ اس علاقے میں اتنا بڑا گرہن تقریباً دوسو سال بعد ہورہا ہے، سورج کو گہن لگنے کا ظاہری سبب یہ ہے کہ زمین اور سورج کے درمیان چاند حائل ہوجاتا ہے، اور اس کی وجہ سے سورج کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ پاتی، گویا چاند کا سایہ زمین پر پڑتا ہے جس کی وجہ سے تاریکی چھا جاتی ہے، اگر سورج گرہن مکمل ہو تو دن کے وقت بالکل رات کا سا سماں پیدا ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات آسمان پر ستارے نظر آنے لگتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گہن کی حالت میں چاند کا جو سایہ زمین پر پڑتا ہے، وہ تقریباً ڈیڑھ سو میل میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اور تقریباً بیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کی مسافت طے کرتا ہے، زمین کے جو حصے اس سائے کی زد میں آتے جاتے ہیں وہاں گہن نظر آتا ہے، یہاں تک کہ جب چاند سورج کے سامنے سے ہٹ

جاتا ہے، تو اس کا سایہ غائب ہوجاتا ہے، گہن کھل جاتا ہے اور سورج کی روشنی معمول کے مطابق زمین تک پہنچنی شروع ہوجاتی ہے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا کرشمہ ہے کہ سورج اپنی جسامت میں چاند سے چار سو گناہ زیادہ ہے، لہٰذا عام حالات میں چاند سورج کو ڈھانپ نہیں سکتا، لیکن ساتھ ہی زمین سے چاند کا فاصلہ سورج کے مقابلے میں چار سو گنا کم ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں یہ دونوں جسم سائز میں برابر نظر آتے ہیں اور جب چاند سورج کی محاذات میں پہنچتا ہے، تو وہ اسے پوری طرح ڈھانپ لیتا ہے، پوری طرح ڈھانپنے کی اسی کیفیت کو مکمل گرہن کہتے ہیں، یہ مکمل گرہن عموماً چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں ہوتا اور ماہرین کے مطابق تاریخ میں مکمل گرہن کی حالت زیادہ سے زیادہ سات منٹ ریکارڈ کی گئی ہے، لیکن مکمل گرہن سے نکلنے کے بعد بھی جزوی گرہن کی حالت بہت دیر تک قائم رہ سکتی ہے۔

حضورِ اقدس ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کے لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ یا تو کسی بڑے آدمی کے انتقال کے موقع پر چاند یا سورج کو گہن لگتا ہے یا پھر چاند اور سورج کا گہن اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ کسی بڑے آدمی کا انتقال ہونے والا ہے یا کوئی اور خطرناک واقعہ پیش آنے والا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس توہم پرستی کی سختی سے تردید فرمائی۔[1] اتفاق سے ۱۰ھ میں جب آنحضرت ﷺ کے صاحب زادے حضرت ابراھیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی، تو اسی دن مدینہ منورہ میں سورج کو گرہن لگ گیا، بعض لوگ

(۱) صحیح البخاری ۲/۳۳(۱۰۴۰)۔

اپنے قدیم خیال کے مطابق یہ سمجھنے لگے کہ یہ گہن آپ ﷺ کے صاحبزادے کی وفات کی وجہ سے لگا ہے، اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ دیا اور اس غلط خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا "چاند اور سورج کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے گہن نہیں لگتا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔"(۱)

ہمارے اوپر چھائی ہوئی اس پُر اسرار کائنات میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان میں سے بہت سے واقعات وہ ہیں جن کے اسباب و نتائج ہمیں سائنس کی محیر العقول ترقی کے باوجود آج تک معلوم نہیں ہوسکے۔ (بلکہ اکثریت ایسے ہی واقعات کی ہے) اور بہت سے واقعات ایسے ہیں کہ ان کے کم از کم ظاہری اسباب ہمارے علم میں آچکے ہیں، لیکن جو کچھ سائنس کے ذریعے ہمارے علم میں آیا ہے وہ ان واقعات کا ظاہری سبب ہے، مگر ان ظاہری اسباب کے پیچھے ان تمام واقعات کی اصل علت و حکمت کیا ہے؟ اس کا پتا ہم اپنی دور بینوں اور مشاہدۂ کائنات کے جدید ترین آلات کے ذریعے نہیں لگا سکتے۔ اگر زمین سے چاند کا فاصلہ چار سو گنے سے زائد ہوتا تو بھی سورج کو مکمل گرہن نہ لگتا یا اگر سورج کا سائز چاند کے مقابلہ میں چار سو گنے سے زائد ہوتا تب بھی چاند اسے نہ ڈھانپ سکتا، سوال یہ ہے کہ سورج کو چاند سے چار سو گنا بڑا بنا کر زمین سے اس کے فاصلے کا تناسب بھی سورج کے مقابلے میں وہی چار سو گنا کم کس نے رکھا؟ اور کیوں رکھا؟ پھر چاند زمین اور دوسرے سیاروں کی گردش کا ایسا حساب

(۱) صحیح مسلم ۶۲۳/۲(۹۰۴)۔

کس نے اور کیوں بنایا کہ ایک مخصوص تاریخ اور وقت پر کسی مخصوص خطے میں گہن واقع ہوتا ہے، دوسری جگہوں اور دوسرے اوقات میں یہ واقعہ پیش نہیں آتا؟ قرآنِ کریم نے سورۃ الرحمن میں واضح طور پر فرمایا ہے کہ

''اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ''(۱)

''سورج اور چاند ایک حساب کے ماتحت ہیں''

یہی وجہ ہے کہ اگر حساب لگانے میں کوئی غلطی نہ ہو، تو سالہا سال پہلے یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت فلاں جگہ پر سورج کو گہن لگے گا (چین کے بادشاہ چنگ کیانگ نے ۲۱۳ء ق م میں دو شاہی نجومیوں کو اس لیے قتل کرادیا تھا کہ وہ گہن کی صحیح پیشین گوئی نہیں کر سکتے تھے) وہ کون ہے جس نے یہ جچا تلا حساب مقرر کرکے ان محیر العقول اجرام فلکی کو اس حساب کے تابع بنادیا؟ وہ کون ہے جس نے گردشوں کا یہ نظام اس طرح سے طے کیا کہ فلاں وقت پر فلاں جگہ ہی گہن نظر آئے؟ اور ان مخصوص مقامات یا مخصوص اوقات کے انتخاب میں کیا راز پنہاں ہے؟

ان سوالات کا ایک سطحی جواب عام طور سے یہ دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اتفاق (Coincidence) کا کرشمہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں غیر شعوری اتفاق کوئی چیز نہیں، کائنات کا کوئی ذرہ اللہ تعالی کی حکمتِ بالغہ کے بغیر حرکت نہیں کرتا، ہمیں چونکہ اپنی محدود عقل کے سہارے اس حرکت کی حکمت ومصلحت کا علم نہیں ہوتا، اس لیے ہم اپنی لاعلمی کو اتفاق کے پردے میں چھپا

---

(۱) سورۃ الرحمن آیت (۵)۔

لیتے ہیں ورنہ ان تمام اتفاقی واقعات کی کوئی نہ کوئی حکمت وہاں موجود ہے جہاں سے پوری کائنات کا نظام کنٹرول ہورہا ہے، اب جن لوگوں کی نگاہیں ان واقعات کے صرف ظاہری اسباب تک محدود ہوکر رہ جاتی ہیں، ان کے لیے تو کائنات کے یہ نظارے ایک دلچسپ تماشے سے زائد کچھ نہیں، لیکن جس شخص کی نگاہ ان ظاہری اسباب سے اوپر بھی جاتی ہے، وہ ان واقعات کو اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ کا دھیان تازہ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے، ان واقعات کے جو ظاہری اسباب تجربے اور مشاہدے سے معلوم ہوجاتے ہیں، انبیاءِ کرام علیہم السلام انہیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، کیونکہ ان اسباب تک پہنچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل تجربے اور مشاہدے کا سرمایہ عطا کیا ہے، جو اسے استعمال کرنا چاہیے، اس کے لیے وحی کی رہنمائی ضروری نہیں، لیکن انبیاءِ کرام علیہم السلام ان ظاہری اسباب سے اوپر کی باتوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں، جن تک پہنچنے میں عقلِ انسانی ناکام رہتی ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط عقیدے کی تردید فرمائی کہ چاند سورج کو کسی شخص کے جینے مرنے سے کوئی تعلق ہے، لیکن اس کی یہ سائنسی وجہ بیان فرمانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ چاند کے بیچ میں حائل ہونے سے سورج گرہن ہوجاتا ہے، کیونکہ اس کا تعلق خالصتاً تجربے اور مشاہدے سے تھا، اس کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہری سبب سے اوپر کی اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی جسے انسان ایسے موقع پر فراموش کرجاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ کے اسی استحضار و اعتراف کی ایک عملی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی کہ جب سورج گرہن ہو تو نمازِ کسوف

ادا کی جائے، ''کسوف'' عربی زبان میں ''سورج گرہن'' کو کہتے ہیں اور ''نمازِ کسوف'' کے معنی ہیں گرہن کی نماز۔

سن ۱۰ھ میں جب مدینہ منورہ میں سورج گرہن ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کرا کر لوگوں کو نماز کے لیے جمع فرمایا، پھر شاید اپنی مبارک زندگی کی سب سے لمبی باجماعت نماز کی امامت فرمائی، جس میں قیام، رکوع اور سجدہ غرض ہر رکن معمول سے کہیں زیادہ طویل تھا، نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا اس میں یہ ہدایت بھی دی کہ آئندہ جب کبھی سورج کو گرہن لگے، تو مسلمانوں کو نماز کسوف ادا کرنی چاہیے [1]۔

''نماز کسوف'' سنتِ موکدہ ہے، بلکہ بعض فقہائے کرام نے اسے واجب کہا ہے [2]، لہٰذا ۲۴ اکتوبر کو اس نماز کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے، یہ نماز ہر اس جگہ باجماعت ادا کی جاسکتی ہے جہاں جمعہ ہوتا ہے، اس کے لیے اذان یا اقامت مسنون نہیں، البتہ لوگوں کو جمع کرنے کے لیے عام لفظوں میں اعلان کیا جاسکتا ہے، آنحضرت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ کسوف کے موقع پر جو اعلان فرمایا تھا، اس کے الفاظ یہ تھے:

"الصَّلَاةُ جَامِعَةٌ" (۳)

نماز باجماعت ہونے والی ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۶۲۳/۲ (۹۰٤)۔

(۲) ملاحظہ ہو بدائع الصنائع ۲۸۰/۱ فصل فی صلاۃ الکسوف والخسوف، ط دار الکتب العلمیۃ۔

(۳) صحیح البخاری ۳٤/۲ (۱۰٤۵) و ۳٦/۲ (۱۰۵۱) و صحیح مسلم ٦۲۰/۲ (۹۰۱)۔

لیکن اس اعلان کے یہ الفاظ شرعاً مقرر نہیں، دوسرے لفظوں میں بھی اعلان کیا جاسکتا ہے۔

نمازِ کسوف کی دو رکعتیں ہوتی ہیں اور عام نمازوں ہی کی طرح پڑھی جاتی ہیں، ان کا کوئی الگ طریقہ مقرر نہیں ہے، البتہ سنت یہ ہے کہ امام اس میں طویل قراءت کرے، طویل رکوع کرے اور طویل سجدہ کرے، نبی کریم ﷺ نے ایک رکعت میں تقریباً پوری سورۂ بقرہ کی تلاوت فرمائی تھی[1]، یہ قراءت دن کی دوسری نمازوں کی طرح آہستہ بھی ہوسکتی ہے اور اگر مقتدیوں کو اکتاہٹ کا اندیشہ ہو تو رات کی نمازوں کی طرح بلند آواز سے بھی ہوسکتی ہے۔ نماز کے بعد سورج کے گہن سے نکلنے تک دعا اور ذکر و تسبیح کرتے رہنا مستحب ہے، نیز گہن کے دن آنحضرت ﷺ نے صدقہ کثرت سے دینے کی ترغیب بھی دی ہے[2]۔

اگر کوئی شخص کسی وجہ سے نمازِ کسوف کی جماعت میں شامل نہ ہوسکے، تو گھروں میں یا جہاں کہیں ہو تنہا بھی یہ نماز پڑھ سکتا ہے اور خواتین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے گھروں میں تنہا یہ نماز ادا کریں، دو رکعتیں نمازِ کسوف کی نیت سے پڑھیں اور اس میں جتنی لمبی سورتیں یاد ہوں، وہ پڑھیں، لمبے رکوع کریں، لمبے سجدے کریں اور باقی وقت زیادہ سے زیادہ دعا اور ذکر و تسبیح میں صرف کریں۔

۲۶/ جمادی الاولی ۱۴۱۶ھ

۲۲/ اکتوبر ۱۹۹۵ء

(۱) سنن ابی داود ۳۰۹/۱ (۱۱۸۷) والحدیث سکت عنه ابو داود ـ وذکره ابن الملقن فی "البدر المنیر" ۱۳۱/۵ وقال ورواته کلهم ثقات ـ طبع دار الهجرة الریاض۔

(۲) صحیح البخاری ۳۸/۲ (۱۰۵٤)

جمعۃ الوداع کی شرعی حیثیت

(اصلاحی خطبات ج ۱۲ اص ۶۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمعۃ الوداع کی شرعی حیثیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾''(۱)

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۱۸۵)۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ، وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ، وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

مبارک مہینہ

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! اللہ جل شانہ کا بڑا انعام و کرم ہے کہ اس نے ہمیں اور آپ کو ایک رمضان کا مہینہ اور عطا فرمایا۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی گھٹائیں بندوں پر جھوم جھوم کر برستی ہیں، جس میں اللہ جل شانہ کی رحمت بندوں کی مغفرت کے لیے بہانے ڈھونڈتی ہے، چھوٹے چھوٹے عمل پر اللہ جل شانہ کی طرف سے رحمت اور مغفرت کے وعدے ہیں، یہ مبارک مہینہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا اور آج اس مبارک مہینے کا آخری جمعہ ہے اور اس مبارک مہینے کے ختم ہونے میں چند دن باقی ہیں۔

آخری جمعہ اور خاص تصورات
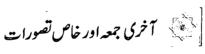
اس آخری جمعہ کے بارے میں بعض لوگوں کے ذہنوں میں کچھ خاص تصورات ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے، عام طور پر ہمارے معاشرے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ آخری جمعہ جس کو جمعۃ الوداع بھی کہتے ہیں، یہ کوئی مستقل تہوار ہے اور اس کے کچھ خاص احکام ہیں، اس کی کوئی خاص عبادتیں ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمائیں ہیں اور لوگوں نے اس دن عبادت کرنے کے مختلف طریقے گھڑ رکھے ہیں۔ مثلاً جمعۃ الوداع کے دن اتنی رکعتیں نوافل پڑھنی چاہیے اور ان رکعتوں میں فلاں فلاں سورت پڑھنی چاہیے۔

جمعۃ الوادع کوئی تہوار نہیں

خوب سمجھ لیجیے کہ اس قسم کی کوئی ہدایت حضورِ اقدس سرورِ دو عالم ﷺ نے نہیں دی، جمعۃ الوداع بحیثیت جمعۃ الوداع کوئی تہوار نہیں، نہ اس کے لیے ہمارے نبی کریم ﷺ نے کوئی احکام الگ سے عطا فرمائے، نہ اس دن میں عبادت کا کوئی خاص طریقہ بتلایا، نہ اس دن میں کسی خاص عمل کی تلقین فرمائی جو عام دنوں میں نہ کیا جاتا ہو، بلکہ یہ عام جمعوں کی طرح ایک جمعہ ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ویسے تو رمضان المبارک کا ہر لمحہ ہی قابلِ قدر ہے، لیکن رمضان کا جمعہ بڑا قابلِ قدر ہے، حدیث شریف کے بیان کے مطابق رمضان سید الشہور ہے[1]، یعنی تمام مہینوں کا سردار ہے اور جمعہ سید الایام ہے[2]، یعنی تمام دنوں کا سردار ہے، لہٰذا جب رمضان المبارک میں جمعہ کا دن آتا ہے تو اس دن میں دو فضیلتیں جمع ہو جاتی ہیں، ایک رمضان کی فضیلت اور دوسری جمعہ کی فضیلت، اس لحاظ سے رمضان کا ہر جمعہ بڑا قابلِ قدر ہے۔

یہ آخری جمعہ زیادہ قابلِ قدر ہے
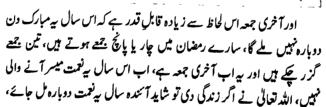
اور آخری جمعہ اس لحاظ سے زیادہ قابلِ قدر ہے کہ اس سال یہ مبارک دن دوبارہ نہیں ملے گا، سارے رمضان میں چار یا پانچ جمعے ہوتے ہیں، تین جمعے گزر چکے ہیں اور یہ اب آخری جمعہ ہے، اب اس سال یہ نعمت میسر آنے والی نہیں، اللہ تعالیٰ نے اگر زندگی دی تو شاید آئندہ سال یہ نعمت دوبارہ مل جائے،

(۱) شعب الایمان للبیہقی ۲٤۲/۵ (۳۳٦٤)۔وانظر الحدیث مع شواھد فی "مجمع الزوائد" ۱٤۰/۳باب فی شھور البرکۃ وفضل شھر رمضان۔

(۲) سنن ابن ماجہ ۳٤٤/۱ (۱۰۸٤) طبع دار احیاء الکتب العربیۃ۔وقال البوصیری فی مصباح الزجاجۃ ۱۲۹/۱ ہذا اسناد حسن۔

اس لیے یہ ایک نعمت ہے جو ہاتھ سے جا رہی ہے، اس کی قدر و منزلت پہچان کر انسان جتنا بھی عمل کر لے وہ کم ہے، بس اس جمعۃ الوداع کی یہ حقیقت ہے، ورنہ یہ تو کوئی تہوار نہیں ہے، نہ اس کے اندر کوئی خاص عبادت اور کوئی خاص عمل مقرر ہے۔

جمعۃ الوداع اور جذبۂ شکر

البتہ جب جمعۃ الوداع کا دن آتا ہے تو دل میں دو قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، ہر مؤمن کے دل میں یہ جذبات پیدا ہونے چاہییں، ایک مسرت اور شکر کا جذبہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں رمضان المبارک عطا فرمایا اور رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کی، تراویح پڑھنے کی اور تلاوت کرنے کی توفیق عطا فرمائی، یہ بات قابلِ شکر اور قابلِ مسرت ہے، اس پر جتنا شکر کیا جائے کم ہے، اس لیے کہ نہ جانے کتنے اللہ کے بندے ایسے ہیں جو گزشتہ سال ہمارے ساتھ روزوں میں تراویح میں شریک تھے، لیکن اس سال وہ زمین کے نیچے جا چکے ہیں، ان جانے والوں سے اس رمضان کے ایک ایک لمحے کی قدر و قیمت پوچھیے کہ وہ یہ حسرت کر رہے ہیں کہ کاش کہ ان کو رمضان کے کچھ لمحات اور مل جاتے تو وہ اپنے اعمال میں اضافہ کر لیتے، لیکن ان کا وقت ختم ہو چکا، اب حسرت کے سوا کوئی چارہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں رمضان المبارک کے یہ لمحات عطا فرما رکھے ہیں۔

غافل بندوں کا حال

اور اس لحاظ سے اللہ جل شانہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ بہت سے بندے

ایسے ہیں کہ جن کو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کب رمضان آیا اور کب چلا گیا، العیاذ باللہ العظیم، نہ ان کو روزہ رکھنے سے کوئی غرض، نہ تراویح پڑھنے سے کوئی مطلب، اللہ بچائے! آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں، رمضان کے آنے پر ان کے نظام الاوقات میں، ان کے کھانے پینے کے اوقات میں اور ان کے سونے اور جاگنے کے اوقات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ایسے غافل لوگوں میں شامل نہیں فرمایا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اے اللہ! آپ نے ہمیں روزہ رکھنے کی توفیق بخشی، اگر ہم بھی ان میں شامل ہو جاتے، تو نہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا، اس لیے شکر ادا کرنے اور مسرت کا موقع ہے۔

نماز روزے کی ناقدری مت کرو

ہمارے ذہنوں میں بعض اوقات جو خیال آتے ہیں کہ ہم نے روزہ، تو رکھ لیا لیکن روزے کا حق نہیں ادا کیا، تراویح تو پڑھ لی، لیکن اس کا صحیح حق ادا نہ ہو سکا، تراویح میں نہ خشوع تھا اور نہ خضوع تھا، دل کہیں تھا، دماغ کہیں تھا، اسی حالت میں ہم نے تراویح ادا کر لی، یہ خیال لا کر بعض لوگ اس روزے کی اور تراویح کی ناقدری کرتے ہیں۔ ارے بھائی! یہ ناقدری کی چیز نہیں، یہ نماز کیسی بھی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے دربار میں حاضری کی توفیق عطا فرما دی، یہ توفیق بذاتِ خود نعمت ہے، پہلے اس توفیق پر شکر ادا کرو، اس حاضری کی ناقدری مت کرو، یہ نہ کہو کہ ہم نے کیا نماز پڑھی، ہم نے تو ٹکریں مار لیں اور اٹھک بیٹھک کر لی، ارے اللہ جل شانہ کو تمہارے ساتھ کچھ خیر ہی کا معاملہ کرنا تھا، اس لیے تمہیں مسجد کے دروازے پر لے آئے، اگر اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ خیر مقصود نہ ہوتی، تو تمہیں ان لوگوں میں شامل کر دیتے جنہوں نے کبھی

مسجد کی شکل تک نہیں دیکھی، اس لیے ان عبادات کی ناقدری مت کرو، بلکہ ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

سجدہ کی توفیق عظیم نعمت ہے

ہم نے جیسی تیسی نماز پڑھ لی نہ اس میں خشوع تھا، نہ خضوع تھا، وہ نماز بے جان و بے روح سہی لیکن ؎

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جسے ترے آستاں سے نسبت ہے

یہ سجدہ جسے اللہ تعالیٰ کے آستانے پر کرنے کی توفیق ہو گئی، یہ بھی ایک نعمت ہے، پہلے اس کا شکر ادا کر لو، بے شک ہم اس کا حق نہیں ادا کر پائے، بے شک ہماری طرف سے اس میں کوتاہیاں رہیں، لیکن ان کوتاہیوں کا علاج یہ نہیں کہ ان عبادات کی ناقدری شروع کر دو، بلکہ ان کوتاہیوں کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرو، استغفار کرو اور یہ کہو کہ اے اللہ! آپ نے مجھے عبادت کی توفیق عطا فرمائی، اس پر آپ کا شکر ہے، لیکن مجھ سے اس عبادت میں کوتاہی ہوئی، اے اللہ! میں اس پر استغفار کرتا ہوں۔

أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّي مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ

اس استغفار کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان کوتاہیوں کا ازالہ فرما دیں گے۔

آج کا دن ڈرنے کا بھی ہے

لہٰذا آج کا دن ایک طرف تو خوشی اور شکر ادا کرنے کا دن ہے، دوسری طرف یہ ڈرنے کا دن ہے، اس بات کا ڈر جس کا بیان ایک حدیث میں آیا ہے،

وہ حدیث یہ ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تا کہ جمعہ کا خطبہ دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے منبر پر خطبہ دیا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر تین سیڑھیوں پر مشتمل تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے، جب حضرتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو انہوں نے سوچا کہ سب سے اوپر والی سیڑھی پر خطبہ دینا ادب کے خلاف ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں دوسری سیڑھی پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا شروع کر دیا، جب حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات ہو گئی اور حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے سوچا کہ میرے لیے تو اس دوسری سیڑھی پر کھڑے ہو کر بھی خطبہ دینا ادب کے خلاف ہے جس پر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں تیسری اور آخری سیڑھی پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا شروع کر دیا، اس کے بعد سے آج تک یہ معمول چلا آ رہا ہے کہ خطباء تیسری سیڑھی پر خطبہ دیتے چلے آ رہے ہیں[1]۔

تین دعاؤں پر تین مرتبہ آمین

بہر حال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ایک دن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے تشریف لائے، اس دن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا، تو فرمایا: ''آمین''، جب دوسری سیڑھی پر قدم رکھا، تو پھر فرمایا: ''آمین''، جب تیسری سیڑھی پر قدم رکھا،

(۱) الدرة الثمينة فی اخبار المدينة لابن النجار ۹۷/۱ طبع شركة دار ارقم. والمسالك فی شرح موطا مالك ۴۵۲/۲ طبع دار الغرب الاسلامی.

تو پھر فرمایا: ''آمین''، صحابہ کرام کو تعجب ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا تو کوئی مانگی نہیں، لیکن تینوں سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے آمین فرمایا، بعد میں صحابہ کرام نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے تین مرتبہ آمین فرمایا، اس کی کیا وجہ ہے؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ جب میں منبر پر چڑھنے کے لیے آیا اور پہلی سیڑھی پر قدم رکھا، تو حضرتِ جبریل امین علیہ السلام میرے سامنے آئے، انہوں نے ایک دعا کی اور میں اس دعا پر آمین کہی، جب میں نے دوسری سیڑھی پر قدم رکھا، تو اس وقت انہوں نے دوسری دعا کی، میں نے اس پر آمین کہی، جب میں نے تیسری سیڑھی پر قدم رکھا، تو انہوں نے تیسری دعا کی، میں نے اس پر آمین کہی۔ (۱)

ان دعاؤں کی اہمیت کے اسباب

آپ ان دعاؤں کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ دعا مانگنے والے حضرتِ جبرئیل امین علیہ السلام اور ان دعاؤں پر آمین کہنے والے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو سید الاولین والآخرین ہیں اور جمعے کا دن، خطبے کا وقت، مقام بھی مسجدِ نبوی، اس دعا کی قبولیت میں کسی بھی انسان کو شک نہیں ہوسکتا، بلکہ یہ دعا ضرور قبول ہوگی، مگر ڈرنے کی بات یہ ہے کہ یہ دعا درحقیقت بد دعا تھی، حضرتِ جبرئیل امین علیہ السلام نے بد دعا مانگی اور حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر آمین کہی، وہ بد دعائیں کیا تھیں؟

---

(۱) الأدب المفرد للبخاری ص ٢٢٥ (٦٤٦) طبع دار البشائر الإسلامية. وصحيح ابن خزيمة ١٩٢/٣ (١٨٨٨). والمستدرك للحاكم ١٧٠/٤ (٧٢٦٦)، وصححه ووافقه الذهبی فی "التلخيص".

والدین کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کرنا

جس وقت حضورِ اقدس سرورِ دو عالم ﷺ نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا، اس وقت حضرتِ جبرئیل امین علیہ السلام نے یہ بد دعا کی کہ اس کی ناک خاک آلود ہو جائے، یعنی وہ شخص تباہ ہو جائے جس نے اپنے والدین کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، پھر بھی اپنی مغفرت نہ کرا سکا، یعنی جس شخص کے والدین بڑھاپے کی حالت میں پہنچ چکے ہوں، اس کے لیے جنت حاصل کرنا آسان ہے کیونکہ اگر وہ ایک قدم بھی والدین کی خدمت میں اٹھالے گا اور ان کا دل خوش کر دے گا، تو اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہونا شروع ہو جائیں گی، حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مرتبہ محبت کی نگاہ سے والدین کو دیکھ لے، تو اس کے لیے ایک مقبول حج کا ثواب لکھا جائے گا[1]، لہٰذا جب ایک نگاہ ڈالنے کا یہ ثواب ہے، تو ان کی خدمت اور اطاعت کرنے کا کیا اجر و ثواب ہو گا، اس کا اندازہ آپ لگائیں اور والدین انسان کی دنیا و آخرت کی صلاح و فلاح کے ضامن ہیں اور ماں باپ کا معاملہ یہ ہے کہ ان کو ذرا خوش کر دو، تو وہ تمہیں ڈھیروں دعائیں دیتے ہیں، اس لیے والدین کی خدمت اور اطاعت کر کے جنت حاصل کرنا بہت آسان، لیکن جس شخص نے والدین کو ان کے بڑھاپے کی حالت میں پانے کے باوجود اپنی مغفرت کا سامان نہیں کیا، وہ شخص برباد ہو جائے۔

---

(۱) شعب الإيمان للبيهقي ۲۶۵/۱ (۷۴۷۲)، ورسائل ابن ابی الدنيا ۳۳۷/۱ (۲۱٤) طبع المكتبة العصرية، والحديث أخرجه الذهبي في "السير" ۲۰۸/۱۹ وقال: هذا منكر، طبع مؤسسة الرسالة.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر درود شریف نہ پڑھنا

پھر جس وقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری سیڑھی پر قدم رکھا، تو اس وقت حضرت جبرئیلِ امین علیہ السلام نے یہ بد دعا فرمائی کہ اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جائے یعنی وہ شخص تباہ ہو جائے جس کے سامنے حضور نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا، مگر اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہیں بھیجا، ظاہر بات ہے کہ اس کائنات میں ایک صاحبِ ایمان کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا کوئی محسن اور نہیں ہوسکتا، پوری انسانیت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا محسن کوئی پیدا نہیں ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم قربانیاں دے کر، فقر و فاقہ اٹھا کر، تنگیاں اور مصیبتیں جھیل کر، اللہ تبارک وتعالیٰ کی راہ میں لڑ کر تمہارے لیے ایمان کی دولت چھوڑ گئے، اب تمہارے دل میں اس احسان کا اتنا بھی احساس نہ ہو کہ جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود ہی نہ بھیجے، یہ کتنی بڑی ناشکری اور احسان فراموشی ہے، جس پر جبرئیل امین علیہ السلام نے بد دعا دی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کہی۔

درود پڑھنے میں بخل نہ کریں

درود شریف کا کوئی بھی صیغہ پڑھ لینے سے یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے اور "صلی اللہ علیہ وسلم" بھی ان میں سے ایک درود ہے، اس لیے مسلمانوں کا یہ معمول رہا ہے کہ جب بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا ہے، تو اس پر صلی اللہ علیہ وسلم ضرور کہتے ہیں، الحمد للہ! اب بھی یہ معمول جاری ہے، لہٰذا صلی اللہ علیہ وسلم کہنے سے بھی یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے، البتہ ہمارے یہاں جو یہ رواج چل پڑا ہے کہ لکھتے

وقت پورا ''صلی اللہ علیہ وسلم'' لکھنے کی بجائے صرف ''صلعم'' لکھ دیا یا صرف ''ص'' لکھ دیا، اس طریقے سے یہ فریضہ ادا نہیں ہوتا، یہ سارا بخل کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرنا ہے؟ یہ طریقہ قابلِ ترک ہے، اس کی بجائے بولنے میں بھی اور لکھنے میں بھی پورا ''صلی اللہ علیہ وسلّم'' ادا کرنا چاہیے، ورنہ اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں ہم اس بد دعا کے مستحق نہ بن جائیں۔

رمضان گزر جانے کے باوجود مغفرت نہ ہونا

جب تیسری سیڑھی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم رکھا تو حضرتِ جبرئیل امین علیہ السلام نے یہ بد دعا فرمائی کہ اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جائے یعنی وہ شخص تباہ ہو جائے جس پر پورا رمضان المبارک کا مہینہ گزر جائے اور وہ اپنی مغفرت نہ کرا لے، لہٰذا آج کا دن ڈرنے کا ہے اس بات سے کہ خدا نہ کرے کہیں ہم اس حدیث کی وعید کا مصداق نہ بن جائیں کہ سارا رمضان گزر جائے اور ہم اپنی مغفرت نہ کرا لیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کا مہینہ تمہارے گناہ دھونے کے لیے اور تمہارا میل کچیل صاف کرنے کے لیے عطا فرمایا تھا اور تمہارے گناہوں کو مغفرت کے تالاب میں ڈبو کر پاک صاف کرنے کے لیے دیا تھا، اس مہینے میں مغفرت کرانا کوئی مشکل نہیں تھا، ساری رات اللہ کا منادی آواز لگا رہا تھا کہ ہے کوئی مغفرت مانگنے والا جس کی میں مغفرت کروں؟ ہے کوئی رزق مانگنے والا جس کو میں رزق دوں؟ ہے کوئی مبتلائے آزار جس کی آزار اور مصیبت کو میں رفع کروں؟ رات بھر اللہ کا منادی یہ ندائیں لگا رہا تھا[1]۔

(۱) شعب الإیمان للبیهقی ۲۲۱/۵ (۳۳۳٤) وذکره المنذری فی "الترغیب" ۶۳/۲ وقال: رواه البیهقی، وهو حدیث حسن لا بأس به فی المتابعات، فی إسناده ناشب بن عمرو الشیبانی، وُثِّقَ، وتکلم فیه الدار قطنی.

مغفرت کے بہانے

اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم روزے رکھ لو گے، تو تمہارے پچھلے گناہ معاف کر دیں گے، تراویح کا اہتمام کر لو گے، تو تمہارے پچھلے گناہ معاف کر دیں گے، کسی اللہ کے بندے کو افطار کرا دو گے، تو اس پر تمہاری مغفرت کر دیں گے، جو روزہ تم نے رکھا ہے اس کے لمحے لمحے پر عبادت لکھی جا رہی ہے اور تمہارے گناہوں کی مغفرت ہو رہی ہے، بہر حال! اللہ تعالیٰ نے تو تمہاری مغفرت کے لیے اتنے بہانے بنا رکھے تھے، لہٰذا مغفرت حاصل کرنے کا اس سے زیادہ اچھا موقع نہیں تھا، جس نے یہ موقع بھی گنوا دیا اس کے لیے جبرئیل علیہ السلام نے یہ بددعا فرمائی، اس لیے یہ ڈرنے کا دن ہے۔

اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھو

لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید یہ رکھو کہ ان شاء اللہ ہم اس بددعا میں شامل نہیں، جب اس ذات نے روزے رکھنے کی توفیق بخشی اور یہ وعدہ فرمایا کہ جو شخص ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے روزہ رکھے گا، میں اس کے سارے پچھلے گناہ بخش دوں گا، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی توقع اور امید رکھنی چاہیے کہ ان شاء اللہ ہماری بھی مغفرت فرما دیں گے، البتہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے ضرور ڈرتے رہو، اسی کا نام ایمان ہے، ”الایمانُ بَینَ الخَوفِ وَالرَّجَاءِ“ یعنی ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔

عید گاہ میں سب کی مغفرت فرمانا

حدیث شریف میں آتا ہے جب مسلمان سارا مہینہ روزہ رکھنے اور تراویح پڑھنے کے بعد عید کی نماز کے لیے عید گاہ میں جمع ہوتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس وقت اپنے فرشتوں پر فخر فرماتے ہیں کہ اے فرشتو! تم تو کہتے تھے کہ ابن آدم زمین پر جا کر فساد مچائے گا، آج اس ابن آدم کو عید گاہ کے میدان میں دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ ایک مزدور جس نے اپنی مزدوری پوری کر لی ہو، اس کو کیا صلہ ملنا چاہیے؟ جواب میں فرشتے کہتے ہیں کہ اے اللہ! جس مزدور نے اپنا کام پورا کر لیا ہو تو اس کا صلہ یہ ہے کہ اس کو پوری پوری مزدوری دے دی جائے، اس میں کوئی کمی نہ کی جائے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنی عزت اور جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں، یہ بندے جو میرے سامنے ہیں ان پر رمضان میں جو فریضہ عائد کیا تھا وہ انہوں نے پورا کر دیا، اب یہ مجھے پکارنے کے لیے عید گاہ میں جمع ہوئے ہیں اور مجھ سے دعا کرنے کے لیے آئے ہیں، میں اپنی عزت و جلال کی، اپنی بادشاہت اور اپنے کرم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج کے دن میں ان کی سب دعائیں قبول کروں گا اور ان کو میدانِ عید سے اس طرح واپس بھیجوں گا کہ ان سب کی مغفرت ہو چکی ہو گی اور ان کی سیئات کو بھی حسنات سے بدل دوں گا۔[1]

---

(۱) شعب الایمان للبیہقی ۲۹۰/۵ (۳٤٤٤) وقال تفرد به محمد بن یحیی ہذا عن اصرم بن حوشب الهمدانی، والضعفاء الکبیر للعقیلی ۸۸٦/۳ فی ترجمة عبد الصمد، وقال: أحادیثه مناکیر لا یعرف أکثرها إلا به، وقال عن البخاری: "منکر الحدیث".

ورنہ توفیق کیوں دیتے؟

اگر میدانِ عید میں بلا کر یہ نوازش فرمانی مقصود نہ ہوتی، ہماری اور آپ کی مغفرت کرنا مقصود نہ ہوتی، تو پھر رمضان میں روزے رکھنے اور تراویح پڑھنے کی توفیق ہی کیوں دیتے؟ مسجد میں آنے کی اور تلاوت کرنے کی توفیق ہی کیوں دیتے؟ جب انہوں نے ان عبادات کی توفیق دی ہے تو ان کی رحمت سے امید یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ خیر کا ارادہ فرمایا ہے، مغفرت کا ارادہ فرمایا ہے، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہماری مغفرت کا ارادہ فرما رہے ہوں اور ہم اس فکر میں لگے ہوں کہ کسی طرح اور گناہوں میں اضافہ کر لیں، اس لیے کہ گناہ کرنے پر لگے ہوئے ہیں اور اپنے اعمال کے ذریعے اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہمیں مغفرت نہیں چاہیے۔

عید کے دن گناہوں میں اضافہ

چنانچہ جیسے ہی عید کا دن آیا، بس گناہوں کا سیلاب اُمڈ آیا، نہ اللہ کا کوئی خیال، نہ اللہ کے رسول کی کوئی فکر، نہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا کوئی احساس، اس عید کے دن گناہوں پر گناہ ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کی جا رہی ہیں، گانا بجانا جو کافروں کے خوشیاں منانے کا طریقہ تھا وہ ہم نے اختیار کر لیا، خواتین نے بے پردگی اور بے حجابی اختیار کر لی اور اللہ تعالیٰ کے ایک ایک حکم کی خلاف ورزی کر کے عید کا دن منایا جا رہا ہے، یہ کیسی عید ہوئی؟ اللہ تعالیٰ مغفرت کا ارادہ فرما رہے ہیں، لیکن ہم نے گناہ کر کے جہنم میں جانے کا ارادہ کر رکھا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس انجام سے محفوظ رکھے، آمین۔

مسلمانوں کی عید اقوامِ عالم سے نرالی ہے

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو عید عطا فرمائی ہے، وہ سارے اقوامِ عالم کی عیدوں سے نرالی ہے، ساری دنیا میں جو عیدیں منائی جاتی ہیں، وہ کسی تاریخی واقعے کی یاد میں منائی جاتی ہیں، مثلاً عیسائی حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش پر "کرسمس" کا دن مناتے ہیں، یہ پیدائش ایک واقعہ ہے، یقینی طور پر یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۲۵ دسمبر کو پیدا ہوئے تھے، بلکہ ان کے جانے کے تین سو سال بعد لوگوں نے یہ تاریخ مقرر کر لی، اسی طرح دنیا بھر کے جتنے ادیان ہیں، ان کے تہوار ماضی کے کسی نہ کسی واقعے سے وابستہ ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو تہوار عطا فرمائے ہیں وہ ماضی کے کسی واقعے سے وابستہ نہیں ہیں، بلکہ یہ تہوار اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر عطا فرمائے ہیں جس موقع پر ہر مسلمانوں کے لیے خوشی کا واقعہ پیش آتا ہے، چنانچہ عید الفطر اس موقع پر عطا فرمائی جب مسلمان روزے کی عظیم الشان عبادت کی تکمیل کرتے ہیں، اس طرح ہر سال یہ نعمت مل رہی ہے اور خوشی حاصل ہو رہی ہے اور اس پر شکر کے طور پر عید آ رہی ہے اور عید الاضحیٰ اس موقع پر عطا فرمائی جب مسلمان دوسری عظیم الشان عبادت یعنی حج کی تکمیل کرتے ہیں۔

عید کی خوشی کا مستحق کون ہے؟

لہٰذا تم نے چونکہ رمضان المبارک کے روزے رکھے ہیں اور تم نے تراویح پڑھی ہیں، اس لیے تم اس عید الفطر کے انعام کے مستحق ہو اور تم نے چونکہ حج کی عبادت انجام دی ہے، اس لیے اس عید الاضحیٰ کے انعام کے مستحق ہو، اللہ تعالیٰ

نے مسلمانوں کو جو خوشی منانے کا طریقہ عطا فرمایا ہے وہ بھی دنیا کی ساری قوموں سے نرالہ ہے، وہ یہ کہ عید کی نماز کے لیے میدان میں آجاؤ، دوسرے ایام میں مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے، لیکن عید کے دن میدان میں نماز پڑھنا افضل ہے، لہٰذا عید کے دن نوازش اور رحمت کی بارش کرنے کے لیے میدان میں بلایا اور میدان میں آنے سے پہلے صدقۃ الفطر ادا کر دو، تاکہ جو لوگ غریب ہیں، جن کے چولہے ٹھنڈے ہیں، ان کو کم از کم اس دن یہ فکر نہ ہو کہ کھانا کہاں سے آئے گا؟ خوشی منانے کا یہ نرالہ انداز عطا فرمایا، لیکن ہم نے یہ طریقہ چھوڑ کر کافروں کا طریقہ اختیار کر لیا، جس طرح وہ لوگ گانے بجاتے ہیں اور فحاشی اور عریانی میں اپنے تہواروں کے اوقات صرف کرتے ہیں، ہم نے بھی اسی طرح شروع کر دیا، اللہ تعالیٰ تو مغفرت فرمانا چاہتے ہیں، لیکن ہم نے گناہ کے کام کرنے شروع کر دیے، یہ بالکل مناسب نہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو صحیح فکر عطا فرمائے اور رمضان کی برکات عطا فرمائے اور عید کی صحیح خوشیاں عطا فرمائے اور گناہوں، نافرمانیوں اور معصیتوں سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین

جشنِ آزادی کے دن

(ذکر و فکر ص ۳۵۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
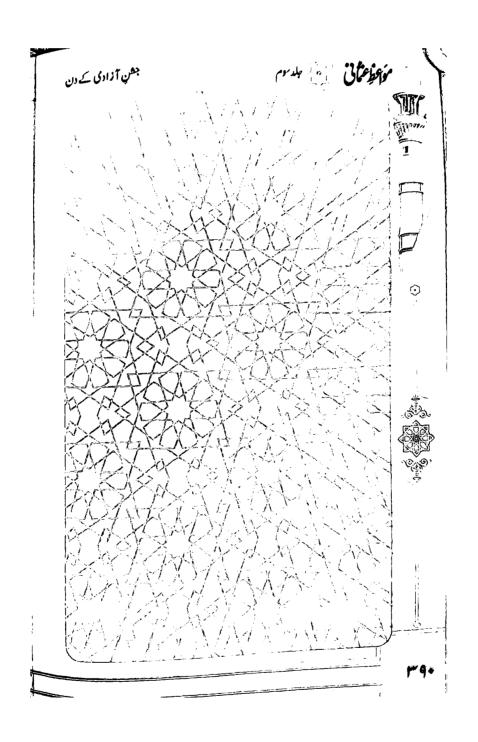
جشنِ آزادی کے دن

۱۴ اگست کا دن تھا، پورا شہر آزادی کی پچاسویں سالگرہ کا جشن منانے میں محو نظر آتا تھا اور صرف عمارتیں ہی نہیں، کاریں، بسیں اور موٹر سائیکلیں بھی سبز ہلالی پرچم سے سجی ہوئی تھیں۔ میں اس روز دوپہر نیشنل اسٹیڈیم کی عقبی گلی سے گزر رہا تھا جو عموماً سنسان پڑی رہتی ہے، پیدل چلتا ہوا کوئی آدمی اکّا دکّا ہی نظر آتا ہے، البتہ گاڑیاں کسی مختصر راستے کی تلاش میں ادھر سے گذرتی رہتی ہیں، جونہی میں مرکزی سڑک سے اس گلی میں مڑا، تو کچھ فاصلے پر نظر آیا کہ سڑک کے کنارے کوئی پیلی پیلی چیز بکھری ہوئی ہے، دور سے ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے زرد کا رنگ کا سفوف بکھیر دیا ہو، پھر اس کے قریب ہی ایک آدمی بیٹھا ہوا نظر آیا، جب گاڑی قریب پہنچی تو پتا چلا کہ وہ پیلی پیلی چیز چھولے تھے اور قریب بیٹھا ہوا شخص انہیں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور اندازہ ہوگیا کہ کسی غریب خوانچہ فروش کے چھولے زمین پر گر گئے ہیں اور وہ انہیں اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے، جب گاڑی قریب پہنچی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھی نظر آئے۔ میں گاڑی رکوا کر اس کے پاس پہنچا تو وہ ایک پچیس تیس سال کی عمر کا نوجوان تھا، جس کے سر

سے لے کر پاؤں تک ہر چیز مفلوک الحالی کی داستان سنا رہی تھی اور وہ گرے ہوئے چھولوں کو سمیٹتے ہوئے بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس کے گرد آلود رخساروں پر آنسوؤں کی لڑیاں صاف نظر آرہی تھیں، میں نے اس کے قریب پہنچ کر ماجرا معلوم کرنا چاہا، تو شروع میں اس کے منہ سے آواز نہ نکلی، پھر بمشکل اس نے یہ الفاظ ادا کیے کہ میں چھولے بیچنے جارہا تھا، ایک اسکوٹر والا پیچھے سے آیا اور اس نے ٹکر ماردی، میرے سارے چھولے زمین پر گر گئے، میں نے دیکھا کہ اس نے اوپر اوپر کے چھولے، تو جوں توں کر کے اٹھا کر اپنی ٹوکری میں رکھ لیے تھے، لیکن باقی چھولوں کو اٹھاتے وقت یہ تمیز کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان میں سے کون سے اٹھانے کے قابل ہیں اور کون سے مٹی میں مل جانے کی وجہ سے بیچنے کے لائق نہیں، اتنے میں پیچھے سے ایک اور کار فرّاٹے بھرتی ہوئی آئی اور انہی بچے کھچے چھولوں کو روند کر ان کو خاک آلود آٹا بناتی ہوئی نکل گئی، اس نوجوان کی ہچکیوں میں اور اضافہ ہوگیا، کبھی وہ گرے ہوئے چھولوں کو دیکھتا، کبھی اپنی ٹوکری کو اور کبھی مجھے، جیسے زبانِ حال سے کہہ رہا ہو کہ ”یہ دیکھنے میں تھوڑے سے چھولے ہیں مگر میری، تو پوری کائنات تھی جو جشنِ آزادی میں مست اسکوٹر نے ایک ہی جھٹکے میں مٹی میں ملادی، میں نے یہ چھولے تیار کرنے کے لیے نہ جانے کس طرح پیسے مہیا کیے، کس طرح انہیں تیار کیا اور کس کس طرح انہیں سر پر اٹھا کر پیدل فاصلہ طے کیا، تاکہ انہیں بیچ کر شام کو کچھ پیسے گھر لے جاسکوں، مگر آن کی آن میں میری پونجی لٹ گئی۔“

کہنے کو یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے، لیکن اس میں ہمارے معاشرے کی انتہائی متضاد تصویر چھپی ہوئی ہے۔ وہ مفلوک الحال نوجوان کتنا قابلِ قدر تھا جس نے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کے بجائے محنت کر کے چھولے بیچنے

کو ترجیح دی، لیکن اس کے مقابلے میں اس شکم سیر نوجوان کا تصور کیجیے جو اسکوٹر دوڑاتے ہوئے اس مسکین کی ساری کائنات تباہ کرگیا اور پیچھے مڑکر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور اس کار نشین کو دیکھیے جو اس مصیبت زدہ شخص کو دیکھتے ہوئے بھی اس کے گرے ہوئے چھولوں کو روندتا ہوا گزر گیا۔

اوّل تو اس بے پروائی اور غفلت کے ساتھ گاڑیاں دوڑانا، بذاتِ خود ایک ناجائز فعل ہے اور اگر اس کے نتیجے میں کسی کو نقصان پہنچ جائے، تو گری سے گری حالت میں بھی انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس نقصان کی حتی الامکان تلافی کی کوشش کی جائے اور ضرر رسیدہ شخص سے کم از کم معذرت اور ہمدردی کا اظہار ہی کرلیا جائے، مگر جو قوم اپنے غریبوں کو ان کا یہ کم سے کم حق دینے کو بھی تیار نہ، کیا اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی ''آزادی'' کا جشن مسرّت منائے؟ کیا آزادی کے پچاس سال میں ہم نے اپنی یہی تربیت کی ہے؟

واقعہ بظاہر چھوٹا سا تھا، مگر میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔ اس کے بعد جہاں کہیں جشن آزادی کے طرب کدے دیکھتا، ان کے عین درمیان مجھے وہ خاک آلود چھولے والا نظر آجاتا ...... ملک بھر میں اس طرح نہ جانے کتنے چھولے والے ہیں، جو عیش و طرب کے ہنگاموں کے عین درمیان روزانہ کھڑے کھڑے لٹ جاتے ہیں اور نہ جانے کتنے اسکوٹر والے اور کار والے چشم زدن میں ان کی ساری کائنات خاک میں ملا کر ان کی مفلوک الحالی کی ہنسی اڑاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ جب تک ہمارے دلوں میں اس صورتِ حال کی نفرت اور اسے دور کرنے کا ناقابلِ شکست جذبہ پیدا نہیں ہوتا، اس وقت تک ہماری نسبت سے جشنِ آزادی کا لفظ ایک مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

اسلام نے اوّل تو تہواروں اور رسمی جشنوں کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی،

دوسرے سال بھر میں جو خوشی منانے کے دن رکھے ہیں، یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ، ان میں خوشی منانے کا طریقہ بھی یہ سکھایا ہے کہ عید الفطر کی نماز کو جانے سے پہلے صدقۃ الفطر ادا کرو، یعنی اس دن بیدار ہونے کے بعد اور دن کے آغاز کرنے سے پہلے اس بات کی فکر کرو کہ کہیں کچھ لوگوں کے چولہے آج بھی ٹھنڈے تو نہیں؟ سبق یہ دیا گیا کہ جو شخص دوسرے کے آنسو پونچھ نہیں سکتا، اسے مسکراہٹوں اور قہقہوں کا حق نہیں پہنچتا، اس کے برعکس جو شخص دوسرے کو آنسوؤں میں نہلا کر خود قہقہے لگانا چاہتا ہے، وہ اپنی روح کے زخموں پر بے حسی کے کتنے پردے ڈال لے، بالآخر اس کے قہقہے ایک نہ ایک دن چیخوں میں ضرور تبدیل ہو کر رہیں گے۔

عید مبارک

(ذکر و فکر ص ۵۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عید مبارک
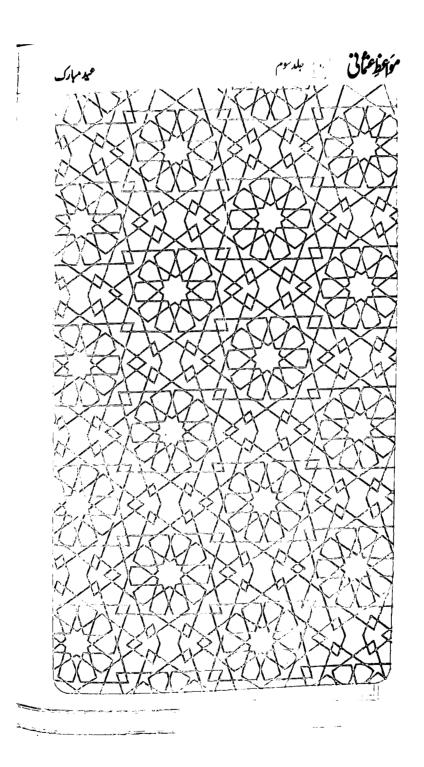
ہر قوم وملت میں سال کے کچھ دن جشنِ مسرت بنانے کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں، جنہیں عرفِ عام میں تہوار کہا جاتا ہے، تہوار منانے کے لیے ہر قوم کا مزاج ومذاق جدا ہوسکتا ہے، لیکن ان سب کی قدرِ مشترک ''خوشی منانا'' ہے۔

چونکہ انسان کی طبیعت ہے کہ وہ معمولات کی یکسانی سے کبھی کبھی گھبرا اٹھتا ہے اس لیے وہ ایسے شب وروز کا خواہش مند ہوتا ہے جن میں وہ اپنے روز مرہ کے معمولات سے ذرا ہٹ کر اپنے ذہن ودل فارغ کرے اور کچھ وقت بے فکری کے ساتھ ہنس بول کر گزارے۔ انسان کی یہی طبیعت تہواروں کو جنم دیتی ہے جو بالآخر کسی قوم کا اجتماعی شعار بن جاتے ہیں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ دو خوشی کے تہوار مناتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا ہم ان تہواروں میں شرکت کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان کے بدلے ان سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں، ایک عید الفطر کا دن، دوسرا عید الاضحیٰ کا[1]۔

چنانچہ امتِ مسلمہ کے لیے سال میں یہ دو دن خوشی منانے کے لیے مقرر کردیے گئے جن میں ایک طرف انسانی نفسیات کے مذکورہ بالا تقاضے کی رعایت بھی ہے اور ساتھ ساتھ ان دنوں کے تعین اور ان کو منانے کے انداز میں بہت سے عملی سبق بھی۔

کوئی تہوار مقرر کرنے کے لیے عام طور سے اکثر قومیں کسی ایسے دن کا انتخاب کرتی ہیں جس میں ان کی تاریخ کا کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہو مثلاً عیسائیوں کی کرسمس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یومِ پیدائش کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہے۔ (اگرچہ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی یقینی تاریخ کسی کو معلوم نہیں) یہودیوں کی عید فسح اس دن کی یادگار سمجھی جاتی ہے جس میں بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات ملی۔ اسی طرح ہندؤوں کے بہت سے تہوار بھی ان کے کسی خاص واقعے کی یادگار کے طور پر منائے جاتے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں ایسے دنوں کی کوئی کمی نہیں تھی، جن کی خوشی ہر سال اجتماعی طور پر منائی جاسکے، دنیا ہی کا نہیں، بلکہ اس پوری کائنات کا سعید ترین دن وہ تھا جس میں سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے یا وہ دن تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت کا عظیم منصب عطا فرمایا گیا۔

(۱) سنن ابی داود ۲۹۵/۱ (۱۱۳٤) وسنن النسائی ۱۷۹/۳ (۱۵۵٦). وقال النووي في "الخلاصة" ۸۱۹/۲ (۲۸۸۳): رواه أبو داود، والنسائي، وغيرهما بأسانيد صحيحة. طبع الرسالة.

اور دنیا کے لیے آخری پیغامِ ہدایت قرآنِ کریم کی شکل میں نازل ہونا شروع ہوا۔ اس دن کی عظمت بھی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، جس میں جناب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منوہ کو اپنا مستقر بنا کر پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح اس دن کی شان وشوکت کا کیا ٹھکانا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین سو تیرہ نہتے جاں نثاروں نے بدر کے میدان میں باطل کے مسلح لشکر کو شکستِ فاش دی اور جسے خود قرآن کریم نے ''یوم الفرقان''[1] (یعنی حق وباطل کے درمیان امتیاز کا دن) قرار دیا۔ اس دن بھی مسلمانوں کی فرحت ومسرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور کعبے کی چھت سے پہلی بار حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان گونجی۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں ایسے جگمگاتے ہوئے دن بے شمار ہیں جنہیں مسلمانوں کے لیے جشنِ مسرت کی بنیاد بنایا جاسکتا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ہر دن عظیم تھا جس میں مسلمانوں کو کوئی نہ کوئی دینی یا دنیوی دولت نصیب ہوئی۔

لیکن اسلام کی یہ شان نرالی ہے کہ پوری امت کے لیے سالانہ عید مقرر کرنے کے لیے ان میں سے کسی دن کا انتخاب نہیں کیا گیا اور دینی طور پر مسلمانوں کے لیے لازمی سالانہ عید مقرر کرنے کے لیے یکم شوال اور دس ذی الحجہ کی تاریخیں منتخب کی گئیں، جن سے بظاہر تاریخ کا کوئی امتیازی واقعہ وابستہ نہیں تھا، بلکہ یہ دو دن ایسے مواقع پر مقرر کیے گئے جن پر پوری امت ایک ایسی اجتماعی عبادت کی تکمیل سے فارغ ہوتی ہے جو سال میں ایک ہی بار انجام دی جاتی ہے۔ عید الفطر اس وقت منائی جاتی ہے جب مسلمان رمضان المبارک میں نہ صرف فرض روزوں کی تکمیل کرتے ہیں، بلکہ اس مقدس مہینے کے ایک

---

(۱) سورۃ الانفال آیت (٤١).

تربیتی دور سے گزر کر اپنی روحانیت کو جلا بخشتے ہیں۔ اور عید الاضحیٰ اس وقت منائی جاتی ہے جب ایک دوسری سالانہ عبادت یعنی حج کی تکمیل ہوتی ہے اور لاکھوں مسلمان عرفات کے میدان میں اپنے پروردگار سے مغفرت کی دعائیں کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کر چکے ہوتے ہیں اور جو لوگ براہِ راست حج میں شریک نہیں ہو سکے وہ قربانی کی عبادت انجام دیتے ہیں۔

اس طرح اسلام نے اپنے پیرؤوں کے لیے سالانہ عید منانے کے لیے کسی ایسے دن کا انتخاب نہیں کیا جو ماضی کے کسی یادگار واقعہ سے وابستہ ہو۔ اس کے بجائے مسلمانوں کی عید ایسے واقعات سے وابستہ کی گئی ہے جو مسلمانوں کے حال سے متعلق ہیں اور جن کی ہر سال تجدید ہوتی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ پچھلی تاریخ میں جو کوئی یاگار یا مقدس واقعہ پیش آیا وہ ماضی کا ایک حصہ بن گیا اس کو یاد رکھنا اس لحاظ سے بلاشبہ مفید اور ضروری ہے کہ اسے اپنے حال اور مستقبل کی تعمیر کے لیے نمونہ اور اپنی قوت جہد و عمل کے لیے مہمیز بنایا جائے لیکن ہر وقت ماضی میں گم رہ کر حال اور مستقبل سے بے فکر ہو جانا بعض اوقات قوموں کو اپنے کرنے کے کاموں سے غافل بھی بنا دیتا ہے اور انہیں طعنہ سننا پڑتا ہے کہ ؎

تھے تو آباء وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

لہٰذا عیدین کو کسی ماضی کے واقعے سے وابستہ نہ کر کے ہمیں سبق یہ دیا گیا ہے کہ تمہیں اصل خوشی منانے کا حق ان کاموں پر پہنچتا ہے جو خود تم نے حال میں انجام دیے ہوں، محض ان کارناموں پر نہیں جو تمہارے آباء و اجداد کر گزرے تھے۔

لہٰذا عید کا ہر دن ہم سب سے یہ سوچنے کا مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے حال اور اپنے اعمال کے پیش نظر کیا واقعی ہمیں خوشی منانے کا حق پہنچتا ہے؟ عید الفطر درحقیقت رمضان کے تربیتی کورس میں کامیابی کا ایک انعام ہے اس لیے حدیث [1] میں اس کو یوم الجائزہ یعنی انعام کا دن قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ دن ہم سے یہ جائزہ لینے کا تقاضا کرتا ہے کہ کیا ہم نے اعمال واخلاق کے اس تربیتی کورس میں واقعی کامیابی حاصل کی ہے؟ کیا واقعی اللہ تعالی کے ساتھ ہمارے تعلق میں کچھ اضافہ ہوا ہے؟ کیا ہم نے بندوں کے حقوق کو پہچاننا شروع کر دیا ہے؟ کیا ہمارے دل میں امانت، دیانت، ضبطِ نفس اور جہد وعمل کے جذبات پیدا ہوئے ہیں؟ کیا ہم نے چارسُو پھیلی ہوئی معاشرتی برائیوں کو مٹانے اور ان سے خود اجتناب کرنے کا کوئی عہد تازہ کیا ہے؟ کیا ہمارے سینے میں ملک وملت کی فلاح وبہبود کا کوئی ولولہ پیدا ہوا ہے؟ کیا ہم نے آپس کے جھگڑوں کو مٹا کر اس طرح متحد ہونے کا کوئی ارادہ کیا ہے جس طرح ہم عید گاہ میں یکجان نظر آتے ہیں؟ اگر اپنے گریبان میں منہ ڈالنے اور انصاف کے ساتھ اپنا جائزہ لینے کے بعد کسی کو ان سوالات کا یا کم از کم ان میں سے کچھ سوالات کا جواب اثبات میں ملتا ہے تو اسے واقعی عید مبارک ہو۔

۳۰/ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
۱۳ مارچ ۱۹۹۴ء

---

(۱) المعجم الكبير للطبرانی ۲۲۶/۱ (۶۱۸) من حديث أوس الأنصاری، ومعرفة الصحابة لأبی نعيم ۱۸۷٤/٤ (٤۷۱۷) من حديث عبيد الله بن محصن الأنصاری (طبع دار الوطن. الرياض).

مبارک ہو

(ذکر وفکر ص ۱۰۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مبارک ہو

''مبارک ہو'' ایک ایسا جملہ ہے جو ہم دن رات بے شمار مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔ شادی بیاہ ہو یا خوشی کی دوسری تقریبات، بچے کی ولادت ہو یا عقیقہ، امتحان میں کامیابی ہو یا ملازمت کا حصول، کوئی تجارتی فائدہ حاصل ہوا ہو یا کوئی عہدہ ومنصب، غرض ہر خوشی کے موقع پر یہ جملہ بے ساختہ زبانوں پر آتا ہے اور اسی کے ذریعے دوسرے کی خوشی میں اپنی شرکت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

لیکن یہ جملہ اتنی کثرت سے ایک رسمی جملے کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے کہ اب وہ اپنے معنوی اہمیت کھو بیٹھا ہے اور اب ہمیں اس کا صرف محلِ استعمال یاد رہ گیا ہے، اس کے ٹھیک ٹھاک معنی یاد نہیں رہے، کم از کم ان کا دھیان نہیں رہا۔

''مبارک ہو'' درحقیقت ایک دعا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ خوشی کا جو سبب تمہیں حاصل ہوا ہے اللہ اس میں برکت عطا کرے۔

''برکت'' کیا چیز ہے؟ آج مادّی اسباب ووسائل کی اڈھیر بن میں اس سوال کا جواب اتنا دھندلا گیا ہے کہ بہت کم لوگ اس سے واقف رہ گئے ہیں،

اس لیے اس کی تشریح کے لیے تھوڑی سی تفصیل اور وضاحت درکار ہے۔

اس دنیا میں راحت وآرام کے جتنے مادی وسائل کی تلاش میں ہم دن رات سرگرداں ہیں وہ راحت وآرام کے وسائل واسباب ضرور ہیں، لیکن بذاتِ خود راحت وآرام نہیں ہیں، خواہ روپیہ پیسہ ہو، زمین وجائیداد ہو، کوٹھی بنگلے ہوں، نوکر چاکر ہوں، کاریں اور ہوائی جہاز ہوں، بیوی بچے اور عزیز رشتے دار ہوں، یہ سب چیزیں راحت وآرام یا سکون واطمینان حاصل کرنے کا ذریعہ تو ہیں، لیکن ان میں لازمی طور پر ہمیشہ آرام پہنچانے اور سکون عطا کرنے کی بذاتِ خود طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ جس شخص کو یہ تمام چیزیں میسر ہوں، اسے ہر حال میں ان کا آرام ضرور نصیب ہو، کتنے لوگ ہیں جن کے پاس روپے پیسے کی ریل پیل ہے، جو عالی شان کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور پرشکوہ کاروں میں سفر کرتے ہیں، لیکن ان تمام اسبابِ راحت کے باوجود ان کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھیے تو انہیں آرام وسکون میسر نہیں، وہ کسی ایسے کرب میں مبتلا ہیں جس نے مال ودولت کے ان مظاہر کو ان کے حق میں بے کار بنا کر رکھ دیا ہے۔

ایک شخص کے دسترخوان پر انواع واقسام کے قیمتی کھانے چُنے ہوئے ہیں، تازہ اور لذیذ پھلوں کا انتخاب مہیا ہے، صاف ستھرے برتن سجے ہوئے ہیں، ماحول پُر کیف خوشبو سے معطر ہے، تو لذت کے سارے اسباب بظاہر موجود ہیں لیکن اگر اس کا معدہ خراب ہو تو لذت کے یہ سارے اسباب مل کر بھی اسے لذت عطا نہیں کر سکتے یا اگر معدہ بھی ٹھیک ہے، لیکن کوئی شدید ذہنی پریشانی لاحق ہے جس نے بھوک اڑا رکھی ہے تو یہ تمام لذیذ کھانے دھرے کے دھرے

رہ جاتے ہیں، اور اسے لذت کی نعمت عطا نہیں کر سکتے۔

ایک شخص کے پاس رہنے کا عالی شان مکان ہے، اس کی خواب گاہ آرام وراحت کے جدید ترین ساز وسامان سے آراستہ ہے، انتہائی دلکش مسہری پر نرم وگداز بستر بچھا ہوا ہے، گرمی کو دور کرنے کے لیے کمرے میں ایئر کنڈیشنر چل رہا ہے، لیکن جب وہ اس خواب آور ماحول میں پہنچ کر بستر پر لیٹتا ہے تو نیند غائب ہے، ہزاروں جتن کرنے کے بعد بھی وہ سو نہیں سکتا اور ساری رات بستر پر کروٹیں بدل کر گزار دیتا ہے، اس شخص کے پاس آرام وآسائش کے ظاہری اسباب پوری طرح موجود تھے، لیکن اسے آرام نہ مل سکا اور پوری رات آنکھوں میں کاٹنی پڑی۔

دوسری طرف ایک محنت کش مزدور یا کسان ہے، دو چار پانچ گھنٹے کی مشقت اٹھانے کے بعد جب کھانے کے لیے اپنی گٹھڑی کھولتا ہے، تو بظاہر اس میں صبح کی پکی ہوئی معمولی ساگ روٹی ہے، لیکن اس کا معدہ صحت مند اور اس کی بھوک بھرپور ہے اسے یقینا اس بھوک کے عالم میں ساگ روٹی سے وہ لذت حاصل ہوجاتی ہے جو بیمار معدے کے دولت مند شخص کو انواع و اقسام کے کھانوں میں نصیب نہ ہوسکی، پھر جب رات کے وقت وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنی کھردری چارپائی پر پہنچتا ہے تو نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہیں اور وہ اس ننگی چارپائی پر لیٹتے ہی دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوجاتا ہے اور آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لے کر صبح کو چاق وچوبند اٹھتا ہے، اس کے پاس نہ مسہری تھی نہ گداز بستر تھا، نہ ایئر کنڈیشنر کمرہ تھا، نہ روم اسپرے کی مہک تھی، لیکن اس کھردری

چار پائی پر بھی اسے وہ راحت میسر آ گئی جو اس دولت مند کو ایئر کنڈیشنر خواب گاہ میں بھی میسر نہیں آتی تھی۔

اس قسم کے دسیوں مثالیں روز مرہ زندگی میں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں، جن میں ایک شخص لذت اور راحت کے سارے اسباب سے لیس ہونے کے باوجود لذت اور راحت سے محروم ہوتا ہے اور دوسرا شخص بہت معمولی ساز وسامان رکھنے کے باوجود اس سے کہیں زیادہ ذہنی سکون اور اطمینان سے سرشار۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیا میں راحت و آسائش کے جتنے وسائل ہیں ان سے واقعتاً لذت اور راحت حاصل ہونا کچھ ایسے عوامل پر موقوف ہے جو انسان کی قدرت اور اختیار سے باہر ہیں، انسان روپیہ خرچ کر کے راحت کے اسباب تو خرید سکتا ہے لیکن وہ عوامل پیسے سے نہیں خریدے جا سکتے جن کی وجہ سے ان اسباب میں حقیقی راحت و آرام عطا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

انسان دن رات ایک کر کے دولت کما سکتا ہے، بنگلے بنا سکتا ہے، کاریں خرید سکتا ہے، ملیں کھڑی کر سکتا ہے، لیکن ان چیزوں سے حقیقی لطف اور واقعی آرام حاصل کرنے کے لیے جو صحت درکار ہے، جن پرسکون گھریلو تعلقات کی ضرورت ہے اور جو ذہنی سکون ناگزیر ہے، وہ نہ تو روپے پیسے کے بل پر حاصل کیا جا سکتا ہے، نہ اسے کوئی مشین تیار کر سکتی ہے، وہ کلی طور پر انسان کی حدودِ اختیار سے ماوراء ہے، وہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس عطا میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ اگر چاہے تو پھونس کے جھونپڑے کو جنت بنا دے اور اگر چاہے تو یہ چیزیں سلب کر کے عالیشان محل کو انگاروں کے فرش میں تبدیل کر دے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ عطا بلاشرکت غیرے اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، اسی کا نام برکت ہے۔ ''برکت'' حاصل ہو تو تھوڑی سی چیز بھی کافی ہو جاتی ہے اور اس سے مطلوبہ فائدہ حاصل ہو جاتا ہے اور ''برکت'' مفقود ہو تو دولت کے ڈھیر بھی انسان کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے، اسی ''برکت'' کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اگر دنیا کے کسی ساز و سامان سے وقتی طور پر کچھ راحت مل بھی رہی ہے، تو اس کا انجام بھی بخیر ہو، اگر ایک ڈاکو لاکھوں روپیہ لوٹ کر تین دن تک خوب مزے اڑائے اور چوتھے دن جیل میں پہنچ جائے، تو وہ تین دن کے مزے کس کام کے؟ لہٰذا دنیا کا ہر لطف، لذت اور آرام اس وقت قابلِ قدر ہے جب اس کا انجام کسی بڑی تکلیف کی صورت میں ظاہر نہ ہو اور ''برکت'' کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے۔

اب ''برکت'' دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہوئی، ایک یہ کہ راحت کا جو ظاہری سبب ہمیں نظر آرہا ہے وہ واقعتاً لذت یا آرام پہنچائے اور کوئی ایسی حالت پیدا نہ ہو جو اس کا مزہ کرکرا کر ڈالے، دوسرے یہ کہ اس کا انجام بھی بخیر ہو اور اس سے حاصل ہونے والی لذت یا آرام کا نتیجہ خراب نہ ہو۔

لہٰذا جب کسی خوشی کا سبب حاصل ہوتا ہے اور ہم اسے مبارک باد دیتے ہیں، تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خوشی کے اس سبب میں برکت پیدا کرے، یعنی وہ تمہارے لیے حقیقی خوشی اور راحت کا باعث بنے اور بالآخر دنیا اور آخرت میں اس کا انجام بھی درست ہو۔

جب کسی کی شادی کے موقع پر ہم اس سے کہتے ہیں کہ ''مبارک ہو''، تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ تم نے اپنی سی کوشش کرکے اپنے لیے بہتر رشتہ

ڈھونڈا ہے، لیکن اس رشتے میں کامیابی کچھ اَن دیکھے حالات پر موقوف ہے، جو تمہارے اختیار سے باہر ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، ہم اسی سے دعا کرتے ہیں کہ یہ رشتہ دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ثابت ہو۔

جب کوئی شخص گاڑی خریدتا ہے اور ہم اسے مبارک باد دیتے ہیں، تو اس میں یہ اعتراف پنہاں ہے کہ یہ گاڑی اگرچہ بظاہر آرام دہ ہے، لیکن یہ بات غیر اختیاری حالات ہی بتاسکتے ہیں کہ یہ واقعی آرام پہنچائے گی یا روز بروز گیرج میں کھڑی رہ کر ایک نیا دردِ سر پیدا کرے گی، یہ غیر اختیاری حالات چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اس لیے اسی سے دعا ہے کہ وہ اس گاڑی میں برکت پیدا کرکے حالات کو ایسا سازگار بنادے کہ یہ گاڑی واقعی تمہیں آرام پہنچائے اور اس کا انجام بھی بخیر ہو۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہوئی ہوگی کہ مبارک باد کے ہر فقرے میں ہم ہر بار یہ اعتراف کرتے ہیں کہ دنیا کے ہر آرام دہ ساز وسامان اور خوشی کے ہر واقعے میں اصل اہمیت ''برکت'' کو حاصل ہے، وہ ہے تو سب کچھ ہے اور وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں اور ساتھ ہی یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ''برکت'' کا حصول ہمارے اختیار میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، لیکن چونکہ مبارک باد کے فقرے میں ہم صرف ایک رسم پوری کرنے کے لیے بے سوچے سمجھے بولتے رہتے ہیں اس لیے ان جیتے جاگتے حقائق کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا اور ''مبارک باد'' کا فقرہ درحقیقت ''برکت'' کی جس اہمیت کا اعتراف ہے اپنی عملی زندگی میں ہم نے ''برکت'' کو اتنا ہی غیر اہم قرار دے رکھا ہے، چونکہ ''برکت'' ایسی چیز نہیں جو گنتی میں آسکے یا جسے مادی پیمانوں سے ناپا جاسکے اس لیے ہماری ساری دوڑ دھوپ راحت ولذت کے اسباب حاصل کرنے پر تو صرف ہورہی

ہے، لیکن ان اسباب میں ''برکت'' پیدا ہونے کی طرف ہمیں مطلق توجہ نہیں، اگر ہوتی، تو ہم یہ سوچے بغیر نہ رہتے کہ ''برکت'' خالصتاً اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہے، تو وہ ایسے سازوسامان میں کیسے پیدا ہوسکتی ہے جو اس کی نافرمانی کرکے حاصل کیا گیا ہو، جس سے اس کے بندوں کے حقوق پامال ہوئے ہوں اور جس کی بنیاد ہی ظلم اور ناانصافی پر اٹھی ہو؟

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مال ودولت اور ساز وسامان کی گنتی بڑھانے میں دن رات منہمک ہیں لیکن یہ حساب لگانے کی ہمیں فرصت نہیں کہ گنتی کے اس اضافے نے حقیقی راحت میں کتنا اضافہ کیا؟ اگر ایک شخص دوسروں کے حقوق پامال کرکے رشوت کا گناہِ عظیم اپنے سر لے کر دس بیس ہزار روپے گھر لے آیا تو وہ اس بات پر مگن ہے کہ میں نے اپنی دولت میں اضافہ کرلیا، لیکن اگر چند ہی دنوں کے عرصے میں حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ اس سے زیادہ روپے کسی ہسپتال کا بل ادا کرنے یا کسی مقدمہ بازی میں خرچ کرنے پڑے، تو یہ حساب کوئی نہیں لگاتا کہ انجام کار مجھے دردسری کے سوا کیا ملا؟ اور اگر دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر یہ رقم نہ لاتا، تو کچھ بعید نہ تھا کہ میری حلال کمائی کے تھوڑے پیسوں سے ہی مجھے وہ راحت مل جاتی جو اس بڑی رقم سے نہیں مل سکی۔

بعض مرتبہ دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بہت ظالم اور بد دیانت لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ بڑے مزے کی زندگی گزار رہے ہیں اور ظلم اور بد دیانتی نے ان کی لذت وراحت میں کوئی کمی نہیں کی۔ لیکن اول تو بسا اوقات یہ بات سوچتے وقت ہم ایک بار پھر وہی غلطی کرتے ہیں کہ اسبابِ راحت ہی کو راحت سمجھ بیٹھتے ہیں، یعنی کسی بد دیانت شخص کا شاندار بنگلہ، خوبصورت کار اور رہنے بسنے کا قیمتی سامان دیکھ کر یہ فرض کرلیتے ہیں کہ وہ بڑے مزے میں ہوگا،

حالانکہ لذت و راحت تو درحقیقت ایک اندرونی کیفیت کا نام ہے جس کا سراغ کوٹھی بنگلے سے نہیں لگایا جاسکتا، جب تک کوئی شخص اس کے سینے میں اتر کر نہ دیکھے اسے ٹھیک ٹھیک پتا نہیں چل سکتا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ دنیا بھر میں خودکشی کرنے والوں کا اوسط ان گھرانوں میں زیادہ ہے جو کھاتے پیتے کہلاتے ہیں اور جن کے پاس اسبابِ راحت میں کوئی خاص کمی نہیں ہے، خود میرے ذاتی تجربہ میں ایسی ان گنت مثالیں ہیں کہ محفلوں میں قہقہے لگانے والے دولت مند افراد نے جب تنہائی کے وقت اپنا دل میرے سامنے کھول کر رکھا تو وہ دکھوں سے چُور اور زخموں سے چھلنی تھا۔

دوسرے یہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ برکت کے مفہوم میں صرف وقتی راحت ہی داخل نہیں، بلکہ اس راحت کا انجام بخیر ہونا بھی ضروری ہے، لہٰذا اگر کسی بددیانت شخص کو بالفرض وقتی راحت میسر آ بھی جائے، تو بالآخر اس کا انجام کبھی درست نہیں ہوسکتا، اکثر بددیانتی کی سزا اس دنیا میں مل جاتی ہے اور اس بری طرح سے ملتی ہے کہ وہ راحت اس کے آگے کالعدم ہوجاتی ہے، بعض اوقات انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ میں اپنے کس فعل کی سزا بھگت رہا ہوں، لیکن درحقیقت اس کی زندگی میں آنے والے مصائب خود اسی کے اعمال کی سزا ہوتے ہیں اور بالآخر آخرت میں ظلم وزیادتی کی سزا ملنی ہی ملنی ہے، جس سے کوئی مفر نہیں، جب تک ظلم وتکبر کا نشہ چڑھا ہوا ہے انسان اپنے انجام سے غافل ہے، لیکن جس روز موت دروازے پر دستک دے کر یہ نشہ اتار دے گی تو آنکھیں بند ہوتے ہی وہ دہکتے ہوئے انگارے نظر آجائیں گے جنہیں دولت کے ڈھیر سمجھ کر وہ ان کی خاطر حق وانصاف کا خون کرتا رہا، قرآنِ کریم نے یہی

حقیقت ان الفاظ میں یاد دلائی ہے:

''اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ؕ وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا'' (۱)

جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ نگل رہے ہیں اور یقینا وہ دہکتی آگ میں داخل ہو کر رہیں گے۔

۲۳ / ذوالحجہ ۱۴۱۴ھ
۱۵ / مئی ۱۹۹۴ء

(۱) سورۃ النساء آیت ۱۰۔

مواعظِ عثمانی

اصلاحی تقاریر و مضامین کا موضوع وار مجموعہ
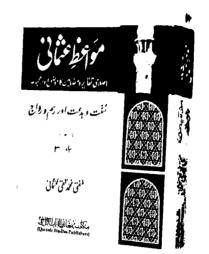
شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے جملہ مواعظ، خطبات اور تحریرات کا تخریج شدہ جامع اور مستند ترین موضوع وار مجموعہ ہے، اس مجموعہ میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی درج ذیل کتب کا استیعاب کیا گیا ہے:

- حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا
- اصلاحی خطبات
- اصلاحی مواعظ
- اصلاحی مجالس
- خطباتِ عثمانی
- خطبات دورۂ ہند
- درسِ شعب الایمان
- نشری تقریریں
- فردکی اصلاح
- اصلاحِ معاشرہ
- تربیتی بیانات
- ذکر و فکر
- the Islamic Months

اس کے علاوہ

- آسان ترجمہ قرآن
- اسلام اور ہماری زندگی
- انعام الباری
- تقریرِ ترمذی
- جہانِ دیدہ
- سفر در سفر
- دنیا مرے آگے
- اسلام اور جدید معاشی مسائل
- ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شامل شدہ، اور بعض صوتی صورتوں میں محفوظ شدہ حضرت والا دامت برکاتہم کے بیانات وخطبات کو شامل کیا گیا ہے، جس سے علماء، طلباء، خطباء اور عام پڑھے لکھے حضرات بآسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔

مکتبۂ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)